

موازنہ خوشحال و غالب



نادر صدی



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

موازنہ خوشحال و غالب

ناز سرحدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	موازیہ خوشحال و غالب
مصنف	ناز سرحدی
کمپوزنگ	ارشاد خان (پشتوا کیڈمی پشاور)
پریس	جدید پرنٹرز، خیبر بازار پشاور
تعداد	500
سال اشاعت	2011ء
زر تعاون	300/- روپیہ

ملنے کا پتہ

- ☆ یونیورسٹی بک اینجنسی خیبر بازار پشاور شہر
- ☆ پشتوا کیڈمی بک شاپ پشاور یونیورسٹی
- ☆ سعید بک بینک کیفو نمٹ پلازہ ارباب دوڑ پشاور کینٹ پاکستان
- ☆ سعید بک بینک جناح سپر اسلام آباد پاکستان

فون نمبر 091-5273761

فون نمبر 501-2651656-57-58

انتساب

خوشحال و غالب کے نام

فہرست

6	دیباچہ	ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک
11	حرف اول	ناز سرحدی
17	باب اول	شخصیت
18	حیات خوشحال وغالب۔ سنین کے آئینے میں	
26	ولادت و بچپن	
30	خوشحال وغالب۔ شخصیت	
65	تعلیم و تربیت اور علمیت	
87	مذہب و مسالک	
96	مے پرستی	
109	بڑھاپا	
125	باب دوم	فن
126	خوشحال وغالب کا نظریہ شعر	

- 138 خوشحال و غالب کی غزل
- 161 خوشحال و غالب کی قصیدہ گوئی
- 176 خوشحال و غالب اور سائنس
- 190 خوشحال و غالب کا فلسفہِ غم
- 202 خوشحال و غالب کی نثر
- 218 خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف
- 243 خوشحال و غالب کی فارسی شاعری
- 261 خوشحال و غالب - جرات اظہار اور بے باکی
- 294 خوشحال و غالب کی شاعری میں حسن و عشق
- 328 خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح
- 363 خوشحال و غالب - اقبال کی نظر میں
- 391 خوشحال و غالب اپنے اشعار کے آئینے میں
- 427 **تنقید** باب سوئم
- 428 خوشحال و غالب کے اہم محققین اور نقاد

ستون ہیں۔ جن کے سہارے ہماری ادبی تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ یہ دونوں ہستیاں صرف پشتو اور اردو زبانوں تک محدود نہیں۔ بلکہ فارسی میں بھی جس کی ادبی روایت نے پشتو اور اردو کے ساتھ دیگر زبانوں، چغتائی، ترک، کردی، عثمانی ترک، بلوچی اور پنجابی پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے خوشحال و غالب نے طبع آزمائی کر کے اپنے اپنے علم و ہنر کا ثبوت دیا ہے۔

یہ بات لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ باوی النظر میں خوشحال و غالب کے تقابلی مطالعے یا شخصیت و فن کے موازنے کا وہ جواز نظر نہیں آتا جو ہمیشہ اس طرح کے علمی و ادبی مباحث کی بنیاد بنھتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی اور اڑدہ کبھی کبھی ایک ہی پھول سے رس لیتے ہیں۔ خوشحال و غالب کا بخیر غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں فقید المثال ہستیوں کے حیات و افکار اور طرز اظہار میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ جنہیں سامنے لانا اور ان پر بات کرنا از حد ضروری ہے کیونکہ ایسے ہی تقابلی مطالعے نہایت ہی جامع مواد کے ساتھ قلیل وقت میں ہمیں بہت کچھ پڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے اگر ایک طرف ہمیں ایک ہی مطالعے میں کئی جہتیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو دوسری طرف موازنے کے عمل کے دوران بعض اوقات ہماری رسائی ان نکات تک بھی ہو جاتی ہے۔ جنہیں عام حالات میں دریافت کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔

خوشحال خان خٹک جنہیں دنیا زیادہ تر پشتو کے بلند پایہ شاعر کے طور پر جانتی ہے

صرف ایک شاعر نہ تھے وہ ایک غرر اور جنگجو سردار نہ برساتستان، حاذق حکیم، تجربہ کار شکاری، بے بدل عالم اور صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ان کے ہر پہلو کے بارے میں یہی گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری توانائی اسی ایک پہلو پر صرف کی ہوگی، مگر آخر کار اس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی کثیر الجہت شخصیت کی توانائیاں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کی کسی بھی زبان میں خوشحال خان خٹک جیسی شخصیت کی مثال ابھی تک نظر نہیں آتی۔ مستشرقین کے علاوہ علامہ اقبال جیسی شخصیت بھی خوشحال کی شخصیت اور کارناموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور انہی کی ہدایت و مشاورت سے برصغیر کی ایک بڑی خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی حیات و افکار پر "The Life and works of Illustrious Khushhal Khan Khattak" کے عنوان کے تحت پنجاب یونیورسٹی کے لیے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ دوسری طرف غالب بھی اپنی گوں ناگوں خوجیوں کے حوالے سے اذراہ کیا۔ تاریخ میں ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو ستاروں نے ان کے ہاں جوانی کا جوہن دیکھا اور جدید نثر نے ان کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ شاعر ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہو جس نے اردو کا نام سنا ہو اور غالب کو نہ جانتا ہو۔

محترم ناز سرحدی دادا اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے خوشحال وغالب جیسی بلند پایہ اور عظیم المرتبت ادبی ہستیوں کے حیات و فن کے موازنے کے حوالے سے اس گرانقدر تحقیقی اور تنقیدی کام کا ہیرا نمایاں کیا۔ اگرچہ انہوں نے تحقیق کے لئے انہی حوالوں

پر اکتفاء کیا ہے۔ جو ایک عرصے سے دوست محمد خان کامل، سید رسول رسا، پروفیسر حمید اللہ ہاشمی، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل صدیقی، ایوب صابر، الطاف حسین حالی، ڈاکٹر ابولیت صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حمید احمد خان اور دیگر مرتب کرتے چلے آئے ہیں۔ جن کو استناد کا درجہ حاصل ہے اور اہل علم و دانش کے ایک وسیع حلقے کی شرف قبولیت بھی۔

گلوبل ویلج کے جدید تناظر میں خوشحال وغالب کا یہ تقابلی مطالعہ ہر لحاظ سے ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ کیونکہ جس دور میں خوشحال وغالب زندہ تھے اس دور میں فاصلے اہل حقیقت کی طرح مواصلاتی رابطوں کی راہ میں حائل رہے ہوں گے۔ لیکن آج اس طرح کی علمی و ادبی معلومات کے لئے فاصلے اپنی حقیقت کھو چکے ہیں اور یوں یہ موازنہ اردو ان طبقات میں خوشحال شناسی اور پشتو بولنے والوں کے لئے غالب شناسی کے حوالے سے بھرپور کردار ادا کرنے کا متمثل ہے۔

مصنف بنے جی عرق ریزی اور جانفشانی سے خوشحال وغالب کے موازنے کے ضمن میں جن نکات کو موضوعات کے طور پر اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کا یقین ثبوت ہے کہ وہ ایک وسیع مطالعے کے بعد ہی لکھنے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خوشحال وغالب کے حالات زندگی سے لے کر ہر دو شخصیتوں کے مذہبی، نظریاتی اور فنی پہلوؤں کا پورا پورا ادراک کرانے کے لئے مصنف حوالہ جاتی طریقہ کار اپناتے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عمل ان کے شعور اور تنقیدی نظر کی معیت میں استناد کی حدود تک جا پہنچتا ہے۔ جو کہ نہ صرف خود مصنف بلکہ قاری کی ذات کے لئے بھی اعتبار اور معیار کا باعث بنتا ہے۔

اس حوالے سے مذہب و مسلک، حب علیؑ، مخوری، یکساں نظریہ شعر، غزل گوئی و قصیدہ گوئی، فلسفہ، غم، تصوف، جرات اور بے باکی، حسن و عشق، طنز و مزاح وغیرہ وہ مماثلتیں قدریں ہیں۔ جنہیں محترم ناز سرحدی نے خوشحال و غالب کے موازنے کے دوران موضوع بحث بنایا ہے۔ ہر عنوان کے تحت جو تفصیلات اور تاویلات دی گئی ہیں انہیں معتبر حوالوں کے ذریعے مضبوط کرنے کی کافی بلکہ کامیاب سعی کی گئی ہے اور یوں نہ صرف خوشحال و غالب کا موازنہ پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ ان تمام کتابوں تک قاری کی رسائی بیک وقت ہو جاتی ہے۔ جن کو اس موازنے کو مرتب کرتے وقت ٹٹولا اور پڑھا گیا ہے۔

میں محترم ناز سرحدی کو اس کامیاب تحقیقی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اہم کتاب پر مجھے چند سطریں تحریر کرنے کی دعوت دی۔

ناز سرحدی اسکے بعد فارغ بیٹھنے والے نہیں۔ اس کے ۵۰ ایک اور اچھوتے

عنوان یعنی "The Political Thoughts of Khushal Khan Khattak" پر انگریزی میں کتاب لکھنے جارہے ہیں۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے سلسلے میں میری دعا کہیں ان کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

پشاور یونیورسٹی

حرف اول

میں ”موازنہ خوشحال و غالب“ کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کرتا اگر مجھے ان دونوں نابہ ہستیوں کے شخصی حالات اور کلام پڑھنے کے بعد ان کی شخصیتوں، افکار اور فن میں ناقابل یقین حد تک ہم آہنگی نظر نہ آتی۔ گو کہ ان دونوں کی شخصیتوں اور فن کے کچھ گوشوں میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی من حیث المجموع خوشحال و غالب ہماری دنیائے ادب کی تاریخ میں دوسرے شعراء و ادباء سے متمیز نظر آتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے اور یہی ان کا مقام۔

خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی شک و شبہ کے بغیر یہ احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے کہ ان دونوں نادور ہستیوں کا موازنہ اردو اور پشتو ادب کے شہداء کے لیے نہایت ہی مفید اور احسن قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

میری خوش قسمتی رہی ہے کہ اردو میری قومی تو پشتو میری مادری زبان ہے۔ پھر یہ کہ شاعری کے ساتھ شغف رکھنے والے ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اردو اور پشتو ادب کے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان ہائی کمیشن لندن (برطانیہ) میں

تعییناتی کے دوران میں نے برٹش میوزیم اور برٹش سیکشن لائبریری کی رکنیت لے رکھی تھی۔ وہاں جو پہلی کتاب میں نے لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کے لئے نکلائی تھی وہ خوشحال بابا کے پوتے افضل خان خٹک کی کتاب ”ہارنغ مرصع“ کا قلمی نسخہ تھا۔

ہمارے ان دونوں نادرا الوقت شعراء کا مطالعہ کرنے پر کھلتا ہے کہ ان کے ادوار میں لگ بھگ دو صدیوں کے فاصلہ کے باوجود ان کی شخصیتوں اور فن میں باہمی موافقت کے ساتھ ساتھ جو تفاوت پایا جاتا ہے اسے قلمبند کر دینے سے اہل ادب حضرات کے لئے ایک مفید مطالعہ کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں نے ۱۹۹۴ء میں اس موضوع پر کام شروع کیا ہے۔ تو تقریباً سترہ (۱۷) برس اس ضمن میں تحقیق کرنے پر اس خیال کو مزید تقویت ملتی گئی کہ موازنہ خوشحال وغالب پر قلم اٹھانا ایک مفید کام ہے۔ جسے مکمل کیا جانا چاہیے۔ یہ ایک ادبی ضرورت ہے تاکہ ہزاروں سال پرانی زبان پشتو اور نسبتاً نئی زبان اردو میں ادا کئے گئے ان دونوں نامور شعراء کے خیالات و افکار ان کے انداز ہائے فن اور بڑی حد تک انکی شخصیتوں کے مطالعہ کے ذریعے نہ صرف اردو اور پشتو ادب کو ایک دوسرے کے نزدیک تر لانے کا اہتمام کیا جائے بلکہ ہماری قومی یک جہتی کو بھی مزید سنوارا جائے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو خوشحال خان خٹک کی عمر کا خاصا حصہ اپنے وطن کو منہل تسلط سے آزاد کرانے میں گزرا۔ جس سے خوشحال بابا کے جذبہ حریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف غالب نے مغلیہ دور کے آخری لمحات میں ہندوستان پر

انگریزی تسلط کی ابتداء کو بظہر حیرت دیکھا۔ اس طرح ہمارے یہ ہر دو نابھہ روزگار شعراء لگ بھگ دو ڈھائی سو سال پر محیط مغلیہ سلطنت کے ایک خاص دور کے دونوں سروں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

غالب نے زیادہ تر عشقیہ شاعری میں کمال حاصل کیا مگر اردو نثر پر ان کے مکاتیب نے ایک نہایت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ انہوں نے فارسی میں شاعری کے علاوہ مغلیہ خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دشتیو) لکھنے کا کارنامہ بھی سرانجام دیا۔ ادھر خوشحال خان خٹک نے نہ صرف عشقیہ، فکری اور حماسی شاعری میں کمال دکھایا بلکہ مرد غیرت مند یعنی تنکیال اور باز کا تصور بھی دیا جسے بعد میں علامہ اقبال نے خودی مرد مومن اور شاہین کی صورت میں پیش کیا۔ امید ہے قارئین ”موازنہ خوشحال وغالب“ میں اس نکتے پر دی گئی تفصیلات سے بطور خاص محفوظ ہو گئے۔ پشتو نثر پر بھی خوشحال خان کا بڑا احسان رہا ہے کہ انہوں نے پشتو نثر میں ”دستار نامہ“ جیسی نادر کتاب تصنیف کی جسے اپنے مضمون (ایک سردار کو کن خصائل اور ہنروں کا حامل ہونا چاہیے) کے لحاظ سے افلاطون کی ”جمہوریہ“ امیر کیا داس کی ”قابوس نامہ“ اور نکولومیکیا دلی کی شہرہ آفاق کتاب ”The prince“ (شہزادہ) کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ دستار نامہ کی نثر خوشحال سے پہلے کی مسیحی اور منطقی نثر کے مقابلے میں سادہ اور پشتو روزمرہ کے مطابق ہے۔

جناب خاطر غزنوی کے بقول ”یوں اس کتاب کو پشتو نثر کے نئے دور کا حرف

آغا زکما جاسکتا ہے۔“ خوشحال بابا کا فارسی کلام بھی موجود ہے۔

جہاں تک خوشحال و غالب کے موازنہ کا تعلق ہے تو جن چیدہ چیدہ خصائص کی وجہ سے یہ موازنہ ضروری سمجھا گیا ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں تابعدار روزگار ہستیاں مظلیہ دور میں ہو گزری ہیں۔ دونوں کا بچپن امیرانہ اور نوابانہ ماحول میں گزرا۔ دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی۔ دونوں کو مغل دربار میں رسائی حاصل رہی۔ خوشحال بابا نے پشتو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ تو غالب نے اردو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کیا۔ ان دونوں ہستیوں پر بڑھاپے میں اعتلاء کا دور آیا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اور یہ کہ دونوں اپنے فکر و فن کی جدت کی بدولت اپنی اپنی زبان پر ثبت ہو گئے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں بین الاقوامی شہرت کے حامل شعراء کے کلام میں ہم آہنگی فکر بھی پائی جاتی ہے اور فکر مخالف بھی۔ اسکے ساتھ ساتھ آپ کے احساس میں کبھی ایک برتر نظر آئے گا اور کبھی دوسرا۔ گو کہ بیشتر مضامین کے آخر میں ان دونوں تابعدار ہستیوں کی شخصیت، فن اور فکر پر ایک مختصر سا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک خوشحال و غالب کا اصل موازنہ وہ تاثر ہے۔ جو قارئین کے اذہان میں اس کتاب کے ہر مضمون کے پڑھنے کے بعد خود بخود پیدا ہونا چلا جائے گا۔ آپ جوں جوں اس کتاب کے مطالعہ میں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں آپ کو اپنے اپنے دور

کے ان دونوں قد آور انسانوں کے فن اور شخصیت کے خدوخال صاف ہوتے نظر آئیں گے۔ اور یہی اس کتاب کا منشاء و مطمح نظر ہے۔

خوشحال و غالب ہمارے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی زبان کو آئینِ نو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے ادب میں درجہ کمال پر فائز ہیں۔ دونوں اپنے متعلق یہ یقین گواہی کر گئے کہ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہیں آئے گا۔

خوشحال

نہ بہ زما غندی بل ننگیالے راشی
نہ بہ زما غندی بل جنگیالے راشی
ختک خو پر پردہ پہ درست افغان کنبی
عجب کہ ہسی فرہنگیالے راشی
ترجمہ:- ندی کوئی میری طرح ناموس پرکٹ مرنے والا آئے گا۔

ندی (میرے بعد) کوئی مجھ جیسا جنگجو آئے گا۔

خلک کا کیا شمار ہے پوری افغان قوم میں

عجب کہ کوئی مجھ جیسا فہیم اور عقلمند آئے۔

غالب:-

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا

پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

اس کتاب کو لکھنے کے لیے بے شمار کتابیں، ماہنامے، رسالے اور بیش قیمت مقالے میری نظر سے گزرے۔ جہاں مناسب سمجھا گیا وہاں ان تمام سے چیدہ چیدہ اقتباسات ”موازنہ خوشحال و غالب“ میں دے دیئے گئے ہیں۔ اور ان کتب، رسائل و مقالات کا ذکر ہر اقتباس کے ساتھ Reference کے طور پر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمام متعلقہ مصنفین، مؤلفین، مقالہ نگاروں اور ناشرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کے بیش قیمت خیالات سے ”موازنہ خوشحال و غالب“ کو از حد فائدہ پہنچا۔ اور اس کی افادیت میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

آخر میں اس کتاب کے مکمل ہونے پر میں اپنے رب ذوالجلال کا جس قدر شکر بجالاؤں کم ہے۔

تجھ ہی سے مانگنا میرا شعار ہو یا رب
بیش مجھ کو پہچانی رہے غنا تیری

ناز سرحدی

ناز سرحدی

۸ ہیرن گیٹ روڈ

ہمبرشٹون۔ لیسٹر (برطانیہ)

جون ۲۰۱۱ء

باب اول شخصیت

حیاتِ غالب

سنین کے آئینے میں

۱۷۹۷ء پیدائش دسمبر مطابق ۸ رجب ۱۲۱۳ھ اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ولد عبداللہ بیک بن مرزا اتوقان بیک بمقام آگرہ۔

۱۸۰۲ء وفات عبداللہ بیک غالب اپنے چچا نصر اللہ بیک کی سرپرستی میں آئے۔
۱۸۰۳ء لاڑ لیک نے دہلی کو فتح کیا۔

۱۸۰۶ء غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیک کی وفات جنہوں نے غالب کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔
غالب اپنے نانا خوجہ غلام حسین کیدان رحیمس آگرہ کی سرپرستی میں آئے۔
۱۸۰۶ء شاہ عالم کی وفات اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۰۷ء ایک روایت کے مطابق غالب نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔
۱۸۰۹ء دوسری روایت کے مطابق اس سال سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور رنگ بیدل کو اپنایا۔

۱۸۱۰ء نواب الہی بخش خان معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خان والئی فیروز پور جھر کہ جاگیر دار لوہاروی بھتیجی امراء بیگم سے شادی ہوئی۔

۱۸۱۰ء نواب حسام الدین حیدر نے ان کا کلام میر تقی میر کے سامنے پیش کیا۔

۱۸۱۱ء عبدالصمد کی شاگردی۔

۱۸۱۳ء آگرے سے دہلی میں آمد اور قیام۔

۱۸۲۱ء اردو کلام کی تدوین بہ ترتیب ردیف (یہی دیوان غالب نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت ہے)

۱۸۲۲ء فارسی شاعری کا آغاز ۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۰ء فارسی نظم و نثر

۱۸۲۵ء فارسی زبان میں پہلی نثری تصنیف رسالہ قواعد نیز شیخ آہنگ تصنیف ہوئی۔

۱۸۲۶ء پنشن کی حصول کے لیے کلکتے کا سفر۔ مرزا الہی بخش معروف خسر غالب کی وفات۔

۱۸۲۶ء دہلی سے کلکتے کی طرف روانگی انتخاب دیوان اردو۔

۱۸۲۷ء لکھنؤ کا سفر۔ لکھنؤ سے کانپور اور پھر پاندرہ۔

۱۸۲۸ء ورود کلکتہ، معرکہ حامیان قتل، دربار انگریزی کا آغاز۔

۱۸۲۹ء دہلی میں مراجعت (۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء انتخاب کلام فارسی وارو۔ موسوم بہ ”گل

رعنا“ کی تدوین بفرمائش مولوی سراج الدین احمد)

۱۸۳۱ء پنشن کا دعویٰ جسے ولیم ٹنک نے خارج کیا۔

۱۸۳۲ء انتخاب کلام اردو دیوان مروج

۱۸۳۵ء فریزر کا قتل نواب شمس الدین خان کو سزائے موت، کلیات فارسی ”میفانہ آرزو“

کے نام سے مرتب ہوا۔

۱۸۳۷ء کلیات غالب فارسی کی تدوین

۱۸۳۱ء دیوان غالب اردو کے پہلے ایڈیشن کی طباعت، مطبوعہ سید الطابع دہلی، قمار بازی کے الزام میں پہلی بلڈپرس۔

۱۸۳۲ء دہلی کالج میں پروفیسری کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۳۵ء دیوان فارسی ”میکانہ آرزو“ کا پہلا ایڈیشن، مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا۔

۱۸۳۷ء دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت، مطبع دارالسلام دہلی، قمار بازی کے الزام میں کوئوال شہر فیض الحسن کے ہاتھوں گرفتار ہو کر تین ماہ تک قید میں رہے۔

۱۸۵۰ء بہادر شاہ سے نجم الدولہ دیر الملک نظام جنگ کا خطاب اور چھاس روپے ماہوار تنخواہ۔ تاریخ نویسی پر تقرر۔ ولی مہد شہزادہ فتح الملک کی استادی ریختہ گوئی کا دور ثانی۔

۱۸۵۱ء مرزا جو اس بخت کی شادی اور غالب و ذوق کی کشیدگی۔

۱۸۵۲ء ”مہر نمرود“ لکھی۔ وفات زین العابدین عارف

۱۸۵۳ء استاد شہ مقرر ہوئے۔ چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

۱۸۵۵ء مہر نمرود کا پہلا حصہ شائع ہوا۔

۱۸۵۷ء جنگ آزادی، دیوان اردو ترتیب دیا اور اس کا ایک نسخہ رامپور بھیجا۔ دربار رام پور سے تعلق۔ وفات مرزا یوسف۔

۱۸۵۸ء دستخط کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید الخلائق آگرہ

۱۸۵۹ء نواب رامپور نے سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی جو وفات تک ملتی رہی۔ سفر میرٹھ۔
۱۸۶۰ء نواب کی دعوت پر رام پور گئے۔ ترتیب کلام غالب بدست ناظر حسین مرزا قاطع
برہان لکھی۔

۱۸۶۱ء دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن 'مطبع احمد دہلی' مرزا صاحب درو قونج میں چھپا ہوئے۔
ترتیب کلیات فارسی

۱۸۶۲ء دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن 'مطبع نظامی' کانپور
۱۸۶۳ء حکومت انگلیشیہ سے خلعت عطا ہوئی۔ "نگارستان سخن" مرتبہ ظہیر دہلوی میں
انتخاب کلام غالب کی لمباعت (اس مجموعے میں ذوق مومن اور غالب کے کلام کا انتخاب
تھا اور یہ مطبع مفید الحقائق آگرہ میں باہتمام فشی شیونرائن چھپا) کلیات فارسی کا دوسرا
ایڈیشن فشی نو لکھنور نے شائع کیا۔

۱۸۶۳ء مشنری ابرگہر باراکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔

۱۸۶۵ء نواب یوسف علی خان کے انتقال پر نواب کلب علی خان جانشین ہوئے۔ تو
غالب نے رام پور کا سفر کیا قاطع برہان نظر ثانی اور اضافوں کے بعد دوش کا دیانی کے نام
سے شائع ہوئی۔ لطائف بھیجی اور سوالات عبد الکریم شائع ہوئی۔

۱۸۶۶ء آخری انتخاب کلام بفرمائش خلد آشیان نواب کلب علی خان دہلی رامپور۔
حواس بانگلی کا اقرار

۱۸۶۷ء مولوی امین الدین پر ازہ حیثیت عربی کا مقدمہ۔ "سہد بچین" کے نام سے

فارسی کلام مطبع محمدی دہلی سے شائع ہوا۔ تیغ تیز شائع ہوئی۔ نکات و رقعات غالب شائع ہوئی۔ حسین علی خان معتمدی کی نواب احمد بخش خان کے حقیقی بھائی کی پوتی سے نسبت۔

۱۸۶۸ء عہد ہندی کا پہلا ایڈیشن مطبع مہبائی، میرٹھ کلیات نثر فارسی (منج آہنگ، دستجو، مہر نیمروز) منشی فولکشور نے پہلی مرتبہ مرزا غالب کی اجازت سے شائع کی۔ ادائے قرض کے لئے وائس راہپور سے اعانت کی درخواست۔

۱۸۶۹ء وفات غالب ۱۵ فروری مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ پیر کے دن ظہر کے وقت نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

حیاتِ خوشحال

سنین کے آئینے میں

۱۶۱۳ء۔ (جون مطابق ربیع الاول ۱۰۲۲ھ) خوشحال خان ولد شہباز خان بن بچئی خان بمقام سرانے اکوڑہ خٹک جہانگیر بادشاہ کے دور میں پیدا ہوئے۔

۱۶۲۶ء۔ خوشحال خان نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسفویوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔

۱۶۳۱ء۔ خوشحال خان کی پہلی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی۔

۱۶۳۳ء۔ خوشحال خان نے ۲۰ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۶۴۰ء۔ وفات شہباز خان، خوشحال خان کو اٹھائیس سال کی عمر میں باپ کی جگہ خٹک قبیلہ نے اپنا سردار مقرر کیا۔ عہد شاہجہان کے چودہویں سال فرمان شاہی کے ذریعے خوشحال خان کو اپنے قبیلے کا سردار مان لیا گیا۔

۱۶۴۱ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ کانگڑہ کی مہم میں حصہ لیکر تارا گڑھ کے قلعہ پر کیا۔

۱۶۴۶ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ پنجاب و بدخشاں کی مہم میں حصہ لیا۔

۱۶۳۹ء۔ شاہ جہان بادشاہ قندھار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاہی دربار میں حاضری دی
۱۶۵۸ء۔ اورنگزیب عالمگیر کی تخت نشینی۔

۱۶۶۳ء۔ گورنر کابل سید امیر خان خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت خوشحال خان خشک کو گرفتار کر کے پابہ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا۔ اور راتھستان میں جے پور کے نزدیک قلعہ رتھمبور میں قید کر دیا گیا۔ اُس وقت خوشحال خان کی عمر ۵۱ برس تھی۔ اپنا زیادہ تر کلام اور چند دوسری کتابیں خوشحال خان نے اسی قید میں تصنیف کیں۔

۱۶۶۹ء۔ پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد خوشحال خان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اکوڑہ خشک پہنچا اور مغلوں کی مخالفت اختیار کی۔

۱۶۷۲ء۔ خوشحال خان نے پشتون سرداروں اسماعیل خان مہمند اور دریا خان افریدی کے ساتھ مغل صوبیدار محمد امین خان کے لشکر کے خلاف جنگ خیر میں تعاون کیا۔ اور پشتونوں کی اس فتح کو اپنے کلام میں بہت سراہا۔

۱۶۷۳ء۔ خوشحال خان نے قلعہ نوشہرہ پر حملہ کر کے مغلوں کو وہاں سے بھگایا اور انگزیب عالمگیر کی بذات خود حسن ابدال میں آمد تا کہ سرحدی جنگوں کی کمان خود سنبھالے۔

۱۶۷۴ء۔ (۱) خوشحال خان نے پشتونوں کو مغلوں کے خلاف متحد کرنے کے لیے سوات کا سفر کیا۔ جسکے دوران ”سوات نامہ“ کے عنوان سے اپنا شعری سفر نامہ بھی ترتیب دیا۔ ۱۶۷۹ء

(۲) خوشحال خان اپنی زندگی کے آخری چند سال اپنے بیٹے بہرام اور اسکے امدادی مغلوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے کے بعد آفریدیوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

۱۶۸۹ء۔ خوشحال خان ۷۶ برس کی عمر میں اپنے گھر سے دور آفریدیوں کے علاقہ میں وفات پا گئے۔ انہیں انکی وصیت کے مطابق اکوڑہ خٹک کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایسوی بالائنامی گاؤں کے متصل پہاڑیوں کے دامن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

خوشحال اور غالب کی ولادت اور بچپن

”مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد حکومت میں ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ (مطابق مئی - جون ۱۶۱۳ء) میں شہباز خان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔ جس کی قسمت میں نہ صرف افغانوں کی تاریخ کے ایک خاص دور میں ان کا قومی شاعر و مفکر اور ان کا فوجی و سیاسی قائد ہونا لکھا تھا بلکہ جسے اس کے فن اور علمی و ادبی آثار کی جامعیت و عمومیت کی وجہ سے (جوں جوں وہ سمجھا اور جانا جائے گا) ہر جگہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو شہرت و ناموری کے اس بلند مقام تک پہنچا جہاں معدودے چند افغانوں کو رسائی حاصل ہوئی۔ جس کا یوم ولادت افغانوں کی تاریخ میں آپ زر سے لکھا جائے گا۔ اس بچے کا نام خوشحال خان رکھا گیا۔“ خیر عالمیانی“ ۱۰۲۲ھ اس کا مادہ تاریخ ولادت ہے“

(دوست محمد کامل۔ ”خوشحال خان خٹک“)

”مرزا غالب کے دادا محمد شاہ کے زمانے میں سرحد سے ہندوستان

آئے اور لاہور میں معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ
 دہلی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف کی سرکار میں انہیں ایک
 معقول ملازمت مل گئی اور پچاسوا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہی
 کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا
 دولہا تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان
 کسیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے ایک تو مرزا
 اسد اللہ خان غالب جنہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا
 اور دوسرے مرزا یوسف خان۔۔۔۔۔ اسد اللہ بیگ خان عرف مرزا
 نوشہ اسد اور غالب جنھیں 'قوم ترک' ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر
 ۱۷۹۷ء) بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس خاندان میں
 آنکھ کھولی وہ ایک ترکوں کا مشہور خاندان تھا۔ (مرزا غالب نے
 اپنے آپ کو بلوچی و افریسیانی و پشتی کہا ہے)۔

(پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی۔ احوال و نقد غالب)

جہاں خوشحال نے ۱۳ برس کی عمر میں یوسفزئیوں کے خلاف اپنی پہلی جنگ لڑی
 ۱۸ سال کی عمر میں پہلی شادی ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۲۸ سال کی عمر
 میں انہیں اپنے باپ کی وفات پر تنگ قبیلہ کا سردار بنایا گیا۔ وہاں غالب ۵ سال کی عمر میں
 ۱۲ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۱۳ برس کی عمر میں انکی شادی ہو گئی جس

کے بعد وہ آگرہ سے دہلی آئے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں خوشحال نے زیادہ دھیان شکار کو دیا اور کم مدرسے کو۔ کم و بیش یہی حال غالب کا بھی تھا۔ انہوں نے زیادہ دھیان عیش و عشرت کو دیا اور کم مدرسے کو۔ مگر ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جناب صلاح الدین ندیم نے غالب کے کتب کے ماحول اور ان کے کھلنے والے پن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بطور عمومی خوشحال کے بچپن کے بھی حسب حال ہے۔ آئیے دیکھیں :-

”کتب کی روایتی اور تنگ فضا میں تھکن محسوس کرنے والا بچہ جب اس فضا کو قبول نہیں کرتا اور درسی کتب کی طرف توجہ نہیں کرتا اور بیشتر وقت کھیل کود میں صرف کرتا ہے اور کتب سے باہر کی کھلی فضا کا متلاشی رہتا ہے۔ تو بڑے بڑوں کی نگاہ میں وہ اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔ حالانکہ گریز پائی کا یہ انداز کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بزرگوں کی عمر بھر کا تجربہ ان کے اپنے زمانے کا تجربہ ہوتا ہے۔ اور اس تجربے کی حدود اس قدر وسیع نہیں ہوتیں کہ نئی نسل کے تقاضوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور وسعت طلبی کے خمیر سے تخلیق پانے والے بچے کی اتنا اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتی۔ وہ بھانپ لیتی ہے کہ اس کی پرورش اور نمو کے لیے کون سا زمانہ مناسب ہے اور اس سلسلے میں نوخیز نگاہ کا تجسس اس کی رہنمائی کرتا

ہے۔ بچے کا تجسس خالص اور کھرا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات کی تنگ جگہاؤں کو چکانے کے لیے اسے زمانے کے چڑھتے ہوئے تازہ اور نئے سورج سے توانا کر نہیں فراہم کرتا ہے اور پھر یہاں قیام نہیں کرتا۔ باہر نکل کر اپنے ارد گرد کو محسوس کرتا ہے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہاں بھی نہیں ٹھہرتا اور کائنات کی لامحدود وسعتوں کو اپنی نگاہ میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔
 --- غالب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کے کلنڈرے بچے کی اتا کی طرح ہے“

(صلاح الدین ندیم۔، غالب کا ذوق تجسس“)

ایک اور اتفاق یہ بھی ہوا کہ خوشحال کے والد شہباز خان اور غالب کے والد عبداللہ بیگ خان دونوں میدان جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ اس سے آگے ان دونوں یعنی خوشحال و غالب کی تابعدار شخصیتیں اپنی اپنی علیحدہ ڈگر پر مختلف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جانتی ہیں۔

خوشحال و غالب شخصیت

خوشحال و غالب دو ٹائپ روزگار شخصیتیں گذری ہیں۔ انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے وہ ان کی شخصیتوں کے زیر اثر تھا۔ تو چاہئے کہ ہم ان دونوں کی شخصیتوں کے تمام تر پہلوؤں پر نظر ڈالیں اور جانیں کہ یہ ٹائپ شخصیتیں برصغیر کے شعر و ادب کی تاریخ پر کیسے اور کیونکر ثبت ہوئیں۔

خوشحال کی شخصیت

، اقوام کی تاریخ میں ہر زمانے کا ایک مخصوص دورانیہ انقلاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس تقاضے یا وقت کی پکار کو پورا کرنے کے لیے فطرت ایک انسان کا انتخاب کرتی ہے۔ اس منتخب انسان کو قدرت بڑی فیاضی سے اوصاف، سوچ اور کمال بخشتی ہے۔ تاکہ وہ حالات کو بدلنے اور زمانے

کارخ دوسری طرف موڑنے پر قاور ہو جائے۔ ایسے لوگ اپنے دور کے نابعد کہلاتے ہیں۔ کہیں ایک فنکار پیدا ہو جاتا ہے تاکہ حسن کی حقیقت و عایت کی تلاش میں دوسروں کی راہنمائی کرے۔ کوئی جرنیل پیدا ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا کرنے اور انقلاب برپا کرنے کا داعی بنے۔ فلسفی اور حکیم پیدا ہوتا ہے کہ غور و فکر کی راہ راست کی نشاندہی کرے اور فورات و موجودات کے اس بڑے کارخانے اور کائنات زیت کے چھپے رازوں سے پردہ اٹھائے۔۔۔۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علوم و فنون کی تمام خصوصیتیں ایک ہی شخصیت میں مرککز ہو جاتی ہیں۔ قدرت اپنے جلال و جمال اور کمال کا اظہار ایک ایسے انسان کی پیدائش کی صورت میں کرتی ہے۔۔۔ ایسی ہی ایک شخصیت عظیم خوشحال خٹک کی ہے کہ دنیا کے نادر اور نابعد انسانوں میں ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔“

ڈاکٹر راج دلی شاہ خٹک، ”خوشحال خان خٹک“

سہ ماہی پشتون، جون۔ اگست ۲۰۰۱ء

قدرت کا احسان کہ اس نے خوشحال جیسے انسان کو پشتون قوم میں پیدا کیا۔ مگر خوشحال کی پہلو دار شخصیت کے پیش نظر ان پر قلم اٹھانا مشکل سے دوچار کر دیتا ہے۔ کہ کہاں سے شروع کیا جائے اور کیسے۔ مشہور ماہر خوشحالیات پروفیسر پریشان خٹک کو بھی یہی مشکل

در پیش آتی :-

، خوشحال خان خٹک اگر نر شاعر ہوتا تو اس پر بات کرنے میں اتنی دشواری پیش نہ آتی۔ مگر جو شخص بیک وقت شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی بہادر سپاہی، تجربہ کار جرنیل، فیلسوف، حکیم، ماہر فلکیات، ماہر انساب، تاریخ دان، سیاست دان، جغرافیہ دان، معلم اخلاق، شکاری اور اعلیٰ درجے کا شہسوار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو تو اس پر کچھ کہنے یا لکھتے وقت دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں پر ختم کی جائے۔

(پروفیسر پریشان خٹک۔، خوشحال خان خٹک، از خوشحال نامہ ص ۳۵)

اگر تاریخی تناظر میں دیکھنا ہو تو بات خوشحال کے پردادا ملک اکوڑے سے شروع کی جانی چاہیے کہ اس نے اپنے رشتہ داروں سے ناراض ہو کر کوہاٹ میں اپنا علاقہ کر بوند (نہری) چھوڑا اور درہ سونیاں میں آ مقیم ہوا۔ بعد میں شہنشاہ اکبر کو جب ایک سے پشاور جانے والی شاہراہ کی حفاظت کا خیال آیا تو اسکی نظر انتخاب ملک اکوڑے پر پڑی اور بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔ اس کی قد ر افزائی کی اور اس شاهی سڑک کی حفاظت کا کام اسے سونپ دیا اور خیر آباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ اسے بطور جاگیر عطا کیا۔ یوں ملک اکوڑے مغل شہنشاہ کی ملازمت میں آ گیا۔ اس نے موقع کی مناسبت سے خیر آباد اور نوشہرہ کے درمیان شاهی سڑک کے کنارے اپنا انگ گاؤں سرانے کے نام سے آباد کیا جو آجکل ملک اکوڑے کے

نام کی مناسبت سے سرائے اکوڑہ خشک کہلاتا ہے۔ ملک اکوڑے کا جانشین اس کا بیٹا بچی خان ہوا۔ اور جب بچی خان بولاق خشکوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا تو اسکے بیٹے شہباز خان نے اپنے باپ کی جگہ سنبھالی۔ یہی شہباز خان خوشحال کا باپ تھا۔ لیکن شہباز خان یوسٹریوں کے خلاف ایک معرکہ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اور آخر کار اپنے قبیلے خشک کی سرداری کا بوجھ خوشحال کے کندھوں پر آ پڑا۔ اس وقت خوشحال کی عمر ۲۸ برس تھی۔

جب خوشحال سردار بنا۔ تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یوسٹری علاقہ پر چڑھ دوڑا اور اپنے دشمنوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اُن دنوں مغل بادشاہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ اگلے سال خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ بلخ، بدخشان اور کابل (تاراگزہ) کی مہمات سرکیں۔ جس کے عوض شاہجہان نے خوش ہو کر لاہور کے مقام پر اُسے چار لاکھ روپیہ نقد انعام اور اڑھائی لاکھ روپے کی جاگیر عطا کی اور ساتھ ہی خوشحال کو خدمت شاهی کے لئے پانچ سو سوار اور ایک ہزار پیدل فوج تیار رکھنے کا حکم بھی دیا۔

۱۶۳۹ء میں شاہجہان قدہار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاهی دربار میں حاضری دی شاہجہان کی مہربانیوں کے پیش نظر خوشحال نے اپنے کلام میں شاہجہان کو قدردان کہہ کر یاد کیا ہے۔ مگر شاہجہان کی نظر بندی کے بعد جب اورنگزیب نے عثمان حکومت سنبھالی تو بادشاہ کے عمال اور خوشحال کے درمیان کسی غلط فہمی کی وجہ سے خوشحال کو ۱۶۶۳ء میں جبکہ اُس کی عمر ۵۱ برس تھی۔ اور وہ تقریباً تیس سال

تک نہایت وفاداری کے ساتھ مغلوں کی ملازمت کرتا رہا تھا۔ گورنر کاٹل سید امیر خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت پشاور بلوا کر گرفتار کر لیا گیا اور پابہ سلاسل دہلی لے جایا گیا۔ اسکے بعد اسے راجستان میں جے پور کے نزدیک رتھمبور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ خوشحال نے اپنی کلیات کا بیشتر حصہ فراق نامہ اور دستار نامہ اسی قید کے دوران لکھے۔ اور اسی قید کے دوران خوشحال نے اورنگزیب کے خلاف متعدد قصیدے بھی لکھے۔ اپنے وطن کی یاد اور ہند سے نفرت کے بارے میں بھی اسی قید کے دوران اپنے یادگار قصیدے اور غزلیں لکھیں۔ خوشحال کو کم و بیش پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد اپنے وطن واپس آنا نصیب ہوا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا خوشحال تھا۔ اسے اپنی بے گناہی کا یقین اور قید کی وجہ سے ذلت پر بے انتہا صدمہ تھا اس نے قبیلے کی سرداری اپنے بیٹے اشرف خان کے حوالے کی اور خود مغل حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے واضح کاف الفاظ میں اعلان کر دیا:-

د افغان پہ ننگ می او تر لہ تورہ

ننگیالے د زمانے خوشحال ختک یم

ترجمہ:- میں نے افغانوں کے نام کی خاطر (اپنی کمرے) نکوار باندھی ہے۔ میں زمانے بھر کا غیرت مند خوشحال ختک ہوں۔

سراولف کیرو نے اپنی کتاب .. دی پویز آف خوشحال خان خٹک کے شروع ہی میں تعارف کے طور پر یہی شعر نقل کیا ہے۔

"My Sword I girt upon my thigh To guard our nations ancient
fame,
Its champion in the age am I , The khattak khan, Khushhal my
name,

یاد رہے خوشحال کی لوحِ قہر پر اس کا اہلایہ شعر آج بھی کندہ ہے۔

اب خوشحال کی زندگی کے دو بڑے مقاصد رہ گئے تھے۔ پشتونوں کا اتحاد اور
اورنگزیب کی مخالفت۔ یوں دیکھا جائے تو یہ ہر دو مقاصد ایک دوسرے میں پیوست تھے۔
پشتونوں کے اتحاد کے بل بوتے پر خوشحال مغل بادشاہ اورنگزیب کی مخالفت میں کامیاب
ہو سکتا تھا۔ ایک موقع پر خوشحال نے اتحاد کی برکت کو اجاگر کرنے کے لیے یہ اشعار کہے:-

چپی مغل وتہ می وتہ لہ تورہ

دوست پشتون می و عالم وتہ بنکارہ کر

اتفاق پہ پشتونو کنہی پیدا نہ شو

گنہی ما بہ د مغل گریوان پارہ کر

ترجمہ:- ”جب میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی

تو تمام پشتون قوم کو دنیا میں نمایاں کر دیا

(مگر) پشتونوں میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا

ورنہ میں مغلوں کے گریبان پارہ پارہ کر دیتا“

پشتونوں کے اتحاد کی خاطر خوشحال تمام پشتون قبائل کے پاس گئے اور انہیں متحد کرنے کی کوشش کی۔ چند ایک قبائل یعنی مہند، آفریدی اور شنواری تو خوشحال سے آ ملے لیکن پشتونوں کے سب سے بڑے قبیلے یوسلوئی نے خوشحال کا ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ اتحاد کی خاطر خوشحال نامساعد حالات میں یوسلوئیوں کے گڑھ سوات بہ نفس نفیس گئے تھے۔ سفر سوات کا جو فائدہ ہوا وہ خوشحال کی کتاب سوات نامہ کی شکل میں سامنے آیا یعنی اتنے مشکل حالات میں بھی خوشحال نے لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا۔ سوات نامہ میں سوات کی تاریخ وہاں کے لوگوں اور وہاں کے جغرافیے سے متعلق باتیں درج ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ سوات نامہ خوشحال کی وہ کتاب ہے جسے پشتو میں پہلے سفر نامے کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ اسی سفر کے دوران خوشحال اور اخون درویشہ کے مرید خاص شیخ میاں نور کے درمیان اخون درویشہ کی کتاب مخزن اسلام کے بارے میں مناظرہ بھی ہوا۔ جس میں خوشحال نے مخزن کی خامیاں منظر عام پر لائیں۔ جو پشتون قبائل خوشحال سے آ ملے تھے۔ ان کی مدد سے خوشحال نے مغلیہ افواج کو چھ مقامات پر شکست سے دوچار کیا۔ ان جنگوں میں مغلیہ سلطنت کے ہزاروں فوجی اور چند نامور جرنیل بھی مارے گئے۔ ادھر اورنگزیب نے خوشحال کی کامیابیوں کو روکنے کے لیے دو کام کئے۔ پشتون قبائل میں اپنی دولت ایسی پھیلائی کہ اکثر قبائل زر کی خاطر مغلیہ سلطنت کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ دوسرا کام اورنگزیب نے یہ کیا کہ خوشحال کے بیٹے بہرام کو خوشحال کی جگہ سردار مان لیا۔ اور خٹک قبیلے کے دوسرے سرکردہ افراد کو بھی انعامات سے نوازا۔ بہرام کو یہ مشن دیا گیا کہ وہ

اپنے باپ کو زندہ گرفتار کرے۔ کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں خوشحال خان اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور ہر وقت گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہنے لگے۔ وہ کسی ایک مقام پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے افریدیوں کے پاس پناہ لی۔ اور کچھ عرصہ بعد ۱۶۸۹ء میں انھیں ۸ سال کی عمر میں جلاوطنی کے دوران وفات پائی۔ وفات سے پہلے خوشحال بابا وصیت کر گئے تھے۔ کہ انہیں ایسی جگہ دفن دیا جائے جہاں وہ مقلوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والی گرد سے محفوظ رہیں۔ علامہ اقبال نے اس وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام افغانوں کا بلند
 محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کند
 منزل سے کسی طرح کمتر نہیں کہجان کا یہ پچہ : ار جند
 کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
 وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
 اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
 منزل شہسواروں کی گرد سمنہ

جیسا کہ خوشحال کے حالات زندگی سے ظاہر ہے وہ ایک آزاد طبیعت انسان تھے۔ شکار کھیلنا، حرب و ضرب کو مزید رکھنا قلم سے محبت رکھنا، پشتون قوم کو متحدہ اور آزاد دیکھنے کی بے حد خواہش، جمہوریت پسند، تنگ اور غیرت پر مرمٹنے والے باہمت انسان جو ایک رنگین مزاج

اور رومانی شاعر بھی تھے۔ جن کے اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔
 نثر اس کے علاوہ ہے۔ جو بہار کے موسم میں اپنی بیاض بغل میں دبائے سیر چمن کو نکلتے
 تھے۔ ساتھ میں ان کی حماسی شاعری کا بھی جواب نہیں۔ انہوں نے نہ صرف مرد اور تنکیاں
 کا تصور پیش کیا بلکہ باز کا ایسا تصور دیا کہ علامہ اقبال نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے
 شاہین کا تصور اپنایا۔ جس کی شاعری میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق شعر
 عرب کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور سراپا ملن ہاول کے مطابق جس کے اشعار کی بحور انگریزی
 شاعری کے قریب ہیں۔ خوشحال علم طب میں بھی طاق تھے۔ انکی کتاب طب نامہ اسی
 حقیقت کی غماز ہے خوشحال نے اگر ایک طرف افریدی حسین دوشیزاؤں کے متعلق ایک
 دلکش انداز میں لکھا اور پشتون عورت کو چمن و خطا کی خوبصورت حسیناؤں سے زیادہ
 خوبصورت جانا تو دوسری طرف قید و محصور کی یادگار کے طور پر ہندی حسیناؤں کی بھی
 تعریف کی اور انکے گن گائے ہیں۔

اپنے وطن کے خشک پتھروں کو سونے سے زیادہ عزیز رکھنے والے خوشحال کو کنگا جٹنا
 کے پانی سے زیادہ دریائے لنڈا (دریائے کاٹل) کے پانی کی یاد ہند میں قید کے دوران
 ستاتی رہی۔ مذہبی لحاظ سے ایک کڑی مسلمان جسے لہو و لہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔
 لیکن اگر آپ ان کی مے اور مے پرستی سے متعلق غزلیں پڑھیں تو ان سے زیادہ مے
 پرست آپ کو شاید کہ ملے۔ صوفیانہ شاعری اس کے علاوہ ہے۔ وہ اخلاقیات کے معلم کے
 طور پر بھی جانے جاتے ہیں

خوشحال کے اخلاق و عادات پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن خوشحالیات کے ماہر میاں سید رسول رسا نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق بڑا مربوط تبصرہ کیا ہے۔

”خوشحال خان اوچے اخلاق کے چشتون سردار تھے۔ مہمان نواز، مروت اور سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ دوسروں کی مالی مدد کرنے کے لیے مشہور تھے۔ اور اسوقت کے چشتون خوانین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔ باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔ گھوڑے باز اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔ اور باز تو بڑے شوق سے پالتے تھے۔۔۔۔ باز کا شکار خوشحال خان کی شاعری پر بہت اثر انداز ہوا۔ انکی شاعری میں شکاری پرندوں یعنی شاہین اور عقاب کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے“

سید رسول رسا آگے چل کر یوں رقمطراز ہیں:

”خوشحال خان پیدائشی شاعر تھے عاشق مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور اوباش نہیں تھے۔ خود فرماتے ہیں نہ تو میں خراباتی ہوں نہ قمار باز ہوں اور نہ ہی زنا کار ہوں“ اور خوشحال جب یہ کچھ کہتے ہیں تو صحیح کہتے ہیں ان میں کسی قسم کی بد عادت نہیں پائی جاتی تھی۔ البتہ ان کا جنسی ہیجان بہت تھا لیکن اس قسم کے خواہشات کی تکمیل کے لیے کوئی ناجائز اور حرام طریقہ انہوں نے نہیں اپنایا

اور اپنے آپ کو دوسری عورتوں سے بچاتے ہوئے انہوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ اپنے جنسی تجربات اور مشاہدات کا ذکر کلیات میں بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ انکی صاف گوئی اور حق گوئی پر دلالت کرتا ہے۔۔۔۔۔ باتوں سے سنجیدگی چپکتی تھی مگر ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔۔۔۔۔ خوشحال خان کے اخلاق و عادات کا رٹاموں اور تصانیف کے مطالعے کے بعد گمان ہوتا ہے کہ روہ کے پہاڑوں کے یہ سفید شہباز بشر نہیں بلکہ فوق البشر تھے“

(میاں سید رسول رسا، مقدمہ ارمغان خوشحال“)

”خوشحال خان خٹک کی زندگی بڑی بڑا شوب اور ہنگامہ فیر تھی انہوں نے کبھی بھی معمولی اور حقیر کاموں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ حق گوئی اور بے باکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کی تلواریں جو چمک اور حمزہ تھی ان کی شاعری میں اس سے بڑھ کر قوت اور زور تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اگر مغلیہ خاندان کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کیا اور ان کی سلطنت کو استحکام بخشنے میں ان کا مدد ہوا تو دوسری جانب جب انہوں نے مغلیہ خانواہوں کی لٹل پالیسیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آخر دم تک اپنی بات پڑ لے رہے“

(فہم دل راہی، بدیدہ و خوشحال“ از خوشحال نامہ)

خوشحال خان خٹک ایشیا کا عظیم ترین باغی تھا۔ جس نے دنیاوی عظمت کو ٹھکرا کر آزادی کا علم بلند کیا۔ جب تک روئے زمین پر ایک بھی حریت پسند باقی ہے صوبہ سرحد کے اس بطل جلیل کا نام اس وقت تک صفحہ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کے باغیانہ اشعار کی بازگشت رہتی دنیا تک ارباب فکر و نظر کے دل میں گونجتی رہے گی:

”آزادی کا مقام بادشاہی سے بلند ہے جب انسان کسی کا محکوم ہوتا ہے تو وہ قیدی ہوتا ہے۔“

(الہوب صابرؒ از خوشحال نامہ)

جب ہم اخلاقیات کا ذکر کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ خوشحال خود ایک بااخلاق شخصیت کے مالک تھے بلکہ ان کے کلام میں جا بجا اخلاقیات پر اشعار ملتے ہیں۔

چی زہ لہ تانہ د چاہنہ کیہی

بہ کرہ دعا گتہ دعا قبلہی

ترجمہ: اگر تیری وجہ سے کسی کا دل خوش ہوتا ہے۔ تو تو بھلائی کر دعا کریں گے کہ دعا قبول ہوتی ہے۔

آزارد ہیچاد اخستونہ دے

بنیرے د خوبو زرونو لگیہی

ترجمہ: بدعا کسی کی بھی نہیں لینی چاہئے، کیونکہ وہ کسی دلوں کی بددعا لگتی ہے۔

کہ دی زرہ دے چہ بد نہ مومے لہ چانہ

اول تہ پری پدہ دبدو خصلتونہ

ترجمہ:- اگر تو چاہتا ہے کہ کوئی تمہارے ساتھ بدی نہ کرے تو پہلے اپنی بُری خصلتوں کو چھوڑ دے۔

خوشحال کے کلام کا مطالعہ انہیں ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر بھی متعارف کرتا ہے۔ اسلئے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک پہاڑی قبیلے کے فرد ہونے کے ناطے ایک محدود سوچ رکھنے والے انسان تھے۔ بلکہ بدخشان، کامل، سوات، ایک، لاہور، دہلی، آگرہ، تاراگڑھ اور رتھنپور انکے دیکھے بھالے مقامات میں سے ہیں۔ بلکہ بلخ و بدخشان اور تاراگڑھ میں تو انہوں نے مظلیہ سلطنت کے ایک سردار کی حیثیت سے جنگی معرکوں میں حصہ لیا۔ اپنے کلام میں دوسرے مقامات کے علاوہ دہلی اور لاہور کا ذکر کیا ہے۔ دہلی شہر کی تحریف اور اس میں گزرنے والے پشتون اور منغل بادشاہوں کی تاریخ ایک طویل قصیدے کا شکل میں لکھی ہے۔ پنجاب کی رومانی داستان ہیر رانجھا اور شور کوٹ کا ذکر انکے کلام میں ملتا ہے۔ صلح کل کے داعی تھے۔ اپنی ایک غزل میں اپنے وقت کی مروج اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پشتو کے علاوہ وہ فارسی کے بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ انکی خوبیاں کہاں تک گنتوائی جائیں۔ بس کچھ کہ اکوڑہ کے پاس ایسوزی کی پہاڑی کے دامن میں اپنے حزار میں آسودہ آرام یہ ہستی خوشحال خان خٹک ہم سب کے ہیرو تھے۔ کیونکہ جس علاقہ کو وہ مظلیہ سلطنت کے پنجے سے (جسے وہ غیر ملکی طاقت سمجھتے تھے) آزاد کرانے کا عزم رکھتے تھے۔ وہ قد ہار سے لیکر

اب تک ملک کا علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ آج آزاد پاکستان میں شامل ہے۔ یوں خوشحال پاکستان کے شاعر کے طور پر جانے جائیگے۔ خوشحال کے مندرجہ اوصاف کو اجاگر کرنے کے لیے انکے چیدہ چیدہ اشعار پیش خدمت ہیں:-

یو د بنکار بل د کتاب بل د دلبرو

پہ جہان کنہی نورِ نہ شوے دا درِ مینہی

ترجمہ:- ”شکار کتاب اور حسینوں سے پیار ان تینوں کے علاوہ دنیا میں اور کوئی پیار نہیں۔“

پہ خان او پہ جہان کنہی ما وہ خیزہ دی و کنہلی

پہ خان کنہی دوارہ ستر گہی پہ جہان کنہی وارہ کنہلی

ترجمہ:- اپنی ذات میں اور باقی ساری دنیا میں نے دو چیزیں انتخاب کی ہیں۔ اپنی ذات میں دونوں آنکھیں اور دنیا میں سارے حسین۔

د خوشحال ختک خوشی پہ ہغہ وخت شی

چی بریبننا د سپینو توروشی پہ زغرو

ترجمہ:- خوشحال ختک کی خوشی تو اسوت ہوتی ہے۔ جب چمکتی ہوئی تلواریں زرہ سے نگرا کر روشنی پیدا کریں۔

بلہ ہیخ لیدلہ نہ شی پہ دا مہنخ کنہی

یا مغل د مہنخہ ورگ یا پہنتون خوار

ترجمہ:- کوئی درمیانی راستہ نظر نہیں آتا۔ یا مغل ج میں سے دفع ہو جائیگے یا پشتونوں کو خوار ہونا پڑے گا۔

کہ یہی موسیٰ اوپر سے ژمے گبینہ خورہ

خو بہ سود یہی خبر مہ کرہ خیل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

بہ جہان د ننگیالی دی دا دودہ کارہ

یا بہ و خوری ککری۔ یا بہ کامران شی

ترجمہ:- دنیا میں غیر تمند کے لئے یہ دو کام ہیں۔ یا تو اپنا سر ہار بیٹھے گایا کامران ہو جائیگا۔

تنگہ خولہ د غنچہ گل دہ بہ لیانو لکہ مل دہ

ترجمہ:- تمہارا تنگ دھان غنچہ گل کی طرح اور تمہارے لب شراب کی طرح ہیں۔

شور و شربہ د رانجا بہ جہان نہ وو

کہ د ہیر صورت پیدا نہ وے بہ شور گنبی

ترجمہ:- رانجے کی دنیا میں شور و شر نہ ہوتا اگر ہیر شور کوٹ میں پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

ہندو وائی چہ رام رام

مسلمان وئیل رب رب کا

وارہ بولی د خدانے نام

ہر یوہ و تہ چہ گوری

ہندو رام رام جیتے ہیں

ترجمہ:- مسلمان رب رب کہتے ہیں

ان میں سے جس کسی کو بھی دیکھو وہ خدا ہی کا نام لیتا ہے

دندانخہ تر قضا گرانہ دا قضا دہ

چی قضا شی د خلورو مصلحت

ترجمہ:- جہاں چار آدمیوں کا صلاح مشورہ قضا ہو جائے۔ تو یہ قضا نماز کی قضا سے زیادہ مشکل ہے۔

کہ ہر خودی پینٹنی جونہ طناز

داد ہند سکنہی ہم نہ دی بی نیاز

پہ جیو جیو درتہ پستی خبری وائی

ہر زمان لہ تا پہ خورنگہ ہمراز

عجب سرمے پہ پانہو شو ندی درتہ خاندی

میخی غائب پہ مسی تور عشوہ پرداز

ترجمہ:- پشتون عورتیں کتنی ہی شوخ و خشک کیوں نہ ہوں مگر ہندوستان کی یہ سانولیاں بھی اتنی بے نیاز نہیں۔ نری اور جی جان سے باتیں کرتی ہیں۔ ہر گھڑی تمہارے ساتھ ہیں اور ہر طرح سے تمہاری ہمراز۔ پان سے عجب طرح ہونٹ لال کر کے تمہارے سامنے کھل کھلائیں گی۔ دانتوں میں سونے کی پینیں چڑی ہوئی، مسی ملے ہوئے نماز و اعزاز والی۔

خوشحال کی ۳۰۰ ویں برسی کے موقع پر منظوم نذرانہ ہائے عقیدت

مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے کی نیا ہیں
 مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں
 انہی نغموں کے پرتو سے انگلیں جگمگاتی ہیں
 انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
 اسی ستارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن
 کرن اندر کرن روشن
 مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن

امجد اسلام امجد

تو جام غزل میں قطرہ قطرہ
 صبا کے حیات گھولتا ہے

اشعار میں تیرے نکتہ نکتہ
ہنوتوں خمیر ہوتا ہے

محسن احسان

ٹھٹک کھڑا تھا ، تان جویں کا ہجر
میں نے قدو نبات و لبین کر دیا
باکرہ تھی ابھی تک یہ پشتو غزل
اس اچھوتی کو میں نے دلہن کر دیا

اس مسافت میں افکار و انظار کی
کچھ نہیں فاصلہ ماہ کا سال کا
پیشرو تھے ابوالفضل و فیض مرے
پیشرو ہوں میں غالب کا اقبال کا

رضا ہمدانی

غالب کی شخصیت

غالب کی شخصیت کے بارے میں سب سے پہلے ہمیں وہ تہذیبی ماحول دیکھنا ہوگا۔ جس میں غالب کی پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا:-

،، غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دہلی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے تھا۔ یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلے میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں منصب داروں اور انکی سازشوں، مرہٹوں، روجیلوں، نوابین، اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا۔ اس کے اغراض بھی مختلف موقعوں پر ان ہی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہے۔ خواجہ غلام حسین کمیدان شاہی خاندان کے پروردہ تھے۔ غالب کے باپ الور کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چچا مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ بعد میں لارڈ لیک کی سرکردگی میں لڑے اور ان کی اولاد کسپنی کے دہلیف کی مستحق سمجھی گئی۔ غالب کے ایک اور بزرگ نواب احمد بخش تھے۔ جن کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہوئی۔ یہ انگریزوں کے بہت

بڑے دوست اور دہلی کے شاہی خاندان سے منسلک تھے۔ گویا بچپن میں غالب مظلوم مرہٹوں اور انگریزوں کی مرہٹانہ توجہ سے بالواسطہ فیض یاب رہے۔ غالب ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہوگی کہ مغل بادشاہ ہے اور نہیں بھی ہے۔ مرہٹہ مظلوم کا نائب ہے اور حاکم بھی ہے۔ انگریز مسلمان نہیں ہندو نہیں لیکن دہلی پر حکومت کرتا ہے اور میرے خاندان کے بزرگ ہر طاقت کے ساتھ ہیں اور جی پوچھو تو کسی کے ساتھ بھی نہیں۔“

ڈاکٹر خورشید الاسلام، غالب کا تہذیبی ماحول

جیسا کہ معلوم ہے غالب کی عمر ابھی مشکل سے پانچ برس کی تھی کہ انکے والد عبداللہ بیگ خان وفات ہو گئے اور غالب اپنے چچا نصر اللہ بیگ خان کی کفالت میں آ گئے جنہوں نے انہیں بڑے ناز و نعم سے پالا۔ نصر اللہ بیگ خان ایک خوشحال جاگیردار تھے۔ ایسے دیکھیں کہ اس ماحول نے غالب کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے:-

”غالب نے اپنے بچپن میں فراوانی و ولت اور آسائش کا جو رنگ دیکھا۔ اس نے غالب کے مزاج کی تشکیل میں ضرور ایک اہم حصہ لیا ہوگا۔ غالب کی زندگی میں آسائش، عزت اور زر کے حصول کی مسلسل تھک و دو کی ایک اہم وجہ غالب ابھی تھی کہ اس نے خوشحالی کا ایک وکٹس دوہرا دیکھا تھا اور قطعاً غیر شعوری طور پر اس دور کو ایک معیار قرار دے

دیا تھا۔ چنانچہ اس نے عمر بھر خوشحالی اور آسائش کے معیار تک پہنچنے کے لیے تنگ و دو کی اور ہر ناکامی اس کی آتش شوق کو فزوں تر کرتی رہی۔ ان حالات میں غالب کی شخصیت کی تکمیل میں اس کے خون گرم نے بھی حصہ لیا۔ ایک عام انسان تو شاید پیہم صدمات کے پیش نظر انفعالیات کے رجحان کو اختیار کر لیتا اور شکست و یاس کی ایک تصویر بن کر رہ جاتا لیکن غالب کے اندر زندگی کی رمتی کچھ زیادہ ہی توانا تھی۔ چنانچہ اس نے ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود ایک بہتر اور خوب تر معیار زندگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کی زندگی ایک مسلسل تنگ و دو بے قراری اور اپنی تمام زندگی سے بے اطمینانی کی تفسیر بن کر رہ گئی۔“

ڈاکٹر وزیر آغا ”غالب کی شخصیت“

غالب کے سرنواب الہی بخش معروف شاعر بھی تھے۔ اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ ذوق اور مومن بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے شمالی ہند کی دنیائے شاعری میں ان تینوں کا ڈنکا بجاتا تھا۔ معروف نے غالب کو شاہ نصیر کی شاگردی کے لیے ضرور کہا ہوگا مگر غالب اپنی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ کسی کو اپنا استاد ماننے پر تیار نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے غالب کی اس انفرادیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

”وہ (غالب) دہلی کی ادبی محفل میں داخل ہوئے تو بغیر کسی خارجی سہارے کے نہ دولت تھی نہ کوئی سرپرست اس کے علاوہ اس زمانے کا طرہ امتیاز یعنی کوئی استاد بھی نہ تھا جس کی شاگردی پر واسطہ راہداری بن کر ملک ادب میں ان کو اطمینان کے ساتھ قدم رکھنے دیجی غالب بے یار و مددگار میدان جنگ میں یکہ و تنہا داخل ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ وہ وصف اضافی یعنی آبائی افتخار اور پیش رفت کا شمار لے کر آئے۔ اپنی قابلیت و برتری کا احساس ان کو منکسر المزاج بننے نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔۔ صرف خال خال منتخب حضرات غالب کے دوست بن سکے۔ منجملہ دیگر اشخاص کے مولوی فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین، شیخ، مومن، کالے صاحب وغیرہ ان کے مزاج میں دخل پائے۔“

ڈاکٹر اعجاز حسین ”غالب اپنے زمانے میں“ ایک اور قباحیت یہ ہوئی کہ غالب مذہبی شعائر کے متعلق سنجیدہ نہیں تھے۔ اس ضمن میں انکی نماز اور روزے سے فوری اور مے خوری لوگوں کو بد دل کرنے کے لیے کافی تھی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے الفاظ میں ان کے کردار کی لغزش خواہ وہ ادب سے علاقہ نہ رکھتی ہو بدنام کرنے والوں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ بن جاتی تھی جو ان کے علمی اور ادبی کارناموں کو بھی مجروح کر دیتی تھی۔ یوں غالب کی شخصیت میں لغزائیت نے بڑھکر خود پرستی کو جنم

دیا۔ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد سمجھنے والا اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا بھی سمجھتا ہے اور اسکے احساسات اور جذبات میں رفعت بھی آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صورت حال کو اپنے مقالے میں یوں سمیٹا ہے:-

”غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت، پیشہ آباء، فنشن، نسب، خلعت، دربار تک رسائی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام باتیں نہ صرف غالب کو عزیز ہیں بلکہ وہ ان باتوں کو اپنی شاعرانہ کاوشوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم بھی خیال کرتا ہے۔ اور ان کے باعث اس کے ہاں جو ”خود پرستی“ کا جذبہ ابھرا ہے اس کی نوعیت ایک بڑی حد تک عامیانا ہے۔ لیکن شعر کی دنیا میں جہاں مادی عوامل جذباتی تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں یہی خود پرستی اس روپ میں ابھرتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے گویا غالب ایک اونچے سنگھاسن پر بیٹھا ہے اور ایک نگاہ غلط انداز سے گزرتے ہوئے کاروائی کو دیکھتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں غالب اپنے شعر میں خود کو احساسی اور جذباتی طور پر لوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے۔ خود پرستی کا جذبہ وہی ہے جو غالب کی عام زندگی میں موجود تھا لیکن ارتقا پا کر کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:-

ستائش گر ہے زہد اس قدر جس بارغِ رضواں کا
 وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا
 بازوچھو اطفال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
 جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
 پر طبیعت ادھر نہیں آتی“

ڈاکٹر وزیر آغا ”غالب کی شخصیت“

سفرِ کلکتہ غالب کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا بڑا احدف تھا گوکہ اس کی یلغار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل سے شروع ہوئی تھی۔ کلکتہ بنگال کا اہم شہر اور مرکز تھا۔ سید احتشام حسین نے اسے ”نیم فرنگی نیم ایشیائی“ شہر سے موسوم کیا ہے۔ غالب کو سفرِ کلکتہ اسلئے درپیش آیا کہ انکے چچا کی جاگیر کے صلہ میں انہیں جویشن انگریزی سرکار سے ملتی تھی وہ بند کر دی گئی تھی۔ جس کی واگذاری کے لیے غالب کو عدالت میں پیشی کے سلسلہ میں کلکتہ کا سفر درپیش ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً تیس برس (۳۰) تھی۔ وہ لکھنؤ، بنارس اور دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے جہاں انہوں نے اپنے دو سالہ قیام کے دوران مقدمہ بھی لڑا اور ادبی معرکے بھی سرکئے۔ سید احتشام حسین غالب کے قیامِ کلکتہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”غالب نے وہاں (کلکتہ میں) جو چہل پہل دیکھی، جو عمارتیں

دیکھیں، جو حسین و جمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بننا ہوا حمدن دیکھا
 اس نے انکا دل سوہ لیا۔ بتارس میں مناظر فطرت اور حسن انسانی نے
 ان کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا تو انہیں وہاں
 (کلکتہ) کے ”سبزہ زار ہائے مطرہ“ اور ”نازنین بتان خود آرا“ یاد
 آتے اور سینے پر تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی
 دوری کا غم بھی مٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے
 ہوئے بھی انسان کا ذہنی افق اسی طرح وسیع ہوتا ہے اور شعور اسی
 طرح وہ ذخیرہ جمع کرتا ہے جو اسے اپنی طبقاتی تنگ نظری سے باہر
 نکالنے میں معین ہوتا ہے“۔

(سید احتشام حسین ”غالب کا فکر“)

غالب کے قیام کلکتہ کو مولانا ابوالکلام آزاد نے انکی زندگی کا اہم موڑ کہا ہے۔ اگر دیکھا
 جائے تو غالب کو کلکتہ میں سبزہ زار اور نازنین کے علاوہ بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ سب
 سے پہلے تو غالب کو مقدمے کے سلسلے میں انگریزی عدالتی نظام اور انگریزی طرز حکومت
 سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ شیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی سے واقفیت ہوئی
 کلکتہ سے غالب ایسے خیالات اور تصورات لائے جو ان کے ہم عصر شعراء وادباء کے وہم
 و گمان میں بھی نہ تھے۔ سید احتشام حسین تو یہ تک کہتے ہیں کہ ”کوئی قطعی ثبوت تو نہیں دیا
 جاسکتا۔ لیکن غالب کے اردو خطوط میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی اردو تشریح سادگی دیکھ کر

یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کے دوسالہ قیام میں اس جدید نثر کا مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا جس کے حسن اور اثر سے اردو کے نثر نگار اس وقت ناواقف تھے۔

غالب نے اپنے سفر کلکتہ میں جو کچھ جانا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے شعور میں نئے انگریزی نظام حکومت و اقتصاد کا ایک دھندلا سا نقشہ بننا چلا گیا۔ جس کا مقابلہ وہ ہندوستان کے موجودہ جاگیرداری نظام سے کر سکتے تھے۔ نتیجتاً انہیں کہنا پڑا:

صاحبان انگلستان راگر

شوہ و اعزاز اپناں راگر

داو و دانش را بہم پیوستہ اند

ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتش کز سنگ بیروں آدرند

ایں ہنرمنداں زخس خوں آدرند

کلکتہ میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اسکے اثرات کا شبلی ہند تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ جو عذر کی صورت میں دہلی پہنچا۔ سفر کلکتہ غالب کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ عذر انکی زندگی کا ایک موڑ تو کہلایا جاسکتا ہے مگر اتنا اہم نہیں کہ غالب کو حیراں کر دے گو کہ اپنے بھائی یوسف مرزا کی عین عذر کے دوران وفات سے غالب اپنی بے سرو سامانی کی وجہ سے پریشان ضرور ہوئے۔ غالب پر عذر کی اثرات کی نوعیت کیا تھی:

”عذر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس

کے علاوہ وہ پہلے ہی سے اس نظام کی جہی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ جب حکومت بدلی تو انہیں حیرت نہ ہوئی بلکہ ان کے لیے یہ کوئی ایسی بات ہوئی جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔۔۔ غالب کا نقطہ نظر اس سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذر کی وجہ سے پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلی کو ایک حقیقت سمجھ کر اور انگریزی حکومت کو ایک نئی سلطنت سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس لیے اس کے اندر اس نئی حکومت کے خلاف کوئی جذبہ نہیں معلوم ہوتا۔“

(سید احتشام حسین ”غالب کا فکر“)

اگر غالب کے ذہنی ارتقاء پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غالب کی ذہنی ترقی کا دور پندرہ تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ عذر کے بعد بارہ برس اور زندہ رہے جس کے دوران شعر گوئی تقریباً ختم کر دی۔ شاعری میں شاعروں کی غزلوں کی تصحیح تک محدود ہو گئے ہاں البتہ انہوں نے اردو میں خطوط نگاری شروع کر کے شاعری کی کمی کا ازالہ کرنے کی ایک صورت ضرور نکالی:-

”غالب کے یہاں نکتہ نئی اور شوخی شروع سے تھی۔ اور اس کے اثر سے ان کی شاعری میں ایک لطیف چاندنی بھی موجود تھی مگر خطوں میں اس دولت بیدار نے ایک ایسا حسن اور کیف بھر دیا ہے جو غالب کی جامعیت اور ان کی بھرپور شخصیت کا اردو ادب کو آخری تحفہ

ہے۔۔۔ غالب کو آخری وقت تک اپنے اوپر قابو رہا۔ وہ اپنے جگر پاروں کی قربانی بھی کر سکتے تھے اور جب ایک شمع بجھنے یا دھم پڑنے لگتی تو دوسری شمع جلا سکتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح وہ بھی ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو ان کے سارے کارناموں سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ ان کی شخصیت کی آب و تاب سے ان کی تصانیف کو روشنی ملتی رہی مگر ان کا اپنا شعلہ رخشندہ و تابندہ رہا۔“

(آل احمد سرور ”غالب کا فنی ارتقاء“)

کہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت ان کی شاعری سے زیادہ ان کے خطوط میں جھلکتی ہے۔ انکی خطوط نویسی کی افادیت، ذیل کے اقتباسات سے پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ اور ساتھ میں غالب کی شخصیت بھی:-

”غرض مرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیئے ہیں کہ تنہا انہی کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ خطوط محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالب کے خطوط ہیں بلکہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں مثلاً ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔ ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمل تصویر

خود ان کے موقلم سے تیار ہو کر سامنے آ گئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے نہ کلیات نثر فارسی میں اور نہ اردو دیوان میں۔“

(مولانا غلام رسول مہر ”خطوط غالب کی اہم خصوصیات“)

”اردو کے اس بڑے شاعر کی داستان حیات یوں تو بڑی سادہ ہے لیکن حقیقت میں اس میں بڑی رنگارنگی ہے جس کا ایک ہلکا سا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے مگر اس کی پوری جھلک ہم ان کے خطوط میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ غالب کی زندگی میں جو رکھ رکھاؤ ہے جو حسن سلیقہ اور نفاست ہے وہی رکھ رکھاؤ حسن سلیقہ اور نفاست ان کے خطوط میں بھی ہے اور یہی ان کا فن ہے“

(ڈاکٹر شوکت سہروردی ”غالب خطوط کے آئینے میں“)

جب ہم غالب کے مزاج کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم ان کے مزاج کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر فدا و اس نکتہ پر متفق ہیں۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف کا درجہ دیا ہے۔ غالب کے اکثر اشعار کو ان کی جس مزاج کو دماغ میں رکھتے ہوئے پڑھیے تو ان میں چھپا ہوا مزاج سامنے آ جاتا ہے۔ بادی نظر میں یہی اشعار سنجیدہ محسوس ہوتے ہیں یہ چند اشعار دیکھیے جو ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے مقالے ”حیوان ظریف“ کے لیے چنے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور آنھ کے قدم میں نے پاساں کے لیے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می توان یافت کہ ایں بندہ خداوند عداشت

غنیچہ نو کلفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اب ان کے اخلاق و عادات سے متعلق بھی جانکاری ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کی شخصیت اس کے اخلاق و عادات کا بھی پر تو ہوتی ہے۔ جیسا کہ گذر چکا غالب کے اخلاق و عادات اور ان کی شخصیت کے باقی مظاہر ان کے خطوط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کے چند نظادان کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ آئیے دیکھیں:-

”مرزا کے اخلاق بہت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا تھا۔ بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دہلی

میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان کے ایک ایک لفظ سے مہر و محبت اور غم خواری و یگانگت چمکی پڑتی ہے۔“

(الطاف حسین حالی ”اخلاق و عادات“)

”سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایک بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یاد رکھنا چاہئے کہ بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمع نظر نہیں بلکہ انسانی اخلاق کا ایک نہایت بلند مقام ہے کسی آدمی کی شخصیت ٹاپنے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ اپنے ماحول یا اپنی قسمت کے خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یا ان سے سمجھوتہ کر کے خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔“

(اقبال سلمان ”اخلاقیات غالب“)

”غالب کی شخصیت و اہمیت کا تصور کرتے وقت ہم کو یہ باتیں نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں۔ غالب نے کسی حال میں سوا اپنے کسی اور کی آڑ نہ پکڑی اور اس آڑ پکڑنے میں وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہ پھرے۔ ہر طرح کی مشکلات کا تمام عمر سامنا رہا لیکن انہوں نے فریاد کی نہ بعادت۔ ہر مسامی کے چپے سے پھنے حال لیکن مسکراتے ہوئے نکلے۔ تو رانی خون گزما جاتا تو اپنے ناقدوں پر جی کھول کر برس بھی پڑتے۔ اردو شاعری

میں غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔

(رشید احمد صدیقی ”کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا“)

اگر پوچھا جائے کہ غالب کا پیغام کیا ہے۔ تو ان کے کلام کے مطالعہ سے کوئی ایسا پیغام نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی قوم یا اہل قوم یا اہل دنیا کو کوئی خاص پیغام دینا چاہتے تھے۔ نہ ہی کوئی ایسی علامت ہی ملتی ہے جیسے اقبال کے ہاں شاہین کی علامت ہے یا خوشحال کے ہاں مردِ تکمال کی علامت ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے اردو شاعری اور اردو نثر کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ آل احمد سرور بھی اس سے متفق ہیں:-

”غالب کی شاعری کا کوئی پیغام نہیں ہے جس طرح حالی یا اقبال کا پیام ہے۔ وہ میر کی طرح ایک بڑے اور گہرے رنگ کے مالک بھی نہیں ہیں ان کے یہاں ایک رنگارنگی اور اس رنگارنگی میں انفرادیت اور انوکھا پن ہے۔ یوں تو انہوں نے ہر صنفِ سخن میں داد و کمال دی اور حالی نے انہیں جامع حیثیات اور خسر و اور فیضی کی بساط کا آخری فرد قلم نہیں کہا ہے۔ مگر دراصل ان کی سب سے اچھی ترجمان غزل ہے۔ غزل گو شاعر کوئی پیام پیش نہیں کرتا۔ وہ بحر کی تہہ سے موتی چننے میں یا باغ میں کلیاں توڑنے ہی میں مصروف رہتا ہے“

(آل احمد سرور ”غالب کا ڈنڈا ارتقا“)

اب مرزا کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ ضعیف ہو گئے تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ اسکے قاری اور

اردو دیوان اور خطوط کا مجموعہ عود ہندی ان کی زندگی ہی میں چھپ چکے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ ہجر کے دن ظہر کے وقت غالب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دہلی میں دفن ہوئے۔ ۷۲ برس کی عمر پائی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم مقام حلقہ دام خیال ہے

جان دی ' دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
آخر میں غالب کے چند اشعار جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔
نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بندگی میں بھی وہ آزاد و خودمیں ہیں کہ ہم
لٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ نقشہ کہ برپا نہ ہوا

وہ مری جہنم جہیں سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب پہ بے ربطی عنوان سمجھا

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلا دو کہ ہم بتلائیں کیا

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
من کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازشیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

خوشحال وغالب کی تعلیم و تربیت اور علمیت

خوشحال خان خٹک

خوشحال نے پشتونوں کے خٹک قبیلے کے سردار شہباز خان کے ہاں آنکھ کھولی۔ ظاہر ہے ان دنوں جیسا کہ دستور تھا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے خوشحال کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ لیکن جیسا کہ ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے وہ مکتب کی تعلیم پر پورا دھیان نہ دے سکے۔

”میں پورے جہان کا علم سیکھ لیتا اگر مجھے شکار کی لت نہ پڑی ہوتی“

خوشحال کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد ملک شہباز خان خاص دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے جہاں مکتب کے علاوہ خوشحال کی تعلیم کے لیے گھر پر بھی انتظام کیا ہوا تھا وہاں تربیت کے سلسلہ میں زیادہ فکر مند رہے۔ ان حالات کے متعلق خوشحال کے کلام میں یہ شعر ملتا ہے:-

دہر ز ما پہ تربیت وو

تل بہ نسی ما سرہ شدت وو

ترجمہ:- ”میرے والد کو میری تربیت کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ اسی لیے وہ اس ضمن میں مجھ سے ہمیشہ سختی برتتے تھے۔“

بچپن میں خوشحال کا زیادہ تر وقت شکار اور سیر و تفریح میں گذرتا۔ کہتے ہیں کہ اسکے بعد خوشحال نے علم عمومی مطالعے اور ذاتی تجزیوں اور مشاہدوں سے حاصل کیا۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنی طبیعت کو عطا کی کہا ہے۔ یہ محض اپنی انکساری اور عاجزی کا اظہار تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خلک پشتو ژبہ پارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی فرماتے ہیں:-

”خوشحال نے اپنے دور کے مروجہ علوم پر بخوبی عبور حاصل کیا۔ عربی جانتا تھا۔ فارسی ادبیات کا اچھا عالم تھا۔ پشتو زبان میں سرآمد روزگار تھا اس سب کچھ کے باوجود وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ شکار کے شوق نے اسے علم حاصل کرنے نہ دیا۔ لیکن اصل صورت حال وہ تھی جو خوشحال بابا نے اپنے ایک قطعہ میں یوں بیان کی ہے:-

ترجمہ:- نظم ہو کہ بثر ہو یا خط

پشتو زبان پر میرا بے حساب حق ہے

نہ تو اس زبان میں مانسی میں کوئی کتاب تھی نہ ہی اس کا اپنا

کوئی رسم الخط۔ ہاں البتہ میں نے اب پشتو میں چند کتابیں تصنیف

کر ڈالی ہیں“

(ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خلک ”مقدمہ بدبہ خوشحال“)

بقول خوشحال: ”کارِ قلم اور کتاب کے ساتھ انکارِ شے آخر تک استوار رہا۔ قلم اور کتاب کے ساتھ تو یاری بڑھا پے میں بھی رہی:

ترجمہ:- ”میرا اگر کوئی یار ہے تو قلم ہے یا پھر کتاب لیکن بڑھا پے میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اب یہ یاری بھی ختم ہوئی۔“

حقیقت یہ ہے کہ خوشحال ایک عالم فاضل انسان تھے۔ انکا اسلامی علوم پر عبور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اولیس صدیقی ملتان کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ پروفیسر شاہ جہان خان کے مطابق خوشحال اپنے کلام میں اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

مولانا عبدالحکیم د دنیا و دین حکیم

یعنی ”مولانا عبدالحکیم جو دین اور دنیا کے حکیم تھے“ اسکے علاوہ اپنی کتاب دستارِ امہ کے تیسرے ہنر ”تحریر“ کو داخل کب کمال ہے کے ذیل میں حضرت شاہ اولیس صدیقی ملتان کے متعلق یوں کہا ہے ”نیک بخت شخص کبھی فن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عیث کام نہیں کرتا“ ہمارے استاد شاہ اولیس صدیقی ملتان بہت بزرگ اور مقدس شخصیت کے مالک تھے۔ وہ علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:-

مستوفد کتاب است و کمان است و قلم

دیگر ہمہ محنت و رنج است و الم

کہتے ہیں کہ خوشحال کے کلام میں صوفیانہ رنگ اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے

تشریف سے آیا جو جہانگیر اور شاہ جہان کے دور میں گزرے تھے۔ اور ۱۰۶۷ھ میں وفات پائے۔

خوشحال کی تعلیمی استعداد کے متعلق قاضی محمد وجیہ الدین یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال عالم تھا اور علم دوست بھی علماء کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اور اسی لئے علماء کے ساتھ محبت رکھتا تھا۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی اور دوسرے مروجہ علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان پر عبور کا یہ حال تھا کہ فارسی زبان میں بھی قابلِ قدر شاعری کی۔ اپنے کلام میں عربی الفاظ استعمال کرتا اور قرآن پاک کی تعلیمات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے دینی علوم حاصل کرنے کے لئے کافی جدوجہد کی تھی۔ اسی لئے اپنی اسلامی فقہ کی کتاب ”فضل نامہ“ میں اس نے فقہ اور دوسرے مذہبی مسائل پر بحث کی ہے خوشحال نے عربی کی مشہور کتاب ”حدایہ“ کا پشتو میں خوبصورت ترجمہ کیا ہے“

(قاضی محمد وجیہ الدین ”خوشحال مطالعہ ص ۷۷“)

خوشحال کا دیوان اس کی عظمت اور تربیت پر دال ہے خوشحال اپنے دیوان کے متعلق خود کہتے ہیں:-

ترجمہ:- اگر میرے دیوان کے ایک ایک شعر کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ جائے گی“

ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:-

ترجمہ:- ”میراد یوان علم کے خزانوں کا باغ ہے جس میں قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں“

”میں نے وزن ‘مضمون‘ نزاکت اور تشبیہ میں پشتو اشعار کو عین فارسی تک پہنچا دیا“

”پشتو شعر کو تازہ بہ تازہ مضمون کی بدولت میں نے شیراز اور زنجند کا ہم پلہ بنا دیا“

”جو زمانے کا فاضل ہوگا وہی سمجھ سکے گا کہ خوشحال خان خٹک کا یہ شعر کتنا دل نشیں ہے“

خوشحال نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے استادوں کو بڑی عزت سے یاد کیا ہے:-

ترجمہ:- ”مجھ پر بار بار میرے استاد کا احسان ہو کہ اس نے میرے ضمیر کو زنگ سے پاک کر دیا“

”یہ جو خوشحال کے دل کا طوطا بولنے لگا ہے (تو اس لیے کہ وہ) اپنے استاد کا آئینہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہے“

”ہر اس شخص کو اپنا استاد گردانو جو تجھے کچھ سمجھائے۔ اپنے سے عمر میں چھوٹے کو اپنا بڑا جانو اگر وہ تمہیں کوئی اچھی بات بتائے“

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علییت پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”خوشحال خان خٹک کو پشتون روایات اور پشتو ادبیات میں بلند رتبہ

حاصل ہے ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت

انسانی اور مظاہر کائنات کا صحیح علم و مشاہدہ اور تجربہ رکھتے تھے۔ انکے کلام میں بیک وقت قدیم 'روایات' کلاسیکی رجحانات اور جدید تقاضوں کا عکس نظر آتا ہے ان کے علم کی وسعت، فکر کی وقت اور فکر کی صحت کا ثبوت ہے۔

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی "پیش لفظ منتخبات خوشحال خان خٹک")

استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی مرحوم استاد شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علیست کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک کا کلام اسکی وسعت نظر، مطالعہ کائنات اور غیر محدود تجربات و جذبات پر شاہد و عادل ہے۔ رنگارنگی، تنوع، ہمہ گیری اور گہرائی دیکھ کر اس کے فطری شاعر اور باکمال صاحب فن ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے اس کے کلام میں زندگی اپنی پوری تابہاکی اور بولبولونی کے ساتھ دلفریب اور خوشنما جلوے دکھاتی نظر آتی ہے"

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی "منتخبات خوشحال خان خٹک")

پروفیسر پریشان خٹک اس موضوع پر یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک پر لاہور کی عظیم خدیجہ فیروز الدین نامی جس خاتون نے پہلی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس نے خوشحال کی

کتابوں کی تعداد ۳۵۰ بتائی ہے جبکہ مجھراورٹی نے یہ تعداد ۲۵۰ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اب صرف ۱۶ کتب دستیاب ہیں۔

جہاں تک خوشحال کی علیت کا تعلق ہے تو اوپر اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے مزید تفصیل کے لیے ہمیں جناب میاں سید رسول رسا کی کتاب مقدمہ ارمغان خوشحال کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ خوشحال کی تصانیف کے متعلق میاں صاحب فرماتے ہیں:

”خوشحال خان نظم و نثر کی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں چند ایک یہ ہیں: کلیات خوشحال خان، دستار نامہ (نثر)، فضل نامہ، باز نامہ، سوات نامہ (منظوم سفر نامہ) ہدایہ آئینہ فراق نامہ، اخلاق نامہ، فرہنامہ، نام حق، طب منظوم، زنجیری (پشتو شارٹ چینڈ) اور بیاض۔ خوشحال نے فارسی میں بھی غزلیں چھوڑی ہیں۔

آگے چلکر میاں صاحب کلیات خوشحال خان پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”خوشحال کی تمام تصانیف میں جتنی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں ان سب میں نظم میں خوشحال خان کی کلیات ایک اہم کتاب ہے۔ یہ اہمیت کے لحاظ سے نہ صرف نظم کی بائبل ہے بلکہ مضامین کے خورج، وسعت اور ہمہ گیریت میں پشتو کا شاہنامہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھے بغیر پشتون کی فطرت کی رنگ رنگ، گوں ناگوں اور قسما قسم حبیہ سادگی کی سمجھ آنا مشکل کام ہے۔ اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پشتون کو پہچاننے کے لیے خوشحال خان کی کلیات کا

مطالعہ ضروری ہے“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ ارغوان خوشحال“)

”نظم کی تکنیک کے نقطہ نگاہ سے خوشحال خان کی نکلیات پشتو ادب میں ایک یگانہ موتی ہے۔ اور انہیں بہت سی اصناف پائی جاتی ہیں مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ، مخمس، مسدس، معشر، ترکیب بند، مریح، مثنوی اور ترجیع بند وغیرہ جیسے کہ فارسی ادب کا بہترین سرمایہ فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ اسی طرح پشتو ادب میں ہر لحاظ سے بلند ادبی اور فنی شاہکار خوشحال خان کا دیوان ہے۔ اگر پشتو ادب کا پورا سرمایہ ایک طرف رکھیں اور نکلیات خوشحال خان دوسری طرف تو خوشحال خان کا دیوان پھر بھی بھاری نکلے گا“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ ارغوان خوشحال“)

سراولف کیرو اور ایلمن ہاول نے اپنی کتاب The Poems of Khushal Khan کhattak - 1963 میں صفحہ ۱۱ پر خوشحال کی عظمت پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

“ Khushal was no crude swash- buckler, but a gentleman, well educated after the fashion of his day with some knowlege of Arabic derived from the Study of the Koran and fine Vocabular of Arabic words. To hold his own at court as he

did, he must have been quite at home in
 person of the kind written and spoken in India
 and he Obviously had some knowledge of
 person literature. It is chiefly to him that his
 native tongue which he wielded with complete
 mastery owes its enrichment with loan words
 borrowed from these sources and they are to it
 as words from Greek Latin and Norman French
 are to English"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر خوشحال کی حسن پرستی پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے۔

"For beauty in all its forms whether of mountains
 trees flowers birds or women, he had ever an
 eye and for the beauties of nature more than eye
 an almost wordsworthian sense of interfusion
 which leads him to make the startling
 confession. "Da khulio da Jamal puh nendare
 kkhe mi khudai byamund" .

"In contemplation of perfection of beauties, I
 found God."

پشتون قوم کی خوش بختی ہے کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے خوشحال خان ٹٹک کی عظمت کا ذکر
 ان ذرین الفاظ میں کیا ہے۔

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس آں کہ بیند باز گوید بے ہراس
 آں حکیم ملت افغانیاں آں طیب علت افغانیاں
 راز قوسے دید و بے باکانہ گفت حرف حق باشوخی رعدانہ گفت

خوشحال نے اپنی طبیعت سے متعلق جو کچھ کہا وہ ان کے ان اشعار سے عیاں ہے:-

پہ درون کښې مې پراته دی ډېر گنجونه

په معنی کښې لکه کان د سیم و زریم

ترجمہ:- میرے باطن میں بڑے خزانے چھپے ہوئے ہیں (اس لئے) معنی کے لحاظ سے میں
 سیم و زر کی ایک کان ہوں۔

ما خوشحال څه دا اشعار ویلی نه دی

یو اسرار مې هویدا کړ له اشعاره

ترجمہ:- مجھے خوشحال نے صرف اشعار ہی نہیں کہے بلکہ ان کے ذریعے ایک اسرار کو ہویدا
 کیا ہے۔

دا رنگینې معنی چیرې دی خوشحال

چې را درومی لکه گل په بیاض ستا

ترجمہ:- اے خوشحال یہ رنگین معنی کہاں پر ملتے ہیں کہ تیری بیاض پر پھول بن کر اترتے
 ہیں۔

خوشحال خان کا یہ تاریخی قطعہ ان کی شخصیت اور طبیعت پر دال ہے:-

”پھر نہ مجھ جیسا عزت مند اور ننگ و نام کا متوالا پیدا ہوگا
 اور نہ مجھ جیسا جنگجو پیدا ہوگا
 ننگ (قبیلے) کا کیا ذکر تمام افغان قوم میں
 شاید ہی مجھ جیسا دانشمند پیدا ہو۔“

اسد اللہ خان غالب

ادھر مرزا غالب نے ایک ترکوں کے ایک مشہور خاندان میں آنکھ کھولی۔ باپ اور بعد میں چچا کی وفات کے بعد غالب کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ جہاں کا ماحول امیرانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گزرا۔ اس ضمن میں غالب نے خود کہا ہے کہ ”میں لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا“

باوجود اس سب کچھ کے غالب کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی انکو شیخ معظم اور نظیر اکبر آبادی جیسے استاد ملے۔ ملا عبد الصمد سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ غالب دو سال ملا عبد الصمد کے ساتھ رہے۔ چونکہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے اس لیے انکی تعلیمی استعداد خاصی تھی۔ وہ فارسی زبان بخوبی جانتے تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ تھا۔ عربی زبان میں بھی کچھ استعداد تھی۔ عربی میں صرف و نحو بھی اپنے استاد سے پڑھا۔ فلسفہ، تصوف، طب، منطق اور معانی و بیان سے دلچسپی رہی۔ فن عروض میں بھی پوری دستگاہ تھی۔

”غالب ایک نورانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسلاف کا گرم خون انہیں ورثے میں ملا تھا۔ آبا و اجداد کی امارت نے جسے وہ کہیں

سہ مری سے کہیں مرزبانی سے تعبیر کرتے ہیں ان کے دل میں
 اثنائیت کے جذبے کی تخلیق کی تھی۔ باپ اور چچا کی بے وقت موت
 کے باوجود ان کا بچپن نضیال میں بڑے اللے تلے کے ساتھ رنگ
 رلیوں میں بسر ہوا۔ تاہم جوانی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ علوم متداولہ کی
 تحصیل کر چکے تھے۔ جو ان دنوں شرفاء کے لیے ضروری سمجھی جاتی
 تھی۔ فارسی کی تکمیل کے علاوہ جس سے انہیں فطری لگاؤ تھا وہ منطق
 فلسفہ تاریخ طب اور نجوم میں تھوڑی بہت دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ عمر
 بھر شریعت کی قید سے آزاد رہے۔

(ڈاکٹر ناظم حسن زیدی "غالب اپنے اشعار کے آئینے میں")

اسکے علاوہ غالب نے بیدل، حزین، ظہوری، عرفی، نظیری اور میر کا مطالعہ بھی کیا۔ جس نے
 اسے دماغی وسعت بخشی۔ یہ جو بعض محقق غالب کو "کم پڑھا لکھا آدمی" ثابت کرنے کی
 کوشش کرتے ہیں ذیل کا اقتباس ان کے لیے ایک جواب کی حیثیت رکھتا ہے:-

"غالب کی ابتدائی تعلیم بالکل رسی ہو کر رہ جاتی اگر مثلاً عبدالصمد نے
 غالب کو کچھ راہیں نہ دکھائی ہوتیں ہر مزد جو اصلاً ایران کا زرتشتی تھا
 مسلمان ہو گیا اور غالب کی خوش قسمتی سے آگرہ پہنچ کر ان کا استاد
 بن گیا غالب نے اس سے فارسی زبان اور پارسی مذہب کے متعلق
 فیض اٹھانے کا تذکرہ بڑی محبت اور گہرے محو سے کیا ہے۔ غالب کا

ذاتی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مطالعہ میں مذہب، اخلاق، تصوف، طب، ہیئت، منطق اور قصص وغیرہ کی وہی کتابیں ہو سکتی تھیں جو عرب، ایران اور ہندوستان میں پانچ چھ سو سال سے رائج تھیں۔ یہ جو اکثر آج کے محققانہ معیار سے غالب کو ”کم پڑھا لکھا آدمی“ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتی ہے جب ہم غالب کو مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدرالدین آزرہ، حکیم احسن اللہ خان، نواب مصطفیٰ خان شیفہ، حکیم مومن خان اور صہبائی وغیرہ کی صحبتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہی اس عہد کے بڑے عالم اور دانشور تھے۔ غالب ان سے بہتر نہ کہی ان کے ہم محفل اور با عزت دوست ضرور تھے۔“

(احتمام حسین ”غالب کا فکر“)

اسکے علاوہ بیدل کے متبع کا زمانہ ختم ہوتے ہی مرزا نے اپنے بیان کی ندرت اور تخیل کی جدت کے لیے اپنا الگ طرز ایجاد کیا جو انہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا۔

جب ہم غالب کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم کر کے حیرانگی ہوتی ہے کہ اردو میں صرف ان کے دیوان اور خطوط کے مجموعے ہی موجود ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے اردو سے زیادہ فارسی میں شاعری کی اور نثر بھی لکھی۔ غالب کی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:-

دیوان غالب کے نسخے

اردو دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن غالب کی زندگی ہی میں چھپ گئے تھے۔ اور انکی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ بعض میں اشعار کی کل تعداد ۷۰۷۱ بعض میں ۱۱۱۱ کسی میں ۷۹۶ کسی میں ۱۸۰۲ اور بعض میں ۷۹۶ آتی تھی۔ اردو دیوان غالب کے مشہور نسخے یہ ہیں۔ نسخہ طاہر یہ نسخہ عرشی نسخہ سردار جعفری اور نسخہ مالک رام۔

خطوط غالب کے مجموعے :-

- (۱) محمود ہندی ۱۸۶۸ء
- (۲) اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء
- (۳) ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا احمد عسکری ۱۹۲۹ء
- (۴) مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی ۱۹۳۷ء
- (۵) نادر خطوط غالب مرتبہ محمد اسماعیل رسا ہمدانی ۱۹۳۹ء
- (۶) خطوط غالب مرتبہ مولوی مجیش پرشاد ۱۹۳۱ء
- (۷) نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق ۱۹۳۹ء
- (۸) خطوط غالب مرتبہ مالک رام ۱۹۶۲ء
- (۹) غالب کی نادر تحریریں مولوی ظلیق انجم ۱۹۶۲ء

تصانیف غالب فارسی

- (۱) پنج آہنگ (۲) مہر نیم روز (امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات)
- (۳) قاطع برہان (۴) دہلیؤ نند کے حالات
- (۵) کلیات نثر غالب (۶) آہنگ پنجم (فارسی مکاتیب)
- (۷) کلیات غالب (فارسی نظم کے دس ہزار اشعار)
- (۸) سہد چمن (نایاب فارسی کلام (۹) مفرقات غالب
- (۱۰) ماثر غالب - ۳۲ فارسی خطوط

غالب کی طبیعت مسلم ہے۔ انکے کلام میں ارتقائے خیال کے ساتھ بڑی شاعرانہ معنائیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اور استعاروں کی مدد سے بڑی معنی آفرینی کی گئی ہے غالب کے ہاں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی مرثیہ فوجہ اور سہرہ بھی لکھتے تھے۔ فارسی کی طرح ان کے اردو کلام کا مجموعہ بھی ضخیم تھا۔ احباب کے مشورے سے انتخاب ہو کر شائع ہوا۔ وہی اب تک تہرک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ طاہر نمبرہ آزاد دہلوی مرتب نسخہ طاہر یہ غالب کی شخصیت اور شاعری کا مقام یوں متعین کرتے ہیں:-

”بچپن اور لڑکپن اکبر آباد میں گزرا۔ جوانی میں بسلسلہ مناکحت دہلی چلے آئے پھر ساری عمر یہی رہے۔ مبداء فیاض نے ذوق سلیم عطا کیا۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی و سرمدی تھی۔ ذوق خداداد اور تربیت استاد نے کلام کو سدا بہار کر دیا۔ پچاس سال تک محو سخن گزاری

رہے۔ تصوف اور منطقی مسائل کو عجیب سوز و سہا سے ادا کیا ہے۔
 فارسی میں آسمان کے تارے تو ذکر لاتے ہیں۔ انہی سے اردو نظم میں
 بھی قلم لگائے ہیں۔ نثر میں بھی دریا بہائے ہیں۔“

پروفیسر یوسف زاہد غالب کے شاعرانہ لب و لہجہ کی کامیابی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-
 ”ان (غالب) کی شخصیت اور مزاج کے بعض انفرادی اور شخصی پہلو بھی
 ہیں جنہوں نے ان کی شاعری کے لب و لہجہ کو متعین کرنے میں بہت کام
 کیا۔۔۔۔۔ غالب چونکہ فطری طور پر جدت پسند واقع ہوئے تھے اور
 کسی قسم کی تقلید، رسم و رواج کی پرستش اور ظاہر داری کو برداشت نہ کرتے
 تھے۔ اسی لئے انہوں نے تمام تقلیدی راستوں بے معنی پابندیوں اور غلام
 قسم کی ظاہر داریوں کو رد کر دیا۔ اپنے لیے ذاتی غور و غوص اور شخصی فکر سے
 نئی راہیں تلاش کیں۔ ذاتی تجربات سے نئی اقدار کا کھوج لگایا جو رائج
 الوقت، نوال، آمادہ اقدار سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی بنا پر زندگی کے ہر
 شعبے میں ان کی مخالفت ہوئی۔ شعرو فن، علم و ادب اور لغت نویسی میں بھی
 لوگوں کو سہم نہ مانتے تھے۔ وہ تمام مخالفتوں کا اکیلے مقابلہ کرتے رہے اور
 کسی سے دبے نہیں۔ انہیں اپنے علم پر اتنا یقین تھا کہ بغیر غور و تحقیق اور
 عقل و دہان سے پرکھنے کے وہ کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تھے“

(پروفیسر یوسف زاہد، ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

غالب کے ہاں یہاں وہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ہمارے اپنے زمانے کے لگتے ہیں۔
انکی عظمت، قاورانگاہی اور اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہونے کی خصوصیت نے ان سے
ایسے اشعار کہلوائے:-

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ' اشارت کیا ' اور کیا

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

کسی بھی دوسرے شاعر کی طرح غالب نے بھی اپنی عظمت کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔
' تجنیۃ ' معنی کا ظلم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

”غالب کی عظمت اور زبان پر گرفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ رمزِ بلخ کا استعمال بھی بخوبی کرتے تھے۔ غالب کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت جو اس کے اور سترھویں صدی کے انگریز شاعر ڈون (Donne) کے یہاں مشترک ہے رمزِ بلخ (Conciets) کا استعمال ہے۔ یعنی ایسی دو اشیاء کے درمیان مشابہت و مماثلت قائم اور ظاہر کی جائے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بے ربط اور دور ہوں لیکن جن میں غور کرنے پر ایک گہری اندرونی وابستگی متعین کی جاسکے۔“

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر“

(اسلوب احمد انصاری) ”غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر“

گو غالب نے اپنے بڑھاپے میں کم کم شعر کہے۔ مگر کہتے ہیں کہ آج وہ محض اپنے اسی عہد کے کلام کی بدولت زندہ اور جاوداں ہے۔ شیلے نے کیا خوب کہا ہے:-

”Our Sweetest Songs are those that tell of saddest thought, our

singerest Laughter with some pain is fraught"

غالب کو زمانے کی بے قدری کا شکوہ رہا۔ مگر جاتے جاتے بھی یقین تھا کہ ان کی شہرت اور عظمت دنیا پر ظاہر ہو کر رہے گی۔

۔ شہرت شعرم بہ کتنی بعد من خواہد شدن

موازنہ

خوشحال وغالب کی ابتدائی تعلیم اور علمیت کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بچپن میں علم حاصل کرنے کے مواقع تو ملے مگر انہوں نے اپنی اپنی جودت طبع اور حالات کے مطابق اتنا کچھ حاصل نہ کیا جو انہیں حاصل کرنا چاہیے تھا گو کہ غالب کو علم حاصل کرنے کے مواقع نسبتاً زیادہ ملے۔ اگر خوشحال کو مولانا عبدالکلیم سیالکوٹی اور شاہ اولیس صدیقی ملتانی جیسے جید استاد نصیب ہوئے تو غالب کو ملا عبدالصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم و فاضل استاد ملا۔ بہر حال ان دونوں کی شاعری اور نثر کا معیار انکی ابتدائی تعلیم اور بعد میں زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والی آگہی سے کئی اونچا ہے جس کی وجہ انکی خداواد صلاحیتوں اور الہام الہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ:-

”نشأۃ الثانیہ (Renaissance) کے شاعر بھی شاعری کو عطیہ وہی

سمجھتے تھے۔ پنسر (Spencer) کے بقول ”شاعری ایک عطیہ الہی

ہے جو مشقت اور مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہاں ان دونوں سے

”سنوارا جاتا ہے“ مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہر برٹ ریڈ

(Herbertreed) نے بھی اپنی تنقیدی کتاب ورڈز ور تھ (Words

Worth) میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں اور شاعری کو

الہامی کیفیت ”کہا ہے“

(۱۔ اسماعیل حسن خان ”غالب کا نظریہ شعر“)

دونوں نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی یعنی خوشحال نے اپنی مادری زبان پشتو میں شاعری زیادہ کی (چالیس ہزار اشعار چھوڑے ہیں) جبکہ پشتو نثر میں انکی ایک ہی تصنیف (دستارنامہ) ملتی ہے۔ فارسی میں خوشحال نے پچیس غزلیں کہیں جو ۱۳۵۰ اشعار پر مشتمل ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ”اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقدین تائید کرتے ہیں“ خوشحال نے بعض غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جن میں فارسی اور پشتو زبان کے الفاظ شعر کے دوسرے مصرعے میں اکٹھے استعمال کئے ہیں۔ جس سے ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے۔ یا جن میں ایک مصرع فارسی کا تو دوسرا پشتو کا ہے۔ غالب نے اردو میں تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل دیوان چھوڑا ہے جسے وہ ”بے رنگ من است“ کہتے تھے۔ اردو ہی میں خطوط لکھے جو اردو ادب پر ایسے مثبت ہوئے کہ انکسبر من القس ہو گئے ہیں۔

فارسی میں غالب نے زیادہ لکھا جس میں نظم (دس ہزار اشعار) اور نثر کی تحریریں شامل ہیں۔ اس موازنہ کا آخری نکتہ یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں خوشحال نے غیر مادری زبان فارسی

کو ٹھکرا کر اپنی مادری زبان پشتو میں اپنا مافی الضمیر سمجھایا اور کامیاب رہا وہاں غالب نے فارسی میں جو کچھ لکھا اس پر بہت فخر کرتے تھے۔ لیکن انہیں شہرت دوام انھارہ سوا شعار پر مشتمل اردو دیوان (جسے وہ اپنی فارسی شاعری سے کم تر سمجھتے تھے) اور اردو نثر (مکتوبات نگاری) سے ملی۔

خوشحال و غالب

مذہب و مسالک

جہاں تک خوشحال و غالب کے مذہب و مسالک کا سوال ہے تو دونوں خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور ختم نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ دونوں خلفائے راشدین و صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسول سے نہایت درجہ کی عقیدت رکھتے تھے۔

خوشحال خان خٹک

خوشحال خان مذہبی عقیدہ میں بچے مسلمان تھے اور اہل سنت و الجماعت میں خفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مذہبی قصیدہ میں اپنے مذہبی عقائد کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

”میں پشت بہ پشت ایک محمدی مسلمان ہوتا آیا ہوں۔ چاروں
یاران نبی (خلفائے راشدین) کو ماننا ہوں۔ اور اسکو بھی صحیح جانتا
ہوں کہ چار مذاہب یعنی خفی، مالکی، شافعی اور حنبلی ہیں۔ ان میں سے
میں خفی مذہب کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ اللہ نے میرے دل میں علماء کے
لئے بہت زیادہ عزت رکھی ہے مگر موجودہ دور کے شیوخ کے لیے کچھ
کم۔ نہ میں خراباقتی ہوں نہ قمار باز اور نہ زنا کار۔ نہ ہی میں قاضی یا

مشتی ہوں جن کی نظریں چند درہم پر رہتی ہیں۔“

خوشحال کے چند دوسرے اشعار سے بھی انکے مذہبی عقیدے پر روشنی پڑتی ہے:-

”میں نے محمدؐ کے عرفان سے اللہ کا عرفان پایا

محمدؐ پاک ہیں اور انکے سبحان (اللہ) بھی پاک ہیں۔“

”اگر اللہ کو پہچانا چاہتے ہو

تو محمدؐ اور علیؑ کی پیروی کرو۔“

”جو لوگ ابو بکرؓ و عمرؓ کو بُرا بھلا کہتے ہیں

اگر وہ منہ سے کلمہ طیبہ کہتے بھی ہوں تب بھی کافر ہیں۔“

خوشحال خان کی نظر میں خلفائے اربعہ کی قدر عزت اور احترام کرنا ہر مسلمان کے مذہبی

عقائد کا جزو لاینفک ہونا چاہئے۔ اور جو ایسا نہ کرے اسکی مسلمانی میں غلط ہے۔ رافضی اور

خارجی کے لئے فرمایا:- ”دونوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک کی آنکھیں سبز میں پروئی

جائیں اور دوسرے کا کلیجہ۔“

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ خوشحال خان کو اہل بیت رسولؐ خصوصاً

حضرت علیؑ سے خاص رغبت تھی۔ سنی عقیدے کے چاروں آئمہ کے علاوہ وہ اشاعری

عقیدہ کے بارہ اماموں کو بھی ہدایت اور احترام کا مستحق جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوات

کے سفر کے دوران حضرت اخوند درویشؒ کے خلیفہ خاص شیخ میاں نور نے خوشحال خان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا تھا۔ مگر خوشحال خان نے اپنی کتاب سوات نامہ میں بیابانگ دھل اس الزام کو جھٹلایا۔ اور اس کے جواب میں یہی کہا کہ میں سنی العقیدہ خفی ہوں۔ حضرت محمدؐ کو آخری نبی جانتا ہوں۔ چہار یاران نبیؑ (خلیفہ راشدین) کو حق جانتا ہوں۔ اہل بیت رسولؐ سے حد درجہ محبت رکھتا ہوں۔ حضرت علیؑ کے ساتھ خاص رغبت ہے۔ خوشحال کے مسلک کو اس کے اپنے ایک شعر میں یوں سمویا گیا ہے۔

”میں پاکیزہ سنی مذہب ہوں اور کچھ نہیں ہوں

جو مجھے کچھ اور سمجھتا ہو تو اس کے سر میں خاک“

غالب

ادھر مرزا غالب کے شیعہ یا سنی ہونے سے متعلق کافی چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے دو قصائد حضرت علیؑ کی تعریف میں لکھے۔ ان قصائد منقبت میں سے ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو:-

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار

سایہ لالہ بے داغ سویدائے بہار

و ہر جز جلوہ یکمائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

سید قد رت نقوی اپنے مضمون ”غالب کون ہے؟“ میں غالب کے عقیدہ سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

”اس کے علاوہ غزلیات میں تیرہ شعر جناب امیر کی شان میں ہیں۔ جن میں گیارہ شعر معروف یا خطابی ہیں اور دو شعر اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں“

امام ظاہر و باطن ”امیر صورت و معنی

علی ولی“ اسد اللہ ”جانشین نبی ہے

غالب ہے رتبہ“ فہم و تصور سے کچھ پرے

ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

ایک جگہ مرزا غالب اپنے عقیدے کو امین الدین خان کے نام ایک خط میں نقل کر یوں بیان کرتے ہیں:-

”میں موصد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا

ہوں اور دل میں الا اللہ لا سوتر فی الوجود الا اللہ کہے ہوئے ہوں۔

انبیاء سب واجب تعظیم اور اپنے اپنے وقت میں منفرض الطاعت

تھے۔ محمد پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں۔

مقطع نبوت کا مطلق امامت اور امامت نہایت جماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ۔ ثم حسینؑ اسی طرح مہدی موعودؑ "بریں زیستہ ہم بریں بگذرم" ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔ کمر بچھ کر دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا اور دوزخ کی آہٹ کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین و منکرین نبوت مصطفویٰ و امامت مرتضویٰ اس میں چلیں۔"

(خطوط غالب صفحہ ۸۰)

دوسری طرف مولانا حالی کو انکے مذہبی عقیدے سے متعلق تحقیق کے سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ اور "یادگار غالب" میں ان کی تحریر کو حرف آخر مان لیا گیا ہے۔ لیکن سید قدرت نفوی کو حالی پر بھی اعتراض ہے کہ ان سے بھی بعض مقامات پر سہوا ہے۔ حالی کی بیان کردہ باتوں کا اعادہ مولانا مہر اور شیخ محمد کرام نے اپنی اپنی تصانیف "غالب" اور "آثار غالب" میں کیا ہے۔ بعد میں مولانا نیاز فتح پوری بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔ ان اور کچھ دوسرے اصحاب کے نظریات کے مطابق غالب کے مذہبی عقیدے کی تصویر کچھ یوں ابھرتی ہے:-

(۱) "اگرچہ مرزا کا اصلی مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان

طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور جناب امیر کوہ رسول خدا کے بعد

تمام امت سے افضل جانتے تھے“

(حالی۔ یادگار غالب، ص ۹۵)

(۲) ”سید صدر سلطان نبیرہ محمود خاں نے نواب ضیاء الدین مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ کے موافق ان کی تجویز و تکلیفیں کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا“

(حالی۔ یادگار غالب، ص ۱۲۳)

(۳) ”غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں تھی اور بلاشبہ ان کا میلان طبع تشیع کی طرف تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شیعیت تفصیل تک محدود تھی“

(مولانا غلام رسول مہر ”غالب“ ص ۳۸۲)

(۴) ”غالب یوں چاہے رند بادہ خوار رہا ہو یا کچھ اور لیکن اپنے عقائد کے لحاظ سے ہمیشہ غالی شیعہ تھا“

(مولانا نیاز فتح پوری)

(۵) ”مرزا عقائد میں شیعہ تھے اور شیعہ بھی سخت قسم کے۔ حضرت

علیٰ کی ذات و صفات کے متعلق انہیں خلوت تھا۔“

(شیخ اکرام الحق، شعر العجم فی الہند، ص ۲۹۰)

(۶) ”عقیدے کی رو سے مرزا اثنا عشری تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ ”وحدانیت خدا اور نبوت قسم الانبیاء“ کے بہ دل متحہد اور بڑپان معترف تھے۔ لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قبا ان کے بدن پر پوری طرح چھتی نہ تھی۔“

(شیخ محمد اکرام آثار غالب ص ۲۲۲)

(۷) ”پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ (غالب) خدا کی وحدانیت پر یقین کامل رکھتے اور نجات کے لیے نبوت پر ایمان کو لازم سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامت مرتضوی کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور امامت من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تفضیلی اثنا عشری شیعہ تھے۔“

(مالک رام ”ذکر غالب“ ص ۶۲۲)

(۸) ”ایک عرصہ ہوا جب یہ ٹائی شاعر (غالب) زیور اسلام اتار کر لیو فری ماسن (Free Masson) سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب کو اختیار کرنے کا اور کیفیت فری

میں ہاؤس کی دھوکہ دیکر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔

(بال گوہند "ذخیرہ" آگرہ مارچ ۱۸۶۹ء)

ماخوذ از "آجکل" دہلی ۱۵ فروری ۱۹۳۷ء

(ذکر غالب و احوال غالب)

ان انتہاسات سے یہ کھلا کہ سب نے غالب کو شیعہ عقیدے کی طرف زیادہ جھکا ہوا پایا پر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ وہ تفضیلی شیعہ تھے۔ اور حضرت علیؑ کے بارے میں ان کو غلو تھا۔ دوسری بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ غالب کا مذہب "صلح کل تھا" انکے دوستوں میں شیعہ سنی اور ہندو سب پائے جاتے تھے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ غالب کی تدفین سنی عقیدے کے مطابق کی گئی۔ اور یہ جو آخری حیران کن بات بال گوہند نے غالب کی فری مین بننے سے متعلق کی ہے اور ساتھ میں اس عمل کو زیور اسلام اتارنے سے تعبیر کیا ہے۔ بالکل بے بنیاد گفتی ہے۔ کیونکہ بقول سید قدرت نقوی فری مین بننے کے لئے ترک مذہب لازمی شرط نہیں ہے۔

لیکن آخر میں میں اپنی تحقیق کے مطابق قارئین کی خدمت میں غالب کی دو ایسی رباعیات پیش کرنا چاہتا ہوں جو "انتخاب اردو کلیات غالب" از شمس الرحمن فاروقی ساہتہ اکادمی نئی دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۹۳ء کے آخری صفحہ ۱۲ پر موجود ہیں۔ یہ رباعیات پڑھنے کے بعد قارئین کرام غالب کے مذہبی عقیدے کے متعلق خود کو کوئی فیصلہ کریں۔ میں سمجھتا

ہوں کہ غالب کی صرف یہ دور باعیات جناب قدرت نقوی کے مضمون ”غالب کون ہے“ کا مؤثر جواب ہو سکتی ہیں:-

رباعیات

(۲۵۲)

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو دے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماورائہنری

(نومبر ۱۸۵۰ء)

(۲۵۳)

یارانِ نبی سے رکھ تو لا باللہ
ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم انکے دشمن !
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

(نومبر ۱۸۵۰ء)

خوشحال و غالب

مے پرستی

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ مے نوش اور پاک باز۔ ایک مے نوش شاعر کے لئے رندانہ کلام لکھنا ایک معمول ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک پاک باز شاعر صبحی اور لال پری کا ذکر اپنے اشعار میں کرے تو یہ ایک غیر معمولی واقعہ شمار کیا جائے گا۔ مگر ایسے شاعر کو داد و پزنی پڑتی ہے کہ صرف اپنے مطالعہ (کسی قدر مشاہدہ) اور ذہانت و پرواز تخیل کے زور پر میخانے اور مے خواروں کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہی حادثہ خوشحال و غالب کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جہاں غالب مے نوشی کر کے رندانہ کلام لکھتے تھے۔ وہاں خوشحال مے کا ایک قطرہ بھی لبوں پر رکھے بغیر رندانہ اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر سرمستانہ کلام چھوڑ گئے ہیں۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کی مے پرستی

غالب کی پرورش انصیاں میں ہوئی۔ ان کی انصیاں خاصی غارغ البال تھیں۔ اسلئے انکو ایک امیرانہ ماحول ملا۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گذرا۔ اس زمانے کے بارے میں غالب خود کہتے ہیں کہ میں ”اہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و

فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔“ آگے چل کر زندگی بھر اس ماحول کا اثر غالب کی زندگی پر رہا:-

”یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب کی قیمتی کو بھی اس میں دخل تھا۔ بہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے۔ بے فکری، شراب نوشی، یار باشی، عیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں“

(احوال و نقد غالب)

آگے چل کر شراب پینے کی عادت ان کی زندگی کے ساتھ ایک عادت کے طور پر سامنے آئی۔ اور آخر تک ساتھ رہی:-

”مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی ہیں اس کی کنگھی داروغہ کے پاس رہتی تھی۔ اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنگھی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنگھی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانجھ میں

داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کبھی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں کم پیتے تھے دوسرے اس میں وہ دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:-

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوشی دوست
آستخکن بہ بادہ صافی گلاب را

(الطاف حسین حالی "اخلاق و عادات")

اپنے نبی اور خاندانی ماحول کے باعث غالب میں انانیت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس انانیت نے انہیں زندگی میں قدم قدم پر نقصان پہنچایا۔ اور وہ غم روزگار کے ہاتھوں تالاں رہنے لگے۔ انہوں نے اپنی عالی ہمتی سے ہر غم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ساتھ کے ساتھ خدا سے اس امر کی شکایت اس انداز میں کرتے گویا قصور قدرت ہی کا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

"غم پھر غم ہے۔ غالب نے اس لاعلاج مرض (غم روزگار) کا کافی

مقابلہ کیا مگر جب دیکھا کہ مفر محال ہے تو غم ہستی سے بچنے کے لیے

مئے ناب کے دامن میں پناہ لی۔ ان کی زندگی میں گریز کی بس یہی

ایک مثال ہے۔ یہ شراب نوشی کی عادت آخروم تک باقی رہی۔ نہ جانے اس سے ان کی فرض نشاط تھی یا آتش سیال کو محض غم لعل کرنے کا سامان سمجھتے تھے مگر وہ اس مشروب کے بے طرح عادی ہو گئے تھے۔ اور اسے ضروریات زندگی میں سے سمجھتے تھے:-

جاں فزاء ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

(ڈاکٹر ناظر حسن زیدی۔ ”غالب اپنے اشعار کے آئینے میں“)
گو کہ غالب اپنی اس عادت اور فعل پر سخت نادم تھے اور اسے کبھی نہ چھپایا، لیکن شراب کے متعلق طرافت آمیز باتیں بڑا لطف اور مزالے کر کرتے تھے۔ دو ایک واقعات اس ضمن میں کافی مشہور ہیں۔ مولانا حالی کے مطابق ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خور کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا ”بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے دعا مانگے“ اپنے خلوط میں بھی غالب نے اپنی شراب نوشی کا حال لکھا ہے۔ میر مہدی کے نام ایک خط میں کیا زبردست نقشہ کھینچا ہے:-

”میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے آٹھ ٹھسی سامنے رکھی ہوئی ہے۔۔۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تو وجد ہم پہنچایا“

ایک اور خط میں امین الدین خان کو لکھتے ہیں:-

”ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور
اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جانا
مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آگ کو
تیز کر دوں گا“

(خلوط غالب صفحہ ۸۰)

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مطابق غالب کی رندانہ شاعری میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری
ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے اسی طرح شعر کی نزاکت اور
باریکی اور ارجا گر ہو جاتی ہے اور ذوق لطف اندوز ہوتا ہے:

قرض کی پیتے تھے سے لیکن بجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

داعظ نہ تم بیچ نہ کسی کو پلا کو

کیا بات ہے تمہاری شراب ظہور کی

غالب کے صوفیانہ کلام کو دیکھ کر یہ سوال اٹھایا گیا کہ وہ رند ہوتے ہوئے صوفی نہیں ہو سکتے
شہناز ہاشمی نے اپنے مضمون ”کیا غالب کا کلام الہامی ہے؟“ میں اس نکتے پر سیر حاصل
بحث کی ہے اور غالب ہی کے رندانہ اشعار کی روشنی میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ غالب

صوفی شاعر نہیں ہو سکتا:-

ہر چہ ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
فجی نہیں ہے بادہ و سانر کے بغیر

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام و مشک و یو کیا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیائی

مرزا کے کلام میں شراب، شراب نوشی اور اسکے اثرات کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ آئیے چند ایک
ایسے اشعار کا لطف اٹھائیں:-

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

موج گل ڈھونڈ بہ غلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے کوشۂ میخانہ میں مگر تو دستار

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاء کو
اگ کو نہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

جب میکدہ چھنا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ' مدرسہ ہو ' کوئی خانقاہ ہو

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھینٹریں گے رکھ کر نذر مستی ایکدن

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل ' موج شفق ' موج صبا موج شراب

زمر ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامہٴ احرام بہت ہے

گویا مرزا نے ہر زمان و مکان کے زاویہٴ نگاہ سے شراب کی بوتل کو گھما کر پیش کیا ہے۔ ایک جگہ بڑا اچھوتا خیال قلمبند کیا ہے۔ گویا قلم پر بھی شراب اثر انداز ہو سکتی ہے۔ آئیے اسی پر اس مضمون کا اختتام کرتے ہیں:-

مے کش مضمون کو حسن ربا خط کیا چاہیے
نغز رش رفتار خامہٴ نئی تحریر ہے

خوشحال اور مے پرستی

خوشحال نے اپنے قبیلے کے سردار اور مغلیہ شہنشاہ جہانگیر کے ایک اہم عہدیدار کے ہاں آنکھ کھولی تھی۔ انہیں بچپن میں ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں۔ پشتون کلچر اور اپنے گھرانے کے مذہبی ماحول کی بدولت وہ لہو و لعب شراب نوشی اور دوسری معاشرتی خرابیوں سے بچے رہے۔ ہاں اس دور کے خوانین کی طرح خوشحال کو بھی بچپن سے شکار کا شوق تھا جو آخر تک انکے ساتھ رہا۔

خوشحال خان کے اخلاق و عادات پر خوشحالیات کے ماہر میاں سید رسول رسانی مریوط تبصرہ کیا ہے:-

”خوشحال خان اونچے اخلاق کے پشتون سردار تھے۔۔۔ اس وقت کے پشتون خوانین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔ باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔ گھوڑے، بازار اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔۔۔ خوشحال خان پیدائشی شاعر، عاشق مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور اوباش نہیں تھے خود فرماتے ہیں:-

نہ خرابائی ، نہ قمار باز ، نہ زنا کاریم
 نہ قاضی ، مفتی چھٹی نظر پہ خود درمہ
 ترجمہ:- میں نہ تو خرابا ہوں نہ قمار باز ہوں اور نہ زنا کار ہوں اور
 نہ ہی قاضی اور مفتی ہوں۔ جنگی نظریں چند درہموں پر لگی رہتی ہیں۔“

(میاں سید رسول رسا، مقدمہ دارمغان خوشحال)

اس صورت حال میں یہ دیکھنا ہو گا کہ خوشحال نے مے نوشی کے بغیر جو اعلیٰ درجے کی رندانہ
 شاعری کی ہے کیسے ممکن ہوئی۔ غور کرنے پر اس کی دو توجیحات نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ
 انہوں نے فارسی ادب اور خاص طور پر فارسی شعراء و شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی
 وجہ سے نہ صرف یہ کہ پشتو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چڑھا بلکہ فارسی شاعری سے مے
 اور مے کشی کے رنگارنگ خیالات بھی خوشحال کے مشام جان ہو گئے جو بعد میں اگلے اپنے
 کلام کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

چھٹی نہ مٹی نہ معشوقہ نہ گشت دگلو

دغہ عمر دے دغم او غرامت

ترجمہ:- جب نہ شراب نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں کی سیر ہو۔ تو یہی غم اور تادان کی عمر
 ہے۔

دگلو نو پہ موسم گنہی خوار ہغہ دے

چھٹی نہ پیالہ پہ لاس نہ ٹہی نگلو شتہ

ترجمہ:- موسم گل میں خوار و بی شخص ہے جس کے ہاتھ میں نہ تو پیالہ ہے اور نہ ہی اسکا معشوق موجود ہے۔

خوشحال کی رندانہ شاعری کی دوسری وجہ انکی مجازی اور صوفیانہ شاعری میں بے ست نظر آتی ہے۔ اگر انکے رندانہ اشعار میں سے چند ایک کو اس زاویہء نگاہ سے پڑھا جائے تو یہ بڑی حد تک انکی مجازی شاعری کا حصہ معلوم دیں گے:-

ساقی راشہ د کھی د کھی پیالی راکرہ

چھی د میو پہ مستی کنھی شم سرشار

ترجمہ:- اے ساقی مجھے شراب سے بھرے ہوئے پیالے دے۔ تاکہ میں کی مستی میں سرشار ہو جاؤں۔

ایک اور شعر کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اصلی معنوں میں میں خود شراب ہوں اور خود ہی ساقی۔

ہیں کوئی شراب کے طلبگار جنہیں میں مدہوش کر دوں۔

بہر حال! ہم خوشحال کی رندانہ شاعری کو ظاہری آنکھ سے دیکھیں یا مجازی زاویہء نگاہ سے پرکھیں۔ ان میں خوشحال ایک ایسے رند کی صورت میں بھی ابھرتا ہے جو اعلانیہ سے نوشی کرتا پھرتا ہے اور شراب نہ پینے پر واعظ، محتسب، ظالم اور عابد کو خوب خوب لٹاڑتا ہے۔

مست یم مے پرست یم رندی کر مہ کر مہ کر مہ

واورہ محتسبہ بسادہ خور مہ خور مہ خور مہ

ترجمہ:- میں مست ہوں سے پرست ہوں، شراب نوشی کرتا ہوں، کرتا ہوں، کرتا ہوں
اے محسب سن رکھ کہ میں شراب پیتا ہوں، پیتا ہوں، پیتا ہوں۔

لہ ازلہ نہی رند رند، زاہد زاہد کرو
زہ بہ دکھی پیالی اخلم نہ تسبیح کرہ
ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کو رند اور زاہد کو زاہد بتایا ہے۔
اسلئے میں تو شراب سے بھرے جام پیتا ہوں اور تو تسبیح پھیر۔

شیخ دی مونخ روڑہ کا زہ بہ دکھی پیالی اخلم
ہر سرے پیدا دے خپل خپل کار لہر کنہ
ترجمہ:- شیخ نماز اور روزے میں مشغول رہے میں تو شراب کے بھرے جام انڈیو لگا۔
کیونکہ ہر شخص اپنے اپنے کام لے لیے پیدا کیا گیا ہے۔
خوشحال کی رندانہ شاعری میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے:

زہ خو شرابی یم شیخہ خنہ راسرہ جنگ کھری
برخی لڑلی دی کاش کہ ما د خان بہ رنگ کھری
ترجمہ:- اے شیخ تو مجھ شرابی کے ساتھ کیوں لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ یہ سب تو قدرت کا نظام
ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے۔ اے کاش کہ تو مجھے اپنے جیسا بنالے۔

د ساقی د میو ہسی شان اثر و
بہ خمار کنہی می دستار د سرہ خپور شو

ترجمہ:- ساقی کی شراب کا کچھ ایسا اثر تھا۔ کہ غبار کی وجہ سے میرے سر سے دستار گر کر بکھر گئی۔

ذکر فکر مونیخ روزہ طاعت و لہرہ بویہ
شیخ، ملا، زاہد، عابد، صوفی پہ میو خٹہ زدہ
ترجمہ:- ذکر، فکر، نماز، روزہ اور اطاعت ہی ان کا کام ہے۔ شیخ، ملا، زاہد، عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

محاسب چپی پہ احداد وود مستانو
دندانو سرہ گنہناست بادہ خورشو
ترجمہ:- جتنے پہ، انوں کا دشمن تھا۔ وہ رندوں کی محبت میں رہ کرے خوار بن گیا۔
گو مو شونلو چپی درود او تسبیحات وے
راشہ او گورہ د میو د مینا شو
ترجمہ:- جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے آؤ دیکھو کہ وہ ے و مینا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

جیسا کہ کہہ آئے ہیں خوشحال بابا کی رندانہ شاعری پر فارسی رندانہ شاعری کا اثر ظاہر و باہر ہے۔ ان کے بعض اشعار کو ہم عمر خیام اور حافظ شیرازی کے اشعار کے سامنے بخوبی رکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی چند ایک اشعار کے ترجمے ملاحظہ کریں:-
ترجمہ:- بلبلوں کی آواز میں یہی خبر ہے کہ ے نوشی کرو۔

یہ پھول ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

ترجمہ:- اگر دیکھو تو یہ بھی قلم ہے کہ بہار

ے کے بغیر گزر جائے

ترجمہ:- بہار کے موسم میں کیسے ے سے توبہ کر لوں

جبکہ معنی کا سرود و نو شا فوش میں ہے

عمر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"With a Loaf of Bread Beneath the Bough, A Flash of Wine, A
Book of verse and thou."

خوشحال کا ایک شعر ہے:-

مے شتہ ، چنگ وے شتہ د خپل یار سرہ خوش حالہ

خپل بیاض پہ لاس کنبی خاکلزار لہر کنہ

ترجمہ:- شراب ہے، رباب ہے، بانسری ہے۔ اے خوشحال! ایسے میں تو اپنے محبوب کو ساتھ

لئے اپنی بیاض کو نفل میں دبائے چمن کا رخ کر۔

خوشحال کے اسی شعر کا مسٹر ایولن ہاول نے انگریزی میں یوں ترجمہ کیا ہے:-

"Garden Season, Moment Wine, Music verses all Combine,
wherefore tarry Mistress mine"

خوشحال و غالب کا بڑھاپا

خوشحال کا بڑھاپا

جیسا کہ معلوم ہے۔ خوشحال خان نے ۷۶ برس کی عمر پائی لیکن انکی آخری عمر غموں اور مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ گوکہ بچپن اور جوانی میں وہ حوادث کے شکار ہوتے رہے۔ ۱۳ برس کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسفویوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہوئے اس سے پہلے صغیر سنی میں ایک دفعہ مکان کا چھیران پر گرا جسکے نتیجے میں وہ زخمی ہوئے۔ اور چند دن بے ہوش بھی رہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر میں عین اپنی شادی کے دن انہیں سخت بخار نے آگھیرا۔ جو بارہویں دن جا کر ٹوٹا۔ یہی نہیں ۵۱ برس کی عمر میں اورنگزیب عالمگیر کے مغل صوبیدار نے انہیں دھوکہ سے گرفتار کیا اور پابہ سلاسل پشاور سے دہلی روانہ کیا۔ جہاں سے انہیں قلعہ رتھنہ بھیجا گیا اور تقریباً ڈھائی سال قید رکھا گیا۔ قید کے بعد دہلی اور آگرہ میں ڈھائی سال تک نظر بند رکھا گیا۔ قید اور نظر بندی کے بعد سرائے اکوڑہ واپسی ہوئی تو مظلوم ہوا ان کا پورا خاندان بکھر چکا ہے۔ اور یوسفویوں کی پناہ میں ہے اسکے بعد دکن سے لیکر کابل تک ایک زبردست قحط اور وبا نے سخت تباہی مچادی جس میں خوشحال خان کی بیوی بیٹے اور ان کے علاوہ بہت سے عزیز واقارب بھی انتقال کر گئے۔

علاوہ ازیں انہیں اپنے جوان سال بیٹے نظام کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اسکے بعد مظلوموں کی ایماہ پر دولت اور منصب کی خاطر خوشحال خان کی اپنی اولاد اسکے خلاف ہو گئی حتیٰ کہ انہیں اپنا علاقہ چھوڑ کر افریدیوں کے پاس پناہ لینی پڑی۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں تھے۔ ان حالات کو مشہور مؤرخ جادو ناتھ سرشار نے اپنی تاریخ میں یوں سمیٹا ہے:-

”ایک فرد واحد جس کی اتنی بڑی سلطنت (مغلیہ) جان کے درپے

ہو۔ اس کا قبیلہ بھی ساتھ چھوڑ دے اپنے بیٹے بھی علی مخالفت پر اتر

آئیں۔ گھربار سے محروم ہونا پڑے عمر اس کی چھتر (۷۶) سال ہو۔

پھر بھی اس کی ہمت نہ ٹوٹے تو وہ خوشحال خان خلک ہو گا“

آخری عمر میں خوشحال خان کا شغل قلم اور کتاب پر موقوف تھا۔ لیکن نظری کی کمزوری کی وجہ سے یہ شغل بھی محال ہوا۔ جیسے کہ کہا ہے:-

”میری یاری قلم اور کتاب سے ہے مگر اب یہ مشغلہ بھی نظری کی کمزوری

کی وجہ سے ممکن نہیں رہا۔“

میاں سید رسول رسا اپنی معرکہ الار کتاب ار مغان خوشحال میں خوشحال خان کے بڑا چاہے اور بذلہ سخی کا نقشہ خود خوشحال خان کی زبانی یوں کھینچتے ہیں:-

”اگر خوشحال خان بوڑھا ہو گیا ہے تو اے یہ توقف مگد حواس میں کیا

عجب ہے۔ کیونکہ منک و غنبر اور اگر حق جتنے پرانے ہوں ان کی خوشبو

تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ گوہر کے پرانا ہونے پر اسے ادنیٰ نہیں سمجھا جاتا۔ سونا کسی بھی بازار میں لے جایا جائے اس کی قدر کم نہیں ہوتی۔“
آئیے اس نابغہ عصر کے بڑھاپے اور دکھوں کا اندازہ انکے مزید اشعار کی روشنی میں کریں:-

ترجمہ:- خدا جانے یہ آسمان کی کون سی آفت ہے جس نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ آج روئے زمین پر اتنا پریشان اور کوئی نہ ہوگا جتنا میں ہوں۔ اگر بیشار ہوں تو عزت و ناموس کو خطرہ درپیش ہے انھوں تو طوفان اٹھتا ہے۔“

ترجمہ:- ”یا اپنی اولاد سے شاہجہان نالاں تھا یا پھر خوشحال فریاد کر رہا ہے۔ میری داڑھی سیاہ تھی تو میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ اب جبکہ سفید ہو گئی ہے تو معلوم ہوا کہ اگر سمندر کا صدف سُچا نہ ہو تو اس سے اچھا گوہر نہیں نکلتا۔“

ترجمہ:- بڑھاپا آ گیا۔ جو میں کمزور اور ناتواں ہو گیا ہوں۔ یا مجھے کوئی بیماری ہو گئی ہے کیونکہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ (پورا) نہیں ہوتا۔ ورنہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ۔“

بڑھاپا خوشحال کی حسن پرستی میں کچھ کمی نہ لاسکا:-

ترجمہ:- یہ جو بے وقت مجھ پر سفید داڑھی کی بلا نازل ہوئی ہے۔ تو

اس نے خوشحال سے خوب صورت حسیناؤں کے دل پھیر دیے ہیں۔“
 ترجمہ:- یہ تم جو سفید داڑھی لگائے ہوئے اس سے بوسہ مانگ رہے
 ہو۔ تو پاس کھڑے ہوئے تو جوانوں کی فنی اڑا رہے ہو۔ اب جو تم
 بوڑھے ہو گئے تو جوانوں کی سی خواہش بھی مت کر۔ اب تم سے جوانی
 کی ساری باتیں چلی گئی ہیں رات دن بھی اگر زار و قطار اس کے لیے
 روتے رہو تب بھی زندگی کا گیا ہوا وقت پھر (لوٹ کر) نہیں آئیگا۔“

ترجمہ:- عشق جوان کی نسبت بوڑھے کو جلدی زبون کرتا ہے۔ کیونکہ
 پکی لکڑی آگ سے خوب سوختہ ہوتی ہے۔“

ترجمہ:- اگرچہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر هنوز
 اس کے دل میں حسینوں سے آشنائی کرنے کا جذبہ زندہ ہے۔“

ترجمہ:- کاش کہ سدا تیس سال کی عمر ہوتی۔ کاش کہ ہم گل لالہ کی
 طرح تازہ رہتے۔ روز روز حسین عورتوں کے حسن سے لطف اندوز
 ہوتے۔ اور خدا را ہاتھ میں پیالہ ہوتا۔“

خوشحال پر بڑھاپا آیا تو اپنی جوانی کو ایک خواب پر معمول کیا:-

ترجمہ:- جوانی میں تو سوتا رہا۔ اب بڑھاپے میں خوشحال کی آنکھیں کھلی ہیں۔“

ترجمہ:- اے خوشحال! جوانی کی ساعت ایک خواب کی مانند تھی۔

جسے میں نے دیکھا اور وہ گزر گئی۔“

ترجمہ:- ہائے جوانی تو تو ہوا کے کندھوں پر بیٹھ کر چلی گئی۔ تیری کامرانی ایک رات کا خواب تھی۔ میں بیدار ہوا تو چیری سے واسطہ پڑا ہے۔ نہ تو اب تلوار کی تیزی ہے اور نہ خانی“

بڑھا پے نے خوشحال کی جس مزاح کو اور تیز کر دیا:-

ترجمہ:- جوانی چلی گئی۔ بڑھا پا آ گیا۔ اب میں باغ کا ایک رنگا پھول ہوں۔ اگرچہ میرے منہ میں دانت نہیں تب بھی بغیر دانتوں کا مست ہاتھی ہوں“

ترجمہ:- لو اب میں عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو۔ سفید داڑھی میری جوانی چھین چکی ہے۔ ایک شکار دوسرے کتاب اور تیسرے حسینوں کی یاد کے سوا باقی تمام چاہتیں ختم ہو چکی ہیں“

ترجمہ:- بوڑھا چاہے اپنی سفید داڑھی پر کتنا ہی کالا خضاب لگائے اور جوان عورت کے سامنے اپنے آپ کو جوان ظاہر کرے مگر جوان عورت کا دل ایسے شخص سے پک چکا ہوتا ہے۔ چاہے وہ شخص اپنی جوان عورت کو کتنا ہی ناز و نعم میں رکھے ہاں مگر خوشحال کا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ جوان شکر لب عورت کا بوسہ یوں ہے کہ جوان کر دیتا ہے“

ترجمہ:- ”اے خوشحال تجھ پر بڑھا پا چھا گیا ہے۔ لیکن تیرے دل

میں ابھی تک چند خیالات باقی ہیں۔ تک کا خیال، جنگ کا خیال،
حسینوں کا خیال اور خط و خال کا خیال“

ترجمہ:- ستر سال سے گزر چکا ہوں۔ کج چشم ایک کو دود دیکھتا ہے میں
ایک کو سات دیکھتا ہوں۔ اسی (۸۰) سال تک اگر پہنچ جاؤں۔ تو
صاف نظر آتا ہے کہ ایک کے بیس دکھائی دیں گے“

ترجمہ:- ”اگر بات ڈاڑھی اور دانتوں تک ہے۔ تو پھر تو یہ پھول جیسی
نازک اندام حسینائیں مجھ سے رہ گئیں۔ البتہ بڑھاپے میں خوبہ خطر
بن کر اور بھی حسین صورتیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔

ترجمہ:- ”میری ڈاڑھی اور دانت صاف بتا رہے ہیں کہ میری جوانی
کا دور گزر گیا ہے۔ جب میں کسی کو دیکھوں یا ہنسوں تو وہ مجھے دادا
کا کا اور بابا کہہ کر پکارتا ہے“

یوں بڑھاپے نے قبیلے کے سردار، گلوار، کے وطنی، شکار اور کتاب کے رسیا شاعر بے بدل
خوشحال خان کو کمزور کرنے کی کوشش کی مگر حالات گواہ ہیں کہ اس مردِ آہن نے پھر بھی
ہمت کے ہتھیار نہ ڈالے اور اپنے گھریا سے دور افریدی قبیلے کی پناہ میں آخر دم تک اپنے
اصولوں پر قائم رہے۔

غالب کا بڑھاپا

غالب نے ۷۲ برس کی عمر پائی۔ بچپن امیرانہ ماحول اور تازہ دہلی میں گزرا۔ ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ سن شعور کو پہنچتے ہی مالی مشکلات سے دوچار ہوئے جو ہمیشہ غالب کے ساتھ رہیں۔ پینشن بند ہوئی۔ ملازمت حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ اسی دوران ایک اور بلائے ناگہانی سے واسطہ پڑا۔ یعنی قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ جب بہت ہی مجبور ہوئے تو قلعہ شاہی سے متعلق ہو گئے۔ اور یوں وہاں کی تنخواہ اور دربار راہپور کے وظیفے پر گزارا چلتا رہا۔ مقصد یہ ہے کہ غالب تقریباً تمام عمر غم دوران کے ہاتھوں نکالیف اٹھاتے رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر چند رہے۔ مہینے سے زیادہ کوئی نہیں جیا۔ ساتھ برس کی عمر میں غالب کو جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ہنگاموں نے اپنے ہی گھر میں مقید ہونے پر مجبور کیا۔ اسی دوران ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال نہایت نامساعد حالات میں ہوا۔ جنگ آزادی کے ان حالات کا نقشہ غالب نے اپنے کلام میں یوں کھینچا ہے:-

گھر سے بازار میں نکلے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آوی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

مختلف ادباء نے اپنے اپنے مخصوص حیرائی میں غالب کے بڑھاپے کے ذکر کو یوں سمیٹا ہے:-

”غالب پر بڑھاپا کیا آیا۔ اپنے ہمراہ دکھ اور تکالیف کا ایک ایسا انبوہ سمیٹ کر لایا جس نے غالب کو وقت سے پہلے ہی زندہ در گور کر دیا۔ ایام ہجری میں عذر کی صعوبتیں، عزیز واقارب کا قتل، جوان سال (بہتجے) عمارت کی موت، پشش کا بند ہونا، جاگیر کی تباہی، ادبی محاصمتیں، آخر کہاں تک گنوا یا جائے۔ مصیبتوں اور تکلیفوں کا ایک آسماں سر پر ٹوٹ پڑا۔ انہی سے نہرو آ زما ہوتے ہوئے غالب نڈرا جل ہو گیا“

(شریف رزوی، غالب اور قنوطیت)

”اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے خطوط میں موجود ہیں۔ نواب غلام بابا خان نے جشن کے سلسلے میں

سورت آنے کی دعوت دی جواب میں لکھتے ہیں ”پاؤں سے اپاچ“
 کانوں سے بہرا، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب
 ضعفوں پر ضعف طالع، کیونکر قصد سفر کروں؟“

(مولانا غلام رسول مہر ”خطوط غالب کی اہمیت“)

سفید بالوں کے نکلنے پر بھیری کا تصور یوں دلایا ہے۔

”----- جب ڈالھی مونچھ میں سفید بال آ گئے ---- اس
 سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ تا چار مسی بھی
 چھوڑ دی اور ڈالھی بھی“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو نثر“)

دہلی کی تباہی کے بعد آخر عمر میں غالب مکتوب نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔ اور مراسلہ کو
 مکالمہ بنا دیا۔ طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔ وہ برابر اپنے دوستوں، عزیزوں اور
 ملنے والوں کو خطوط لکھتے اور ان کے خطوں کے جوابات دے کر بڑھاپے کو بھلاتے رہے۔
 اپنے ایک عزیز شاگرد فشی ہر گوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں:-

”میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا
 خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن
 ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جواب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔
 بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار خط کا اہرکار وہ خط لاتا ہے۔ ایک دو

صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔“

میرسر فر از حسین کے نام ایک خط میں اپنے بڑے چاہے کا سرسری ذکر یوں کیا ہے:-
 ”تمہارے دستخطی خط تے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پراہن نے یعقوب کے ساتھ کیا۔ یہاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں تو اتا ہیں یا ناتواں ہیں بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہ ہر حال نفیست ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ“

وہ خط میں اپنے مصائب کا ذکر بھی بڑے مزاح انداز میں کرتے:-

”آپ اپنا تماشا بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے“

دہلی کی بربادی کا حال لکھتے لکھتے مرزا غالب نے ایک خط میں اپنی آخری عمر کے ناسازگار حالات کا احساس بھی دلایا ہے:

”بھائی کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز جمع بازار مسجد جامع کا ہر پختے سیر جتنا تیل کی ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا“

اپنے بڑھاپے اور ضعف سے متعلق غالب نے متعدد اشعار کہے ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

مضمحل ہو گئے قوی غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے پرتو خورشید جہاناب اوہر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ہو فشار ضعف میں کیا باتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

کر دیا ضعف نے عاجز غالب
تنگ بھری ہے جوانی میری

ضعف سے نقش چے مور ہے طوق گردن
ترے کوچہ سے کہاں طاقیتِ رم ہے ہم کو

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھیے تھے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا
ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

مجنائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوں یار بھی نہیں

ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

یاد تھیں ہم کو بھی رنگِ رنگِ بزمِ آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

شب وصال میں سوس گیا ہے بن نگہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن نگہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

قصیدے کے چند اشعار

اور پھر اب کہ ضعف جبری ہے
ہو گیا ہوں زار و زار و حزیں
جبری و نیستی خدا کی پناہ
دست خالی و خاطر غمگین

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحر مئی
مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ دلوے کہاں وہ جوانی کدھر مئی

قطعہ

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سوتا سو گند ہو گیا ہے غالب

ہم نے دیکھا کہ غالب کو بڑھاپے اور عسرت نے کس کس طرح سے عاجز کئے رکھا۔ منجملہ تمام مصائب کے آخری عمر میں مرزا کی نظر اس قدر کمزور ہوئی کہ مطالعہ ترک کر دیا انگوٹیاں کا مرض بھی اس درجہ ہوا کہ انہیں اپنے اشعار تک یاد نہ رہے۔ کہتے ہیں ایسی حالت میں انکو اپنا ایک شعر اور کسی دوسرے شعر کا ایک مصرع ہی یاد رہا۔ جسے وہ اکثر گنگنا تے رہتے تھے۔ شعر یہ ہے:-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

موازنہ

خوشحال اور غالب پر بڑھاپا کن کن حالات میں آیا اور ان دونوں نے زندگی کے اس مرحلہ کو کیسے گزاریا۔ اوپر کی سطور میں ہمیں ان سوالوں کے جواب مل چکے ہیں۔ اسی لیے ان

دونوں شخصیات کے بڑھاپے کا موازنہ کرتے ہوئے ہم صاف طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ ناز و نعم میں پلنے والے ان دونوں انسانوں نے بڑھاپے کے دوران اپنے آپ کو نامساعد حالات میں پایا۔ جسمانی کمزوری اور ضعف سے دونوں کو واسطہ پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اور دونوں میں اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک نامہوار اور تکلیف دہ زندگی گزارنے کا سلیقہ اور ہمت موجود رہے۔ خوشحال کے جواں سال بیٹے نظام کی موت ہو یا غالب کے چہیتے بھتیجے عارف کی بے وقت موت۔ خطہ کے دوران خوشحال کے عزیز واقارب کی اموات ہوں یا جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی حشر سامانیوں کے درمیان غالب کے بھائی مرزا یوسف کی انہوس ناک موت۔ آخری عمر میں خوشحال کی نظر کی کمزوری ہو یا غالب کو لاحق نسیاں کا مرض ڈائزیس کے سفید ہونے سے لیکر دانتوں کے گرنے تک ان دونوں شخصیات کے حالات میں ہمیں ایک قسم کی موافقت نظر آتی ہے۔ ہاں البتہ دو باتیں ایسی بھی ہیں جن میں ان دونوں کے حالات کا اختلاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ جہاں غالب کو خدا نے اولاد کے فتنے اور نافرمانی سے بچائے رکھا وہاں خوشحال کی اولاد نے اُسکی آخری عمر میں اسے لاجتہا تکالیف اور مصائب سے دوچار رکھا۔ دوسرا اختلاف ان دونوں شخصیتوں کے مغلیہ دربار کے ساتھ وقاداری سے متعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں غالب مغلیہ دربار سے منسلک ہو کر شاہی تحنواہ پر آخر تک انحصار کرتے رہے وہاں خوشحال نے مغلیہ دربار کی عطا کی ہوئی سرداری کو لات مار کر آخر دم تک مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کئے رکھا۔

باب دوم

فن



خوشحال و غالب کا نظریہ شعر

اگر کوئی مجھ سے شعر کی تعریف پوچھے تو میں میاں سید رسول رسا کی کتاب ارمغان خوشحال کے صفحہ ۱۶۰ پر شعر کی دی گئی یہ تعریف بیان کر دوں:

”شعر کی صحیح تعریف یہی ہے کہ اگر ایک انسان اپنے احساسات

جذبات و عواطف کا اظہار اس طور کرے کہ اسکو سننے یا پڑھنے والے

کے احساسات بھی ویسے ہی ابھریں جیسا کہ شاعر کے احساسات

شاعرانہ مشاہدے یا تجربے کے وقت ابھرے تھے۔ تو ایسے کلام کو

شعر کہیں گے چاہے اس میں وزن اور قافیہ ہو یا نہ ہو“

غالب نے شعر و سخن کی تعریف یوں کی تھی:

”سخن ایک معشوقہ پری پیکر ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین

اس کا زیور ہیں“

لیکن غالب سے پہلے اور خوشحال کے بعد خوشحال ہی کے پڑپوتے اور پشتو زبان کے

صاحب دیوان شاعر کاظم خان شیدا جورا پور میں رہائش رکھتے تھے۔ اپنے اشعار میں شعر و

سخن کی تعریف یوں کرتے ہیں:

مضمون د شعر لکہ پیکر دی
 بناستہ الفاظ نی رخت و زیور دی
 ورنہ ضرور دی دا دوارہ خیزہ
 پیکر کہ ہر خو دلربا خیزہ

ترجمہ:- مضمون شعر کا پیکر ہے اور خوبصورت الفاظ اسکے لباس اور زیور ہیں۔ یہ دونوں چیزیں پیکر کے لیے ضروری ہیں چاہے پیکر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

”جیسا کہ معلوم ہے شاعری مضمون اور اسلوب بیان کا مجموعہ ہے۔ انہی کی کمی بیشی اور پستی و بلندی سے شعر اور شاعر کا درجہ متعین ہوتا ہے کوئی جذبہ تحریر یا واقعہ جس قدر صحیح اور سچا ہو اتنا ہی مضمون اچھا اور خوب ہوگا۔ لیکن اس کو بیان کرنے کے لیے اس کی نوعیت اور شدت کے اعتبار سے سادگی یا رنگینی زور اور قوت، تخیل کی مدد، تشبیہات و استعارات وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ اسی لئے اسلوب بیان شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب ان میں حسین ترتیب اور ان کا بر محل استعمال نہ ہو تو مضمون اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ لیکن نہ تو سب شاعر ایک رتبے کے ہوتے ہیں اور نہ ہر شاعر کے تمام اشعار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مذکورہ شرائط اور خصوصیات میں کمی بیشی یا پستی و بلندی ہوتی رہتی ہے (۱)۔“

کلیم الدین احمد کے مطابق:-

”شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ شاعر تو نئی راہیں نکالتے ہیں۔ پرانے رستوں پر چلنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں پرانی روش سے ان کا جی گھبراتا ہے اور وہ نئی روش ایجاد کرتے ہیں کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی نئی راہ کی ضرورت نہیں سمجھتے جو جانے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں اسی میں کشادگی پیدا کرتے ہیں یا اپنی چال میں کچھ نئی شان اور بانگین پیدا کرتے ہیں۔ غالب اسی قسم کے شاعر تھے“

(کلیم الدین احمد۔ ”غالب کا آرٹ“)

خوشحال اس لحاظ سے نئی راہیں نکالنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے پشتو کی پرانی شاعری کو چھوڑ کر نئی پشتو شاعری کی بنیاد رکھی۔ جب یہ صورت حال ہو تو ظاہر ہے خوشحال اور غالب کا نظریہ شعر بھی ایک دوسرے سے چندے مختلف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں غالب کے نظریہ شعر کا ذکر کرتے ہوئے انکے شعر کے محاسن یعنی روایت، الہام، معنویت اور ندرت خیال وغیرہ کے گرد گھوم کر جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہاں خوشحال کے ہاں بنیادی طور پر شعر کو ایک ہنر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کا نظریہ شعر

غالب کا نظریہ شعر و شاعری جانتے ہوئے شعراء وادباء نے اکثر الہامی اور وجدانی کیفیت

کا ذکر کیا ہے۔ خود غالب بھی الہام کو مانتے تھے۔ ان کا یہ مشہور شعر اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صبرِ خامہ نوائے سرورش ہے

دوسری بات جو غالب کے ہاں انکے نظریہ شعر کے سلسلے میں دیکھی گئی ہے وہ انکا روایت سے کٹتے ہوئے بھی اس کا بہر حال احترام لازم رکھنا ہے۔ وہ قافیہ پیمائی کے قائل نہیں تھے۔ اپنے دوست ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں یوں لکھا ہے:-

”لغت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے توانی پیش رکھ

لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل

قصیدہ لکھنے لگا۔۔۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔“

ایک اور بات جو غالب کے نظریہ شعر سے متعلق کہی جاتی ہے۔ وہ معنی آفرینی اور معنویت کے ناظر میں کہی جاتی ہے کہ جب تک غالب نے ظہوری اور بیدل کا راستہ اختیار کئے رکھا معنی آفرینی اور بال کی کھال نکالنے کو شاعری خیال کرتے تھے۔ جب یہ رنگ اٹل دلی کو پسند نہ آیا تو مجبوراً انکو اپنی روش بدل کر معنویت کو اپنی شاعری میں جگہ دینی پڑی ساتھ میں وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے اشعار میں جذبہ اور احساس کی شدت نے جگہ بنائی۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

چوتھی بات جو غالب کے ہاں پائی جاتی ہے وہ رمزدکنایہ کا استعمال ہے۔ اس سے انکے اشعار میں اچھوتا پن پیدا ہوا۔ غالب نے علامتوں کا استعمال کر کے اس اچھوتے پن کو اور زیادہ سنوارا۔ اور اپنے کلام کو ”تجنیذ معنی کا ظلم“ گردانا۔

غالب الفاظ اور انکے استعمال کے اسلوب کو بھی شعر کی خوبی و بقا کے لئے ضروری سمجھتے تھے مگر انکے شعر میں ندرت خیال کو الفاظ سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ساتھ کے ساتھ وہ شعر کی ظاہری ہیئت سے بھی غافل نہ تھے۔ اسماعیل حسن خان کے مطابق انہیں اپنے انداز بیان پر فخر تھا:-

ہیں اور بھی دنیا میں سنخور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

موضوعات میں تنوع غالب کی شاعری کی جان ہے۔ گو اس تنوع سے انکی شاعری میں وسعت تو آتی ہے مگر میر بھی گہرائی نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک غالب کا نظریہ شعران عناصر سے بنتا ہے:

۲۔ معنی و بیان

۱۔ روایت

۴۔ غم زمانہ (زمانے کی ناقداری کا غم)

۳۔ الہام

۶۔ جذبے کی صداقت

۵۔ اثر پذیری

ے۔ لفظوں کی تراش و تراش

(ڈاکٹر وحید قریشی "غالب کا نظریہ شعر")

غالب کے شعر کی ایک اور خصوصیت کی طرف کلیم الدین احمد نے یوں اشارہ کیا ہے:

"غالب کو کشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات، جذبات یا ایک خیال، ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کو طرف توجہ ہٹاتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محشرستان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازہ کی کلید ہے۔"

(کلیم الدین احمد "غالب کا آرٹ")

غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں کون سی خوبیاں ہوں۔ اسطیعیل حسن خان نے انہیں یوں سمیٹا ہے:

"مختصر یہ کہ غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں لفظاً سلاست و متانت الفاظ، پاکیزگی و صفائی، ندرت و دل پسندی، بندش اور حسن

ہیاں، اور معنا بلند کی خیال، نزاکت معنی، عمدگی مضمون، جذبہ و فکر کا
 استخراج، تاثر، تازگی و طرکی فکر، اور رمزی و ایمائی کیفیت ہونا چاہیے
 اسی کا نام ”شیوایابی“ ہے اور یہی خصوصیات کلام کا جوہر اور شاعری
 کی عظمت کی ضامن ہیں۔“

(اعلیٰ حسن خان ”غالب کا نظریہ شعر“)

یہ تو ہوا غالب کا نظریہ شعر اب ہم خوشحال کی طرف چلتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے
 خوشحال کے ہاں شعر کو ایک ہنر سمجھ کر برتا گیا ہے۔ خوشحال نے شاعری میں نئی راہیں نکالی
 ہیں۔

خوشحال کا نظریہ شعر

خوشحال کے ہاں شعر و شاعری پر نثر اور نظم دونوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان کی نثری
 کتاب دستار نامہ میں ایک سردار یا بادشاہ کو صاحب دستار ہونے کے لیے میں خصائل اور
 میں ہنروں کا مالک ہونا چاہیے۔ جب ہم ان میں ہنروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو چوتھا ہنر
 شعر یا شاعری کا ہے۔ جس میں سردار یا بادشاہ کو طاق ہونا چاہیے۔ خوشحال نے اس چوتھے
 ہنر کے باب میں تیس بڑے بڑے نکات گنوائے ہیں آئیے دیکھیں:-

۱۔ شعر کو نظم کرنے کا ہنر کس کمال میں شامل ہے۔

۲۔ شعر وہی کہہ سکتا ہے جس کو اللہ نے اسکا شعور دیا ہو۔

۳۔ شعر کہتے وقت شاعر کے اندر خدا خود دخول کئے ہوئے ہوتا ہے۔

۴۔ فنون اور صنعتیں محنت سے حاصل ہوتی ہیں اگر کوئی انسان چاہے کتنا ہی علم حاصل کر لے یا اے صنائع و بدائع پر عبور ہو۔ وہ شعر نہیں کہہ سکے گا جب تک اسکی جبلت میں شعر نظم کرنا موجود نہ ہو۔

۵۔ دوسری طرف اگر اسکی طبیعت میں شعر کہنے کی اہلیت ہے تو چاہیے کہ وہ صنائع و بدائع بھی سب کے سب سیکھ ڈالے۔ علم بیان اور علم معانی بھی ضروری ہیں۔

۶۔ ان خوبصورتیوں کے علاوہ شعر میں درد اور محبت کا استعمال ہونا چاہیے۔

۷۔ دراصل لغت میں شعر کلام موزوں کو کہتے ہیں۔ شعر کے دونوں مصرعے قول میں برابر حروف میں پورے ہوں۔ عروض اور قافیے کا خیال رکھا جائے۔

۸۔ اگر غزل لکھو تو اس میں معشوق کے خط و خال گل و گلزار درد و فراق اور سوز و گداز کا ذکر ہو۔

۹۔ شعر کے ہنری ابتداء حکیم اقلاطون سے ہوئی۔

۱۰۔ اس (شعر) خانہ برد از سید گداز کی کیا تعریف کروں۔ یہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو بھسم کر دیتی ہے۔ ایک ایسا مہمان ہے جو سب کچھ بڑپ کر جاتا ہے۔

۱۱۔ شعر کو سمجھنا دشوار ہے تو اسکا کہنا مشکل۔

۱۲۔ شعر کہنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

۱۳۔ شعروہ شخص کے جو خندان ہو۔

۱۴۔ ایک لفظ کی آراستگی کی خاطر انسان کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔

۱۵۔ خدا اس کے شعر میں کسی کو گرفتار نہ کرے۔

۱۶۔ شعر کی خوبی جھوٹ میں ہے۔ اس میں جتنا جھوٹ بھرو گے اتنی ہی اس کی خوبی بڑھے گی۔

۱۷۔ عجیب بات یہ ہے کہ شعر میں جھوٹ کو سچ سمجھ کر اسکی تحسین کی جاتی ہے۔ شعر کی آرائش و زیبائش سب جھوٹ پر مبنی ہے اور ایسا کرنا بھی ایک ہنر ہے جو ہر ایک کے اختیار میں نہیں۔

۱۸۔ شعر ایک تیز آندھی کے مثل ہے۔ صرف بڑے درخت ہی اسکے سامنے ٹھہرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۱۹۔ شعر کا عیب نکالنے والے جاسوس بہت ہیں۔ جو تمہارے اچھے سے اچھے شعر کو بھی ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔

۲۰۔ شعروہی اچھا ہے جسے دانا کہے۔ وہ شعر نہیں جسے کوئی تک بند یا قافیہ بند نہ کہے۔

خوشحال نے شعر کے متعلق نثر میں جو کچھ کہا وہ اب ہمارے سامنے۔۔۔ انہوں

نے نظم میں بھی شعر و شاعری کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ چند ایسے اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

”شعر کے اچھے استعمال سے دانائی اور علم و حکمت کو فروغ ملتا ہے“

”ہر بحر میں شمار کے حرف ہوتے ہیں۔ عروض میں وہ وہ کارستانی کی جاتی ہے کہ باتوں کی بے مثل دلہن سامنے لا بیٹھتے ہیں“

”دلبروں کی آنکھوں اور دوسوں زلفوں اور خال کی تعریف میں غزلیں لکھی جاتی ہیں“

”اے خوشحال یہ نگین معانی کہاں سے پھولوں کی شکل میں میری بیاض پر اتر رہے ہیں“

”جب کسی شاعر کو نماز کے دوران شعر کی فکر لگ جاتی ہے تو وہ اعموذ کے ذال کو دال سے بدل ڈالتا ہے“

”دنیا میں شاعری سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں۔ خدا کسی کو اس جنجال میں شذائے“

”شاعر کا دل ایک تو لوگوں سے جدا ہو جاتا ہے اور دوسرے فکر شعر میں مصروف رہتا ہے“

”کبھی کبھی تو شاعر کا چہرہ اتنا فکر مند نظر آتا ہے کہ لوگوں کو اسکے پاگل ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے۔“

”رات کو دوسرے لوگ تو خیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں مگر شاعر اپنے پلنگ پر لیٹے ہونے کے باوجود خیند سے کوسوں دور رہتا ہے“

خوشحال نے نثر اور نظم میں شعر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا ایک : ہے۔ اور صرف وہی شخص یہ ہنر حاصل کر سکتا ہے۔ جسے اللہ نے اس کا شعور دیا ہو۔ ایک نہایت حکیمانہ بات جو خوشحال نے اس سلسلے میں کی ہے۔ وہ یہ کہ شعر کے ہنر کی ابتداء حکیم افلاطون سے ہوئی۔ ان کے اس کہنے کو لفظ نہیں لینا چاہئے۔ اس بات کی توضیح میں

خوشحال نے اپنے کلام میں ایک جگہ کہا ہے کہ ”شعر گوئی فاسق اور بد عمل شخص کا کام نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ ہر صاحب دل و چشم کے بس کا رنگ ہے۔ شعر گوئی سالک اور مالک کا کام ہے یہ عاشق اور درو مند کا کام ہے۔ اولیاء اور ابدالوں کا کام ہے۔ اس شاعر کی زبان پر چھالے نکل آئیں جو دنیا کے مال کی خاطر اشعار کہتا ہے۔“

خوشحال کا نظریہ شعر انکی ایک غزل میں بکمال خوبی بیان کر دیا گیا ہے:

”جیسے تیر کے لیے ایک تیر انداز کی ضرورت ہوتی ہے

ایسے ہی شعر کے لیے ایک سحر کار درکار ہوتا ہے

دل کے ہاتھ میں ہمیشہ ”اوزان“ کی میزان ہوتی ہے

جس میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی غماز بن جاتی ہے

کالے لکھوڑے پر حقیقت کی ایسی دلہن کو سوار کرتے ہیں

جس نے اپنے گورے چہرے پر مجاز کا گھونگٹ ڈال رکھا ہے

سو چلوئے سوانداز اور سو غزے

نگاہوں میں آنکھوں کی ادائیں جھٹکتی ہوئی

صنعت کے کئی قسم کے زیور پہنے ہوئے

تشمیہ کے چمکن چوڑے سے آراستہ

تفنیں کی پاگل چوڑیاں پاؤں میں پہنے ہوئے

ترجیح کا لہا چڑا ہار گلے میں ڈالے

مضامین کی نزاکت کے غزے لئے ہوئے
 سرے پاؤں تک تمام جسم سڈول
 اگر نظم میں کوئے اور گدھ کا ذکر کر دے
 تو وہ بھی یوں جیسے باز دلوں کے شکار کی تاک میں پھرتا ہو۔
 جب ایک بات کر چکے تو ہوشیار وہ ہے
 جو اختصار سے کام لے
 جب خوشحال نے پشتو میں شعر کہنا شروع کیا
 تو پشتو زبان میں بڑی بڑی خوبیاں پیدا کر دیں۔“

خوشحال وغالب کی غزل

پشتو شاعری نے ۱۳۹ھ میں امیر کردڑ کی لکھی ہوئی ایک نظم سے اپنا سفر شروع کیا اس نظم کو اگر خالص پشتو نظم کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہیں ملا۔ پشتو زبان کا دوسرا قائل ذکر شاعر اکبر زمینداروی آٹھویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔ گوکہ اس سے پہلے بھی امیر کردڑ کے بعد دوسرے پشتون شعراء کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جب ہم پشتو شاعری میں مختلف سنگ ہائے میل کی بات کرتے ہیں۔ تو پشتو کا تحریری اور ادبی دور امیر کردڑ کی نظم سے شروع ہوا اور پشتو غزل کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری میں اکبر زمینداروی کے کلام سے ہوئی۔ پروفیسر شاہ جہان خان مصنف ”خوشحال خان خٹک بابائے پشتو شاعری“ اکبر زمینداروی کی پہلی غزل کو سادہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اکبر زمینداروی کے اس کلام میں پر شکوہ الفاظ ’پرداز تخیل‘ تھپیہ اور استعارے بہت کم ہیں۔ اس کا عروضی رنگ ’گہرے خیالات اور پشتو کے ملی خصوصیات کا حامل ہے۔ پشتو شاعری کا اگلا دور دسویں صدی ہجری میں آیا۔ جسکے دوران پشتو ادب میں فارسی اور عربی الفاظ کا نفوذ ہوا۔ اور فارسی شاعری کے اصناف مثلاً غزل

رباعی وغیرہ کا رواج عام ہوا۔ قاری اور عربی بخور و قوافی کا بھی رواج بڑھا۔ پشتو شاعری کے اس دور میں صوفیانہ کلام کی بھی ابتداء ہوئی۔ بابا یزید انصاری نے اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے پشتو نثر میں ایک مذہبی رسالہ خیر البیان کے نام سے لکھا۔ ان تعلیمات کو مرزا انصاری، 'مخلص'، 'ارزانی'، 'قادر دلاؤ دولت' اور میاں داد نے اپنے کلام کے ذریعے پھیلا یا۔ ان سب کے کلام پر زیادہ غلبہ صوفیانہ افکار کا تھا لیکن عشقیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ آخر کار زمانے نے پلٹ کھایا۔ پشتو ادب کی قسمت جاگی اور گیارہویں صدی ہجری میں روشن و تاباں تعلیمات و افکار کو پیش کرنے کے لیے ایک مردِ دانا و دینا خوشحال خان خٹک کی صورت میں نمودار ہوا (۱)۔

اوجہ اردو شاعری کی ابتداء جنوبی ہندوستان کے خطہ دکن و بیجا پور سے ہوئی۔ دلی دکنی کو اردو کے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شمالی ہندوستان میں لکھنؤ، دلی اور کسی حد تک لاہور اردو شاعری کے مراکز مانے جاتے ہیں۔ ان مراکز میں اردو غزل اور دوسری اصنافِ سخن کا سلسلہ میر تقی میر، 'سودا'، 'انتا'، 'جبرائیل'، 'متحلی'، 'ناخ'، 'ذوق' اور 'مومن' سے ہوتا ہوا غالب تک پہنچا اور اسکے بعد داغ اور اقبال نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا۔ 'احقر' حسرت، 'قانی'، 'جگر'، 'فیض' اور موجودہ دور میں احمد ندیم قاسمی، 'احمد فراز' اور دوسرے کئی نامی شعراء نے اردو غزل کی آبیاری کی۔

تاریخ اردو شاعری کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل گوئی کا پہلا دور غالب سے فوراً پہلے ختم ہوا۔ دوسرا اور جدید دور غالب کے ساتھ شروع ہو گیا۔ لیکن ان ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اردو غزل کی ہیئت اور معنویت پر نظر رکھنی ہوگی۔

”غزل کی ہیئت ایک بندھی لگی ہیئت ہے۔ اس میں ہمارے کسی فنکار نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے نہ اس میں ترمیم کی گنجائش ہی ہے کیونکہ غزل ایک مخصوص ہیئت ہی کا نام بھی ہے لیکن جہاں تک غزل کی معنویت کا تعلق ہے یہ فارسی کی دین قلعہ نہیں ہے۔ اس میں ہمارا اپنا کلچر اور اپنی ثقافت ملتی ہے۔ یہ ہمارے مخصوص انداز نظر اور قومی عروج و زوال کی جملہ منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے ہمارے تمدن کی شیرینی اور ہمارے عقیدہ و عمل کی تصویریں اردو غزل کے پردوں پر منتقل ہیں۔“

(عطا محمد شغلہ ”غزل پر غالب کے احسانات“)

جب ہم غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے دور سے پہلے یعنی میرؔ سودا اور درد کے زمانے میں اردو غزل کی ہنت میں عشقیہ خیالات کی بھرمار ہوتی تھی۔ یہ دراصل فارسی غزل کی تھکید تھی۔ رہی دلی و کھنی کی بات تو اس کا کلام خالصتاً ہندوستانی تھا جس میں فارسی غزل کے اثرات نہیں ملتے۔

”غالب کی شاعری بقول اکرام شروع سے آخر تک مک و اصلاح کی ایک مسلسل کوشش ہے ان کا فن نہ میر کی طرح شخصی دائرے میں گردش کرتا ہے اور نہ مومن کی طرح وہ اسالیب پر قدرت حاصل کر کے مطمئن ہوتے

ہیں۔ حالی نے ان کے کلام کی چھ خوبیاں گنائی ہیں:

۱۔ جدت مضامین و طرقی خیالات

۲۔ تدریجیہات عام اور متبادل تشبیہوں سے گریز

۳۔ استعارے، کنائے اور تمثیل کا خوبصورت استعمال

۴۔ شوخی و طرافت

۵۔ پہلو دار اشعار

۶۔ سیدھے سادھے خیالات اور معمولی اسالیب میں لفظی و معنوی تصرفات کر کے ان میں ندرت اور طرقی پیدا کرتا۔“

(شجاع احمد زبیا ”اردو غزل اور غالب“)

اب آئیے دیکھیں کہ خوشحال خان خٹک کے متعہ شہود پر آنے کے بعد پشتو غزل پر کیا بیتی لیکن اس سے پہلے یہ بات اب صاف ہوتی ہوئی نظر آنے لگی ہے کہ اگر خوشحال پشتو شاعری کے پہلے ادوار کے آخری اور نئے دور کے پہلے سرے پر کھڑے ہیں۔ تو غالب اردو شاعری کے پرانے دور کے آخری اور نئے دور کے پہلے شاعر ہیں۔ اس طرح اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قدرت نے ان دو نابغہ شخصیتوں کو اپنے اپنے ادب میں نمایاں کام کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اور آج یہ جو ہم پشتو اور اردو شاعری اور نثر کی جدید صورت دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہی باکمال انسانوں کی بصیرت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پشتو زبان و ادب کی ترقی میں جو کاوشیں خوشحال خان خٹک نے کی ہیں۔ وہ ان

سے پہلے گذرے ہوئے تمام پشتو شعراء اور ادباء کی مشترکہ کاوشوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ اس حقیقت کی طرف خوشحال بابا نے خود یوں اشارہ کیا ہے۔ (۱)

”میں نے پشتو زبان کی نظم و نثر بلکہ تحریر کے ہر میدان میں بے پناہ کام کیا ہے لہذا اس زبان پر میرا بڑا حق بنتا ہے۔ اس میں پہلے نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی رسم الخط یہ تو میں نے اس زبان میں کئی کتابیں تصنیف کر ڈالیں“

جناب پروفیسر شاہ جہان خان نے اپنی کتاب بابائے پشتو شاعری کے صفحہ ۲۷ پر جناب میر عبدالمصدق کا یہ اقتباس تحریر کیا ہے (۲) :-

”خوشحال خان ایک متنوع شاعر تھا۔ اس سے پہلے پشتو شاعری میں غزل کے سوا دوسری اصناف بہت کم تھیں اور خود غزل کا دامن بھی بہت تنگ اور محدود تھا۔ اس نے غزل کا مقام بلند اور وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، مسدس، الغرض فارسی شاعری کی تمام اصناف کو پشتو شاعری میں داخل کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ آگے چلکر لکھتے ہیں:

”خوشحال خان کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ محرک اور

(۱) بابائے پشتو شاعری ص ۲۶

(۲) خوشحال و اقبال، ص ۸۶ تا ۸۸

متحرک ہے اس میں قوت اور زور بیاں ہے جس سے جذبات میں
بلندی، خیالات میں وسعت اور عزائم میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔ پشتو
شعراء میں اولیت خوشحال ہی کو حاصل ہے کہ اس نے حسن و عشق،
وصال و فراق، اور کل بلبل کے تذکروں کے ساتھ ساتھ معاشرتی،
تمدنی، اخلاقی و سیاسی حتیٰ کہ طب و صحت اور فلسفہ و حکمت پر بھی دل
کھول کر طبع آزمائی کی۔

معلوم ہوا کہ خوشحال اس وقت پشتو زبان کے ادبی افق پر ظاہر ہوئے جب یہ ادب محدود تھا
خوشحال نے اسے توسیع دی اور ادبی تنوع کے ذریعے اس میں ایک نئی زندگی پھونک ڈالی۔
پشتو زبان کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا کا خوشحال کی شاعری کے متعلق یہ خیال
ہے:-

”خوشحال خان کی شاعری میں استقدر جامعیت اور تنوع ہے، اتنے
موضوعات، اسالیب بیان اور اصناف سخن ہیں کہ صرف ایک قادر الکلام
ادیب ہی ان کے مختلف پہلوؤں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے
حسن اظہار، زور بیاں، علوخیل، رنگینیوں اور باریکیوں سے وہی شخص
لفظ اندوز ہو سکتا ہے جو خود باریک بین اور صاحب ذوق سلیم ہو۔
خوشحال خان پشتو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ
خیال و تصور کے عالم بالا سے حقیقی دنیا میں نیچے اتر آتا ہے۔ اس کے

خلق حقائق کا مزا چکھتا ہے اور اپنے تاثرات سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں جان ہے جوش اور دلولہ ہے زندگی ہے اور سب سے بڑھکر ایک حیاتِ افروز پیغام ہے (۱)۔

آئیے اب غالب کی طرف چلتے ہیں۔ اور اردو غزل کے لیے انکی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں اپنی بات دوبارہ سے اردو غزل کی ہیئت سے شروع کرنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حسن و عشق کا ایک محدود علاقہ تھا۔ جس کے اندر رہ کر تقریباً تمام تر مضامین کو غزل پر آ زمایا جا چکا تھا۔ غالب سے پہلے غزل مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔ یعنی 'ہجر وصال' 'آہ و نالے' 'دقا' 'بے وفائی' 'امید' 'نامیدی' 'کوچہ' 'یار' 'محبوب کے جسم کے مختلف پرکشش حصوں یعنی زلف' 'رخسار' لب' 'دندان' 'مڑگان' 'بھونیں' 'نخط' اور دوسرے اس قسم کے خدو خال۔ گلشن' بلبل' صید و صیادان کے علاوہ تھے۔ ان سب کا تعلق غزل کی ہیئت سے ہے جہاں تک معنویت کا سوال ہے تو اس دور میں غزل کی معنویت پر کچھ زیادہ زور نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب تک آتے آتے غزل اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ اسکی صرف ساخت ہی رہ گئی تھی۔ مزید برآں ہیئت و ساخت سے متعلق مضامین کے بے دریغی استعمال کی وجہ سے غزل میں استعمال کے لیے کوئی نیا مضمون کہنے کے لیے نہیں رہ گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ غزل میں معنویت لانے کے ساتھ ساتھ عشق و حسن کے دائرے سے نکل کر

معاشرے کو ورچیش دوسرے مسائل کو بھی غزل کے موضوعات میں شامل کیا جاتا۔ یہی وہ وقت ہے جب غالب نے غزل کی بگڑی بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ یہاں ہم جناب شجاع احمد زبیا کے خیالات غالب اور اردو غزل سے متعلق پیش کرنا چاہیں گے کہ اس سے بہتر تبصرہ اس مضمون پر ہماری نظر سے آج تک نہیں گذرا:-

”حسن و عشق کے محدود دائرے میں رہ کر جدت مضامین و اسلوب کے جو جو ہر دکھائے جانے ممکن تھے وہ غالب کے وقت تک ظاہر ہو چکے تھے۔ اب ایک ہی صورت غزل کو زندہ رکھنے کی باقی تھی کہ اس کے موضوع کو وسعت بخشی جائے اسے حسن و عشق کے تنگ دائرے سے جس میں یہ اب تک قید تھی باہر نکالا جائے اور محبت کے علاوہ دیگر احساسات و جذبات انسانی کے لئے بھی اس میں گنجائش نکالی جائے۔ چنانچہ غالب نے اپنی زبردست انفرادیت پسندی کے ہتھیار سے مسلح ہو کر غزل کی مفروضہ چار دیواری کو پاش پاش کر دیا۔ جس کی بت بنا کر پوجا کی جا رہی تھی۔ اس نے غزل کو کائنات و حیات کے بنیادی مسائل اور انسان کی فنی و جذباتی زندگی کی عکاسی کے لئے نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اگرچہ غالب اور دو غزل کے ارتقائی الفاظ کا منطقی نتیجہ ہے مگر اس دور کے شاعروں میں قدرت نے فضیلت کا یہ تاج اسی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے غزل کے امکانات کا جائزہ لیا۔ شروع

شروع میں اپنی طبع معنی آفرینی کے کمال کو آزمایا مگر معلوم ہوا کہ بیدل اور صاحب کا رنگ اس سانچے پر نہیں کھپتا۔ چنانچہ اس نے غم عشق کو غم روزگار بنادیا۔ جذبے میں فکر کی آمیزش کی اور غزل کو جواب تک دل کے پھپھو لے پھوڑنے یا تضن طبع کے کام آتی تھی۔ ابدی اور ازل حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔

(شجاع احمد زبیا، ”اردو غزل اور غالب“)

چونکہ یہ بحث صرف خوشحال و غالب کی غزل گوئی سے متعلق ہے۔ اس لیے ان نابہ شعراء کی شاعری کے دوسرے اصناف پر بحث نہیں کی جا رہی۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ کہ خوشحال و غالب اپنی اپنی زبان و ادب کے جن ادوار میں منظر پر آئے۔ وہ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ جہاں غالب کو اپنی شاعری میں فارسی کی آمیزش کم کرنی پڑی وہاں خوشحال نے فارسی غزل کی ہیئت کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے اسے پشتو غزل کی ہیئت میں آمیز کیا اور اسکے علاوہ پشتو غزل کو گھمے پنے موضوعات کے چنگل سے نکال کر غم و دوراں کے موضوعات بھی آزمائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے ان ہر دو شعراء نے حسن و عشق کو غزل کے لئے بالکل متروک کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں غم جاناں کے علاوہ غم و دوراں کے موضوعات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خوشحال کی غزلوں کے موضوعات میں حمد، شکایت، شافِ خدا کی منائی، قناعت، اپنے کلام کی تعریف، زاہد، شراب، مچائی، جھوٹ، شکر سکران کے ستم زدہ عوام، ریاست و حکومت، انسانیت، حیوانیت، اچھا عمل، تنگ، غیرت، طنز، تنہائی، فلسفہ، حکمت

تصوف، سائنس، پڑھاپا، دولت، عبادت، ہمت، منظر ہر قدرت، کار حکومت، بخت، امید و بیم، مذہب، تعلیم و تعلم، تقدیر، جنگ، ہندوستان میں قید کی یادیں، ہندی عورتیں، آفریدی حسینائیں، وطن کی یاد، مغلوں کی بھڑائی، اتفاق خوشحال سپاہی، چوٹی، اللہ بادشاہ، توبہ، عاجزی، دعا، فلک، فتنے، دستار کامرتہ، شہباز، شیر، حج، نادان کی دوستی، دولت کی خوبیاں، شکار، نعت رسول مقبول، موت، مردانگی کے اصول، خوشحال کے اساتذہ، اطاعت، حقیقی، قلم، قضا و قدر، غم، انہوں کی دشمنی، ہند ایک دوزخ ہے، اچھی عورت کی خوبیاں، احق کی دوستی، خود اعتصالی، زہر حیات، ہند کی تعریف، صحبت کا اثر اور سینکڑوں دوسرے موضوعات شامل ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خوشحال بابائے غم جاناں کے موضوعات اپنی غزل میں برتے ہی نہیں مثال کے طور پر چند عشقی اور رومانی موضوعات یہ ہیں: عورت، جور و ستم، عاشق، معشوقہ، محبوب کی دید، رقیب و رقابت، بیچہ، اردنیں، گل لالہ اور رخسار، محبوب کی کالی آنکھوں کی قسم، بال سے باریک چلی کر کی قسم، قاصد، بیابن، گل و بلبل، دُور غم، آگ اور پروانہ، خال کی خاطر بخارا، بخشا، نقاب، مڑھاں، بے خودی، فرزا، لگی، دیوانگی، خوبصورتی، حسن پرستی، کوچہ، یار، ناک میں نخصی، گورا چہرہ، گلزار میں پھول، مطرب، چنگ و نئے بہار، شکراب، سیاہ خال اور وصال و جہراں۔ جہاں تک غزل کی حیثیت کا تعلق ہے تو خوشحال نے اس میں بھی تجربے کئے ہیں۔ مثلاً ایک پشتو غزل میں قافیہ ردیف کے طور پر اپنے دور کے اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں:-

کلہ کلہ نہی لہ حالہ خبر اخلہ

بیچارہ خوشحال خیل زرہ در پسے ہاربا

ترجمہ:- کبھی کبھی اسکی حالت کی خبر لیتے رہو کہ بیچارہ خوشحال اپنا دل تیرے ہاتھوں ہار چکا ہے۔

دوسری خاص تبدیلی جو خوشحال کی دو ایک غزلوں میں ملتی ہے وہ عاشق اور معشوق کا آپس میں سوال و جواب کے ذریعے اپنے اپنے دلوں کا حال کہنا اور گلے شکوے کرنا ہے۔ تیسری خوبی جو خوشحال کی بعض غزلوں میں دیکھی گئی ہے اسے ”قسم شاعری“ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔ لیکن سب سے پہلے کلیات خوشحال سے ایک نمائندہ غزل غزل نذر قارئین ہے۔ اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے منفرد وزن اور قافیہ ردیف کی تکرار نے غزل کی لکھ دو آتش بنا دیا ہے:

زہ ہم چیرے فرزانہ وم ، فرزانہ یم لاتر اوس
تل بی خودہ دیوانہ وم ، دیوانہ یم لاتر اوس
جدائی نشہ وصال دے ٹھنی بعد ہم خیال دے
لہ ہفہ چہ ہمخانہ وم ، ہمخانہ یم لاتر اوس
چہ راغلی بہ جہان یم خبر شوے بہ خیل خان یم
درازو خزانہ وم ، خزانہ یم لاتر اوس

چہ د مخ پلؤ نی واشو یو مشال وہ چہ نماشو
 ہغہ دم پری پروانہ وم ' پروانہ یم لا تراوس
 ہغہ شان لہ خیلہ یارہ بی وکیلہ بی ریارہ
 زہ خوشحال چہ بیگانہ وم ' بیگانہ یم لا تراوس
 ترجمہ:- میں بھی کبھی فرزانہ تھا تو ابھی تک فرزانہ ہوں

ہمیشہ سے بے خود پروانہ تھا تو ابھی تک بے خود پروانہ ہوں
 یہ جہان کی نہیں دھال ہے اس سے دوری بس ایک خیال ہے
 میں جیسا اس سے ہم خانہ تھا تو ابھی تک ہم خانہ ہوں
 جب سے اس دنیا میں آیا ہوں اور اپنے آپ سے باخبر ہوا ہوں
 میں جیسا رازوں کا خزانہ تھا تو ابھی تک وہی خزانہ ہوں
 جب اسکے چہرے کا گھوگٹ کھلا تو اک مشعل تھی جو نظر آئی
 میں اسی دم اس کا پروانہ بن گیا تھا تو ابھی تک وہی پروانہ ہوں
 اپنے دوست سے بغیر وکیل اور بغیر قاصد کے
 میں خوشحال جیسے پہلے بیگانہ تھا ابھی تک بیگانہ ہوں

اب ہم ان تجربات کا ذکر کریں گے جو خوشحال نے غزل کی ہنت کے سلسلے میں کئے۔ ایک
 ایسی غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس میں عاشق اور محبوبہ کے درمیان سوال
 جواب کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے:

وے مہی کہ تھہ درشم ستا تر خایہ خولہ بہ را کر
وے نی سکہ ہزار سرہ لہری چہی دا وینا کر
وے مہی چہی کوم توکی بہ تا وتہ نزدی شم
وے نی چہی کہ سر لہ تنہ بی تیغہ جدا کر
وے مہی چہی ہر گورہ کبریا شوہی خدائے دی وینی
وے نی چہی کہ کبر کرم ستا تھہ دی چہی غوغا کر
وے مہی چہی د سپینہی زیبا خولہی عاشق دی زہ یم
وے نی چہی خدائے تھہ دا عاشقی ہم ویریا کر
وے مہی چہی لہ نتہی دی چارگل پہ پوزہ زیب کا
وے نی دا خبری کرہ ہالہ کہ چاہہ تا کر
وے مہی کہ زہ ستا پہ کوئے کنہی ورم ستارضا دہ
وے نی کشکی خلاص لہ درد سرہ سپہی زما کر
وے مہی چہی پہ خورنگہ خوشحال پہ تا مین دے
وے نی دختک سری د مینہی تھہ وینا کر

ترجمہ:- میں نے کہا "میں تمہارے پاس آ جاؤں مجھے بوسہ دوگی؟"

کہا "کیا ایک ہزار سر رکھتے ہو جو ایسا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں کس صورت تمہارے قریب آ سکوں گا؟"

کہا "اگر بغیر تیغ کے اپنے سر کو اپنے تن سے جدا کر سکو تو"

میں نے کہا ”دیکھو تم مغرور ہو گئی ہو خدا تو دیکھنے والا ہے“
 کہا ”میں اگر غرور کرتی ہوں تو تمہیں کیا تم کیوں شور مچاتے ہو“
 میں نے کہا ”میں تمہارے اس گورے چہرے کا عاشق ہوں“
 کہا ”خدا نے عاشقی بھی کیا اہل کر دی ہے“
 میں نے کہا ”تمہاری ناک میں تھنی سے زیادہ لو لگ جیتی ہے“
 کہا ”اپنی رائے اس وقت دو جب کوئی تم سے پوچھے“
 میں نے کہا ”اگر میں تمہارے کوچے میں مرجاؤں تو تمہاری مرضی ہے“
 کہا ”کاش تم میرے کتوں کو اس دوسرے نجات دلاؤ“
 میں نے کہا ”خوشحال ہر طرح سے تم پر فدا ہے“
 کہا ”ایک ٹٹک آدمی کی محبت کی کیا تعریفیں کرتے ہو“

تسمیہ شاعری میں خوشحال نے اپنی غزلوں میں دنیا جہان کی چیزوں اور لوگوں اور مظاہر قدرت کی قسمیں کھا کر غزل کے آخر میں اپنی محبوبہ کو اپنے دل کی بات بتائی ہے۔ غزل کی دنیا میں یہ ایک منفرد ہیئت ہے کم از کم پشتو غزل میں اس سے پہلے تسمیہ شاعری کی مثال نہیں ملتی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے خوشحال کی ایسی ایک غزل پیش خدمت ہے جو پھوٹی بحر میں ہونے کی وجہ سے اور زیادہ اثر انگیز ہو گئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ آج سے کم و بیش ساڑھے تین سو سال پہلے کہی گئی ہے۔

د بنیاد منو پہ خندا گو	د غم ژنو پہ زرا گو
د بہار پہ بنو گلونو	د بلبلو پہ نوا گو
چی مکحولی دی لہ نازہ	پہ ہفہ سترگو شہلا گو
چی نری تر و بنتہ دہ	پہ ہفہ باریکہ ملا گو
چی راغی دیار لہ لوریہ	پہ ہفہ باد صبا گو
چی پیغام راؤری د وصل	د ہفہ قاصد پہ پا گو
پہ دا ہومرہ سو گندونہ	صد ہزار غلہ بیابا گو
چی تر خان پہ تا مٹین یم	زہ خوشحال ختک پہ تا گو

(جاری دے)

راتہ مہ وابہ پہ تا گو	چی پہ تانہ گو پہ چا گو
تہ زما د سترگو تور نی	پہ دا تور و سترگو ستا گو
مخ د ورغ زلفی د شپہ دی	پہ سبا گو پہ مسا گو
تمنا لرم ستا دہرہ	پہ دا خپلہ تمنا گو
تر خندا پوری د ہیخ دی	لال او دُر ستا پہ خندا گو

یار خوشستایم د چانہ یم

زہ خوشحال ستا پہ لقا گو

ترجمہ: خوشدلوں کی ہنسی کی قسم غمزدوں کے رونے کی قسم

بہار کے اچھے پھولوں کی قسم اور بلبلوں کے نعروں کی قسم
 جن میں بڑے ناز سے سر ملگا ہے ان شہلا آ نکھوں کی قسم
 جو بال سے زیادہ باریک ہے اس پتلی کمر کی قسم
 جو محبوب کی طرف سے آئے اس باد صبا کی قسم
 جو وصل کا پیغام لائے اس قاصد کے پاؤں کی قسم
 اور ان اتنی قسموں کے بعد بھی صد ہزار بار قسم اور پھر قسم
 کہ میں اپنی جان سے زیادہ تم پہ عاشق ہوں مجھ خوشحال خٹک کو خود تیری ہی قسم
 (جاری ہے)

(تو کہتی ہے) یہ مت کہہ کہ تری قسم اچھا تیری قسم نہیں تو پھر کس کی قسم
 تو میری آنکھوں کی کالی پتلی (نور) ہے تیری ان کالی آنکھوں کی قسم
 تیرا چہرہ دن اور رات ہیں اس صبح کی قسم اس شام کی قسم
 مجھے تیری بڑی تمنا ہے اپنی اس تمنا ہی کی قسم
 تیری ہنسی کے آگے لعل اور موتی پیچ ہیں تیری ہنسی کی قسم
 میں تیرا ہی دوست ہوں اور کسی کا نہیں
 مجھ خوشحال کو تیری ملاقات کی قسم

یوں خوشحال نے غزل کی بہت سے ساتھ ساتھ ایسی معنویت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ نہ صرف
 یہ کہ انہوں نے غزل کو نئے مضامین سے روشناس کر کے جدید پشتو شاعری کی بنیاد رکھ دی

بلکہ اگلے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل میں مضامین کے تنوع کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بغرضی تمام کیا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوشحال نے فارسی زبان سے غزل کی روایات کو اس خوبی سے پشتو غزل میں سمویا کہ وہ فارسی غزل کی ہمسری کرنے لگی۔ خوشحال نے پشتو غزل کی ہیئت میں جو کامیاب تجربات کئے وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اور یہ حیثیت مجموعی یہی پشتو غزل پر خوشحال کا احسان ہے۔

غالب کی غزل

اس مقام پر جب ہم غالب کی اردو غزل کو زندہ رکھنے کی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اردو غزل میں غم دور اس سے متعلق بے شمار مضامین شامل کر کے اسے معدوم ہونے سے بچایا:-

”غالب ہی کا فیضان ہے کہ غزل جو ہر نئے دور کے آغاز پر ظالم و بے درہکتہ
 چیلوں کے اعتراضات کا ہدف بنتی ہے گر کر سنبھالا لیتی ہے اور ہر بار مرنے
 سے بچ جاتی ہے۔ غالب نے اسے ایسی ڈگر پر ڈال دیا ہے کہ اگر اس نے
 زمانے کی ضروریات کے مطابق نئے نئے موضوعات کو قبول کرنے میں پس و
 پیش نہ کیا اور ہر عہد کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی تو یہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی“

(شجاع احمد زیا۔ ”اردو غزل اور غالب“)

ظاہر ہے غالب نے روایت سے ہٹ کر جو غزل کو غم دوراں کی ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی تو اس میں نئے موضوعات کو شامل کرنا پڑا۔ اردو غزل میں غالب نے جو بے شمار نئے موضوعات شامل کئے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

تصوف، فلسفہ، مذہب، نفسیات، سائنس، موسیات، کعبہ و جنت، جدیدیت، 'ضعیفی' موت، قیامت، عزائم، شوخی، آزاد خیالی، ہمت، وحشت، دھول دھپا، اہل کشف، پیسے، زمزم و احرام، ستم ہائے روزگار، مسجد، عقل، گوہر اور بہت سے دوسرے۔ ان سب پر مستزاد غالب نے دو ایک غزلوں میں قانونی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں۔ اور یہ اگلے سفر گلشن کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ بحیثیت 'بکر'، 'مضمون'، 'سادگی' پر کاری اور معنویت کے لحاظ سے دیوان غالب کی ایک نمائندہ غزل کی نشاندہی کروں تو میں غالب کی اس غزل پر سادہ کہوں گا۔

غزل

یہ ہم جو جہر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
 کبھی سب کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
 وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
 کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کد کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالب کے تغزل کی تاثیر چھوٹی بحر کے استعمال سے دوچند ہوئی ہے۔ آپ ان کی چھوٹی بحر کی کوئی سی غزل اٹھالیں اسکے بحر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ مثلاً ایسی چند غزلوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں:-

درد منت کش دوانہ ہوا

یا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا

یا

پھر مجھے دیدہ تریا دآ یا

یا

این مریم ہوا کرے کوئی

یا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

۱

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے

غالب نے ان غزلوں میں نہایت سادگی اور پُر کاری سے کام لیتے ہوئے ان میں فارسی الفاظ کا استعمال نہ ہونے کی حد تک کیا ہے۔ کمال کی بات یہ بھی ہے کہ ان غزلوں میں زبانِ زو عام اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ جہاں خوشحال نے پشتو میں ”قسمیہ“ غزل کی طرح ڈالی وہاں غالب نے اردو میں ”سوالیہ“ غزلیں چھوڑی ہیں ہم غالب کی اس کاوش کو تجربہ کی ویل میں شمار کرتے ہوئے یہاں ان غزلوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟

دُشمن کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

مگر کیا تا صبح نے ہم کو قید اچھائیوں سہی

یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں کیا؟

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قلعہ غم اُلفت اسد

ہم نے یہ ماندہ کہ ولی میں رہے کھائیں کیا؟

دوسری غزل کے چند اشعار:-

ہوں کو ہے نشاط کار کیا کیا
 نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
 نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
 شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
 یہ قاتل وعدہ صبر آزما کیوں
 یہ کافر فتنہ طاقت رہا کیا؟
 بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
 عبارت کیا "اشارت کیا" ادا کیا؟

دیوان غالب میں ایک ایسی غزل بھی وارد ہوئی ہے: کہ جس کے مقطع میں مطلع کی تکرار
 موجود ہے۔

مطلع:- پھر ہوا وقت کہ ہو پال کشاموج شراب

وے بڑے کو دل دوست شناسوج شراب

مقطع:- ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھا سد

پھر ہوا وقت کہ ہو پال کشاموج شراب

غالب نے غزل میں سادگی، سلاست، پرکاری سے کام لیکر جو غزلیں کہی ہیں۔ ان میں ایک
 نمائندہ غزل پیش خدمت ہے:

درد منت کش دوانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
 ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا
 کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
 ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
 کیا وہ ضرور کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
 جان دی 'دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
 دھم گروب گیا لبو نہ حما کام گر رک گیا روانہ ہوا
 رنجنی ہے کہ دلستانی ہے لے کے دل دلستان روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سراہہ ہوا

مولانا حالی غالب کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ انکے نقاد بھی تھے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں انکی رائے پر یہ بحث ختم کرتے ہیں:

”میر و سودا اور ان کے حقدارین کے کلام میں ایک قسم کے خیالات اور
 مضامین دیکھتے دیکھتے ہی آکتا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد مرزا کے
 دیوان پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا
 ہے۔ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک
 بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے کلام میں

ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے“

(مولانا حالیؒ ”یادگار غالب“)

موازنہ

یوں خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان میں غزل کو نہ صرف ایک نئی ڈگر پر ڈالا بلکہ اسے اتنی قوت بخشی کہ وہ رہتی دنیا تک اپنے پاؤں پر کھڑی رہ سکے۔ علاوہ ازیں ان دونوں نے اپنی اپنی غزل کو جدید طرز سے نوازا۔

بقول مولانا حالیؒ: ”نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو مجبور نہ کریں“ اسی لئے نئی طرز جو بقول ڈاکٹر محمد حسنؒ فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی تھی رستے میں ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر پیدا ہو گئی اور مومنؒ، شیخہؒ، سالکؒ، عارفؒ، تسکینؒ اور داغؒ نے اسے رواج دیا۔ فارسی کی اسی نئی طرز نے مرزا کے خیالات میں انوکھا پن، شوخی، غرافت، استعارے اور کنائے کا چمکا دینے والی حد تک دلکش استعمال اور انکے ذہنی اشعار کو جنم دیا۔ یہی کچھ غالب سے ہونے دو صدیاں پہلے خوشحال کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اور یہی ہمارے ان دونوں نابھہ شعراء کا موازنہ ہے۔ اسی لئے عصر جدید کی پشتو اور اردو غزل خوشحال و غالب کی احسان مند ہیں۔

خوشحال وغالب کی قصیدہ گوئی

خوشحال اور غالب دونوں نے اپنے اپنے ماحول کے مطابق قصیدہ گوئی کی۔ خوشحال اور غالب کے قصائد اور انکو لکھنے کے ڈھنگ میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق جہاں خوشحال نے دنیا جہان کے عنوانات پر قابل قدر تعداد میں قصیدے لکھے۔ اور اورنگزیب کے خلاف ہجو بھی قصیدے ہی کے ذیل میں لکھی۔ وہاں غالب کے ہاں بقول خوبہ محمد ذکر یا اردو کے سرف چار قصیدے ملتے ہیں۔ ان میں دو حضرت علی کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ مگر خوبہ محمد ذکر یا کے اس دعوے کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ میری اپنی تحقیق کے مطابق دیوان غالب (نسخہ طاہر) میں کم و بیش سات اردو قصائد کی موجودگی ذکر یا صاحب کے دعوے کی تردید کے لیے کافی ہے۔ (دیکھیے دیوان غالب نسخہ طاہر سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸) غالب نے فارسی میں جو قصیدہ گوئی کی ہے وہ ہماری آج کی بحث کا عنوان نہیں ہے۔

خوشحال کے کلام میں یہ اشعار ملتے ہیں جن میں قصیدے کا ذکر بھی مل جاتا ہے:-

”میں نے ہر موضوع پر۔۔۔۔۔ قصیدے بھی لکھے اور حکمت و پند و

نصائح سے بھرپور واقعات بھی قلم بند کئے۔ دلبروں کی شان میں

غزلیں بھی لکھیں اور آنکھوں اور آبرؤں کو زلفوں کا اسیر بھی کیا۔
 رہائی، قطعہ اور مشق میں ہیرے، لعل، موتی اور جواہر بھی جڑے۔
 اگر فارسی میں کوئی شخص مجھ سے بہتر ہے تو پشتو ادب میں میں بے
 مثال ہوں۔“

(جیل صدیقی ”جمہوریت کا علمبردار از خوشحال نامہ“)

خوشحال بابا نے لا تعداد عنوانات پر قصائد لکھے۔ آپ انکے قصائد پڑھتے جائیں
 تو ان میں وہاں ذکر بہار کی آمد، چند حکمت کی باتیں، پشتو شاعری پر بابا کے احسانات،
 شاعری کی لت، اور تنگزیب اور اسکے امراء کی جھوٹا تاریخ نویسی یعنی دہلی کے پشتون اور مغل
 بادشاہوں اور شہر دہلی کی تاریخ، چین کی سیر، دن اور رات کا مکالمہ، قید کے حالات، بہار میں
 رومان، استاد کی نصیحتیں، دو بیٹوں کی بہادری کا بیان، ایک بیٹے کی جھوٹا حیا اور ذاتی نقصان،
 اپنے عقیدہ اور مسلک کا بیان، ہند سے نفرت اور جنگی حالات جیسے عنوانات پر قصائد ملیں
 گے۔ ایک قصیدہ ایسا بھی ملے گا جسے میں پراسرار قصیدہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ یہ محبوب کی طرف
 سے محبوب کے نام لکھا گیا ہے۔ نہ جانے خوشحال نے یہ قصیدہ لکھنے کے لیے کیسے اپنا موز
 بنایا ہوگا۔

خوشحال نے جو چند تعریفی قصیدے لکھے وہ دہلی کے دو ایک خدا ترس پشتون
 بادشاہان یعنی بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری وغیرہ کے متعلق ہیں۔ جو خوشحال کی پیدائش
 سے پہلے ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے۔

خوشحال کے اورنگزیب بادشاہ کی قید و بند کے دوران اس کے خلاف بھونکا قصیدے تاریخی تناظر میں لکھے گئے۔ اور خوشحال و اورنگزیب کی آپس کی پرغاش اور خوشحال پر اورنگزیب کے ظلم و ستم کی حقیقت کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مرقوم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ خوشحال کے ان تاریخی قصائد میں سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ایک قصیدے میں خوشحال بابا اپنے تعریف کرنے اور بھوکے کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:-

”میں حسینوں کے ہوا اور کسی کا مداح نہیں۔ مجھے کسی اور کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں کہتا۔

میں کیا خود خدائے تعالیٰ کو حسن پسند ہے۔ دلیل میں ذرا سورہ یوسف غور سے پڑھو۔

نہ تو مجھے کسی سے کوئی لالچ ہے کہ میں اس کا مداح بن جاؤں نہ کسی سے خواہرداری ہے اور نہ مجھے دغا یا فریب سے کوئی علاقہ ہے۔

اگر تجھ اور عیب گوئی پہ آ جاؤں تو میں تمہیں بتاؤں کہ فردوسی بھی اس کام میں میرا ہمسر نہیں۔

فردوسی نے محمود کی بھوک میں زیادہ سے زیادہ دو چار شعر کہے ہوئے اور میرے پاس اورنگزیب کی خدمت کے اشعار سے بورا بھرا پڑا ہے اور جب بادشاہ وقت ذم کے لائق ہو گیا تو پھر ہر چھوٹا بڑا خدمت کے

قابل ہو گیا۔ میں نے کسی کی عیب گوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور
اس کا سارا وبال بھی اور نگزیب ہی کی گردن پر ہے۔“

ایک اور قصیدے میں شاہ جہان بادشاہ کی تعریف کرتے کرتے بادشاہ وقت اور نگزیب کو
یوں نشانہ بنایا ہے:-

”میرے کام کی قدر بس شاہ جہان کے دل میں تھی (ورنہ)
اور نگزیب کا حال تو ظاہر ہی ہے۔ جس کے خیر خواہ اور بد خواہ دونوں
ایک سے ہیں۔ خود اسے عدل کی تیز ہے نہ اعتدال کی۔

جب سے اسکی بادشاہت کا دور شروع ہوا ہے بس اس کے عہد میں ہر
طرف خلل اور فساد مچا ہوا ہے۔ اسکے زمانے میں تمام ملک تہہ و بالا
ہو کے رہ گیا۔ گویا کہ دجال کا زمانہ آ گیا۔

جس نے اپنے باپ تک کو نہ چھوڑا اسے دوسروں پر ظلم کرنے میں کیا
تامل ہو سکتا ہے۔ جیسے وہ میرے زوال کے دیکھنے کا خواہشمند ہے
میں ابھی اسکے لئے ایسا زوال نہیں چاہتا“

اور نگزیب بادشاہ کے ظلم اور اسکے امراء کی تلافی کو اپنے ایک قصیدے میں خوشحال نے
یوں بیان کیا ہے:-

”اور یہ تجھ پر ہی نہیں اگر زمرہ رہا تو اور نگزیب بہت سوں کو پائمال
کر ڈالے گا۔ اس نے بخت نصیر کا ظلم شروع کر رکھا ہے۔ اور میں

وانیال کی طرف، اسکے ہاتھوں میں قید ہوں۔

جو کوئی بھی اسکے ہاتھ آ جائے جاوے جا اسے خوار کرتا ہے اور وہاں کی پرواہ نہیں کرتا جب اس نے اپنے باپ کو نہ بخشا تو اوروں پر زیادتی کرنا اسکے لئے کیا مشکل ہے۔ سچ پوچھو تو یہ کام بادشاہوں کے نہیں۔ یہ تو ایک رہزن اور ڈاکو کے کام ہیں۔

ایک ظلم میں دوسرے مکر میں کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں۔ اگر ہے تو حجاج ہے یا یزید۔ ایسے بادشاہ کی نماز بھی جس میں عدل اور میاں نہ روی نہ ہو۔ اسکے گلے کا ہار ہو جائیگی۔ نہ انصاف ہے نہ تیز نہ عدل کا اجالا۔ بس اسکے دربار پہ ایک تاریکی چھائی ہوئی ہے اور اس میں وحشی درندے (رہتے) ہیں۔

اسکے امراء بھی سب اسی جیسے ہیں۔ سب ہر طرف سے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اگر ان کا حسب نسب دیکھو تو ان میں تھوڑے حاصل نکلیں گے اور زیادہ کم ذات“

اپنی شاعری اور بادشاہ وقت کی مدح سے متعلق خوشحال کا یہ مشہور شعر بھی اسی جذبے کے تحت لکھا گیا:-

”اگر میں نے اپنی شاعری چکانی ہوتی تو اپنے بادشاہ کی ڈھیر ساری تعریفیں لکھتا“

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

”اس شاعر کا من کالا ہو جو طمع اور لالچ کی وجہ سے ہر در اور ہر در پار
کے پاس کھڑا رہتا ہے“

خوشحال کے فن قصیدہ گوئی کا اندازہ لگانے کے لیے انکے مشہور قصیدے ”بہار کی آمد“ سے
یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

”پھر کہاں سے آگئی یہ بہار کہ تمام وطن کو گل و گلزار بنا دیا۔ ارغوان
(سرخ رنگ کے پھول) ضمیران (نازیبو) سون (اودے اور نیلے
رنگ کے پھول) اور ریحان کھلے ہوئے ہیں۔ یاسمین (چشمبیلی)
نسترن (سیوتی) نرگس اور انار کے پھول۔

بہار کے پھول ہر قسم کے بے شمار ہیں مگر لال بھبو کا لالہ ان میں بہت
نمایاں ہے۔ لڑکیاں ڈھیر سارے پھول اپنے گریبانوں میں ٹوم رہی
ہیں اور نوجوان اپنی گلیزیوں میں گلہ سے لگا رہے ہیں۔

مطرب سازنگی بجانا شروع کر، ہر ہر تار اور پردے سے نقشے نکال،
ساقی، آ اور بھر بھر کے پیالے دے کہ شراب کے نشے میں سرشار
ہو جاؤں“

خوشحال کا ایک قصیدہ اپنے اندر دن اور رات کا مکالمہ سمیٹے ہوئے ہے۔ قصیدہ گوئی میں یہ
بھی خوشحال کا ایک تجربہ ہی گردانا جائے گا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یوں ہیں:-
”یہ دن اور رات کی بحث ہے اے ہدم ذرا کان لگا کر سن اگر توے“

اس پر غور کیا تو اپنے دل کو مصیبت سے چھڑا لے گا۔

دن نے رات سے بحث چھیڑی پہلے تو (دونوں نے) ایک دوسرے کی تعریف کی پھر ان کی گفتگو پھیل کر ایک دوسرے کی مدح و ذم تک پہنچ گئی۔

رات نے دن سے کہا۔ اے دن میری فضیلت تجھ سے زیادہ ہے اسلئے کہ میں ازل سے تجھ سے آگے ہوں۔

سب متقی اور خدا دوست رات ہی کو عبادت کیا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ بھی اپنی قوم سے الگ ہو کر رات کے وقت ہی کوہ طور پر گئے تھے۔

حضرت احمد مختصی (صلعم) نے بھی رات کے وقت چاند کو اتارا تھا اور معراج کے لئے رات ہی کو تشریف لے گئے تھے۔

دن میں آسمان کی طرف دیکھو تو ایک نیلا گنبد دکھائی دیتا ہے۔ رات کو دیکھو تو جنت سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔

میں میوے پر پردہ ڈالنے والی ہوں اور تو عیب فاش کرنے والا ہے مجھ سے لوگ راحت پاتے ہیں اور تو مصیبتوں اور غموں سے بھرا ہوا ہے۔

جب دن نے رات سے اپنی یہ ”تعریفیں“ سنیں تو آہستہ سے کہا

لے اب مذمت ختم کرا اور چپ ہو جا۔

جو با ایمان روزہ رکھتے ہیں وہ سب دن کے وقت ہی رکھتے ہیں اور عرفات میں بھی دن ہی کے وقت جمع ہوتے ہیں۔

قیامت میں لوگوں کا مشر نشتر بھی دن ہی کے وقت ہوگا۔ اور انس و جن کی تخلیق بھی پہلے پہل دن کو ہی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں روشن اور تجھے دیکھ کے تاریک ہو جاتی ہیں۔ میرا بشرہ اسلام سے منسوب ہے اور تیرا کفر سے۔ میرا لباس عید کا ہے اور تیرا ماتم کا۔

مانا کہ تو بادشاہ کی مانند ہے اور چاند ستارے تیرا لشکر ہیں مگر جو نمی دن نکلتا ہے تیرا یہ سارا لشکر تس تس ہو جاتا ہے۔

سورج اگر بادلوں میں چھپا ہوا ہو تب بھی چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے اور یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ سونا چاندی کے درہم سے اچھا ہوتا ہے۔

چمن کے پھولوں کی سیر یا شکار کے لیے رات بھی دن کی طرح موزون نہیں ہو سکتی۔

فرض نمازیں مجھ میں زیادہ اور تجھے میں کم۔ یہ کم اس لیے ہیں کہ تو خود (رہتے ہیں) مجھ سے کم ہے۔

غالب کی قصیدہ گوئی

غالب کے زمانہ میں قصیدہ گوئی کے فن پر فارسی قصیدہ گوئی کی چھاپ باقی تھی۔ بھوکھنے کا فن قصیدے سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ محمد زکریا نے ان حالات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

”فارسی اور اردو کے بڑے بڑے قصیدہ نگار مثلاً انوری، خاقانی، ظہیر

قاریابی، عرفی اور سودا وغیرہ نے قصیدوں میں سنگلاخ زمیں اختیار

کیں اور علوم و فنون کی اصطلاحوں سے انہیں گراں بار کر دیا۔ خود

غالب کے ہمعصروں میں ذوق کے قصیدے بھی قبیح اور ٹھیکر ہیں۔

غالب نے قصیدہ گوئی کے اس انداز کو ترک کر دیا اور نہایت آسان

زمین منتخب کیں“

(خواجہ محمد زکریا ”غالب کے اردو قصیدے“)

خواجہ محمد زکریا کے مطابق غالب نے جو ابتدائی دو قصائد لکھے ان میں فارسی

ترکیب اور الفاظ کا وہی انداز ہے جو غالب کے پہلے دور کی غزلیات میں ہے۔ باقی دو

قصائد آسان اور سہل اور رواں دواں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ

غالب کو اردو قصیدہ نگاری میں کوئی خاص مقام نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ان کے قصیدے

فن قصیدہ گوئی پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن نقادوں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اسی جدت

کی وجہ سے غالب کے قصائد کا مداح ہے۔ ان میں عبدالسلام ندوی اور سید عابد علی عابد ایسے نقاد بھی شامل ہیں۔ عبدالسلام ندوی شعر الہند جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ غالب نے بعض قصائد لکھے جو اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں۔ مثلاً

ہاں مہر تو نہیں ہم اس کا نام

یہ قصیدہ اگرچہ ایشیائی قصیدہ گوئی کے تمام رسمی محاسن سے خالی ہے لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تھپیہ نے اردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

غالب کے قصائد کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی تمہید میں زور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ قصیدے کے پہلے شعر ہی سے مدوح اور اسکی مدح کے انداز کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور آگے چلکر گریز کا شعر آتے ہی پوری بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

غالب نے اردو میں جتنے بھی قصائد لکھے وہ مدحیہ ہیں۔ ان میں یا تو حضرت علی کی یا بادشاہ وقت اور دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں حتیٰ کہ پنجاب کے ایک گورنر مسٹر منگلوی کی تعریف کی گئی ہے۔ یہاں آ کر یہ سوال ضرور کھٹکتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کی مدح کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا خیال ہے کہ:-

”شاعر (غالب) کے دل و دماغ پر مابعد الطبیعیاتی تصورات سمائے ہوئے تھے۔ مگر عالم آب و باد و خاک کے خالص تا طبیعی تقاضوں نے

تنگین حالات کو سنگین تر بنا دیا۔ تو پسا پائی کی ہی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ تب حالات نے غالب کے اندر اس خوددار شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جس نے سخت تنگ دستی کے عالم میں بھی دلی کالج کی پروفیسری کو محض اس لیے شکر ادا کیا تھا کہ اس کا استقبال مقبلیہ روایات کے مطابق نہ ہوا تھا۔“

آگے چلکر پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں:-

”یہ شخص (غالب) رزمگاہ حیات میں حالات کا مقابلہ کمال دلداری اور مردانگی سے کرتا رہا مگر تاکہ جب حالات نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وضع داری اور خود داری کے سہارے زندگی کا ایک پہل گزرا تا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ تو وہ اس معنی آتش نفس کوڑھونڈ نے لگا جس کی صدا اسے جلوہ برق فنا ہوا اب اس کا محبوب موت بن گئی۔ اور وہ مرنے کی آرزو میں مرنے لگا۔ لیکن جب اس کی آنکھیں اس طرف سے بھی کھل گئیں کہ موت تو آنے کی نہیں تو اپنی وضع داری کا گلا گھوٹ کر اس نے جو اکیلنا شروع کر دیا۔ جب اس سے بھی اندیشہ ہائے دور دراز ختم ہوتے نظر نہ آئے تو

۔ بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا“

(پروفیسر فتح محمد ملک ”غالب۔۔۔ نزل سے قصیدے تک“)

غالب کی تعریف شاہ میں کی گئی قصیدہ گوئی اس کی سخت تنگ دستی اور معاشی مجبوری کا نتیجہ تھی ورنہ وہ بنیادی طور پر ایک وضعدار اور خوددار انسان تھا۔

غالب وکیلہ خواہ ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس ضمن میں ڈاکٹر ابوالیث صدیقی بیدل اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

” عظمت آدم کا راز دونوں کے یہاں جدوجہد، عزم و استقلال“

حرکت و عمل میں پوشیدہ ہے۔ دونوں کی طبیعت مشکل پسند ہے۔

دونوں اپنی راہیں شارع عام سے الگ نکالتے ہیں۔ دونوں خوددار

اور غیرت مند ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات اور واقعات نے

مرزا غالب کو زندگی میں عالی ظرفی، غیرت اور شکوہ کی بجائے جوان

کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا بادشاہوں، شہزادوں، ولی عہدوں،

نوابوں بلکہ معمولی انگریز عہدہ داروں کی مدح سرائی اور درپوزہ گری

پر مجبور کر دیا“

(ڈاکٹر ابوالیث صدیقی ”نقش ہائے رنگ رنگ“)

مگر یہاں یہ حقیقت بھی جاننے کے لائق ہے کہ غالب کو اپنے فارسی قصیدے پر ناز تھا۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی

لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھانوں کی طرح بکنا شروع
 کر دیں۔ میرے (فارسی) قصیدے دیکھو تھیب کے شعر بہت
 پاؤ گے اور مدح کے بہت کم۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔“

انکے فارسی قصیدوں میں مدح سرائی کے کم ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ فارسی کے چونسٹھ
 قصیدوں میں سے بارہ قصیدے 'حمد و نعت اور منقبت اہل بیت سے متعلق ہیں۔ گو کہ چند
 قصیدے دنیاوی ممدوحوں یعنی بہادر شاہ ظفر اور ملکہ دکنوریہ کی مدح میں بھی لکھے ہیں۔ بہر
 حال غالب کو اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ فارسی قصیدے میں انہوں نے مدح سے
 زیادہ تھیب پر زور دیا۔

غالب کی قصیدہ گوئی کے کچھ بھی محرکات رہے ہوں۔ انہوں نے کمال کے
 قصیدے لکھے۔ حضرت علیؑ کی شان میں جو دو قصائد لکھے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ اشعار
 پیش ہیں:-

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
 سایہ لالہ ہے داغِ سویدائے بہار
 لعل سے کی ہے پے زحمتِ مدحِ شاہ
 طوطی سبزہ کسمار نے پیدا منقار
 وہ شہنشاہ کہ جس کی پے تعمیر سرا
 چشم جبریل ہوئی قالبِ خشت دیوار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
 سلک اختر میں مہ نو مژگا گوہر ہار
 ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
 ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استلہار
 مدح میں تیری نہاں زمزمہ نعت نبی
 جام سے تیرے عیاں بادہ جوش اسرار

دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دہر جز جلوۂ یکتا کی معشوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں
 کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیر
 کس نے پایا اثرِ عالمہ دلہائے حزیں
 کس قدر ہر ذہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
 یک قلم خارج آداب وقار و حکمیں
 نقش لا حول لکھ اے غلامہ ہڈیاں تحریر
 یا علیٰ عرض کر اے فطرت وسواس قریں
 مظہر فیض خدا جان و دل شتم رسل
 قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد و یقیں

آخر میں مدح شاہ میں لکھے گئے قصائد میں سے چند اشعار یوں ہیں:-

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوہ و بے شبہ عدل
تیرا انداز سخن شائے زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

غالب کے سب سے بے نظیر قصیدے کے چند اشعار کے بغیر یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا:-

ہاں مہ نوتیں ہم اس کا نام
جس کو تو کر رہا ہے جھک کے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زبرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشاہ بلند مقام

خوشحال و غالب اور سائنس

خوشحال اور سائنس

بادی النظر میں خوشحال و غالب کا سائنس کے ساتھ کچھ تعلق ہونا ایک عجیب امر لگتا ہے مگر ہے دلچسپ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس پر طبع آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ خوشحال کا زمانہ سترھویں صدی کا حصہ تھا۔ تب ہندو کے سوا کوئی دوسری قابل ذکر سائنسی ایجاد کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر غالب کا دور انیسویں صدی میں آتا ہے اور نسبتاً زیادہ جدید تھا۔ جب برطانیہ میں ہنری پر چلنے والا پہلا ریلوے انجن ۱۸۰۴ء میں ایجاد ہوا تو غالب کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اگلے زمانے میں بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بھی موجود تھے۔ ہاں اگر مرزا اپنی طبعی عمر سے اٹھائیس برس اور زندہ رہ لیتے تو انہیں فینس کے علاوہ موٹر کار میں بھی سفر کرنے کا موقع مل جاتا۔ کیونکہ یورپ میں موٹر کار کی ایجاد ۱۸۸۷ء میں ہوئی۔ جبکہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔

یوں تو خوشحال و غالب دونوں نے جائے مولود سے باہر مختلف وجوہات کی بنا پر اسفار اختیار کئے لیکن ہر ایک کو سفر کے دوران اپنے اپنے زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف مشکلات اور تجربات کا سامنا کرنا پڑا جن کے اثرات بھی دونوں پر مختلف مرتب ہوئے۔

خوشحال نے اپنی زندگی میں بدخشاں، بلخ، کابل، تاراگزہ، دہلی، رخصتوہر (نزد ہے پور) سوات، درہ آدم خیل اور تیراہ کے سفر کئے۔ ان اسفار کے نتیجے میں خوشحال کے کلام میں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحال ایک جنگجو سردار اور شاعر ہونے کے علاوہ بنیادی سندھ پر رکھنے والے ایک حکیم، ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان بھی تھے۔ حکمت سے دلچسپی کے نتیجے میں لکھی جانے والی خوشحال کی کتاب ”طب نامہ“ ان کے زمانے کے لوگوں کے لیے خاصے کی چیز رہی ہوگی۔ اس کا مطالعہ آج بھی کئی لحاظ سے منفرد اور مفید ہے۔ اسے خوشحال کے زمانے کا لوکل فارما کو بیجا کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے ”طب نامہ“ کے مندرجات کو سائنسی بنیاد مل سکتی ہے۔

آئیے اب ذرا جغرافیہ دان خوشحال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پروفیسر محمد نواز طائر سابق ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کہتے ہیں:-

”چاہے کوئی مفکر، فلسفی ہو، ادیب، شاعر، سائنسدان یا مصور ہو، اس کے ذہن پر اپنے ماحول کا خاصہ اثر رہتا ہے۔ اور وہ اسی اثر کے سائے میں اپنے افکار، اشعار یا فن دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک نہایت اونچے پایے کے مفکر اور صاحب نظر انسان کے لئے اس کے محدود ماحول میں بھی پوری کائنات کے راز عیاں ہوتے ہیں۔“

آگے چل کر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:-

”ہمارے نامور شاعر خوشحال صحن خلک نے بھی اپنے بڑے اور

فراغ مکان (دُعا) کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ اور ایک اونچے درجہ کے
 بحیث دان کی حیثیت سے اسکے جزئیات پر الگ الگ بحث کی ہے۔
 زمین کی گردش اجرام فلکی سیاروں کا بغور مطالعہ پرانے زمانہ کے اہل
 علم اور ماہرین کی عادت رہی ہے۔ خوشحال نے بھی ان علوم پر بہت
 کچھ لکھا ہے۔ موسموں شب و روز کی طوالت یا کمی اور چاند اور سورج
 کی مختلف حالتوں پر اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنے کلام میں
 روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ خوشحال بابا نے آسمانوں کے بارہ
 مُدِوج کے نام بھی پشتو میں تجویز کئے ہیں۔ خوشحال کے مطابق یہ بارہ
 مُدِوج بارہ مہینے ہیں۔ اور تین مُدِوج یا مہینوں میں ایک موسم ہوتا
 ہے۔ یوں پورے سال میں چار موسم ہوتے ہیں خوشحال کہتا ہے:

”دشہنم کے موسم کے بعد بہار کے پھولوں کا موسم آتا ہے“

”بارہ برجوں پر سورج پورے بارہ مہینوں میں اپنا سفر پورا کرتا ہے“

”اگر سردیوں میں درخت کی شاخ تراشی کر لی جائے“

”تو بہار کے موسم میں اسکے پر وبال خوب نکلتے ہیں“

پھر علاقوں کی سطح سمندر سے کم یا زیادہ اونچائی کے اثرات اور آب و ہوا کے متعلق خوشحال
 نے یہ نقشہ کھینچا ہے:-

”باقی باغات تو نوروز (بہار) میں سرسبز ہوتے ہیں مگر کامل کا باغ

احاڑ (جون) میں سرسبز ہوتا ہے“

”سنبھد کی آٹھ تاریخ (۱۳ اگست) کو شبنم ختم ہو جاتی ہے بدن پر پسینہ

خشک ہو جاتا ہے۔ اور دھان کی بالیاں نکل آتی ہیں“

”سمرقند کی ناشپاتی کا پودا ہند کی زمین میں بونے سے جو پھل حاصل

ہوگا اگر اسے شہد میں بھی ڈبو کر کھاد۔ تو بے مزہ ہوگا۔ ہر پھل پر اپنی

نئی سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے“

(پروفیسر محمد طائر جعفرانیہ دان خوشحال“)

اس ضمن میں خوشحال کے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے:-

”پھل پھلاری نئے پھول اور قسم قسم کی نعمتیں زمیں سے پیدا ہوتی

ہیں۔ اور خود زمین گارامنی ہے“

اس جہان میں ہوا چاروں طرف گشت کرتی رہتی ہے۔ اس بات سے

بے خبر کہ وہ کیا ٹاپ رہی ہے کیا طے کرتی ہے۔ اور کہاں چلتی ہے“

خوشحال کے کلام میں حکمت اور جعفرانیہ سے متعلق یہی اشعار موجود نہیں بلکہ اس نے یہاں

وہاں ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس سے اسکی سائنسی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ اس

قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:-

”انسان کو قدرت نے جس ڈھنگ سے بنایا ہے۔ اگر غور کرو تو ایک سرسبز راز ہے“

انسان کی بناوٹ میں خاص طور سے آنکھوں کی بناوٹ میں جو سائنسی اصول کاربند ہے

اس کے متعلق خوشحال کے تخیل کا نقشہ جناب محمد نواز سرحدی نے یوں کھینچا ہے:-

”عموماً شعراء اور ادیب سائنس کے خشک کلموں کو اپنے کلام میں جگ نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں ایسا کرنا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ہے۔ خصوصاً شاعری کے نازک تخیل میں سائنس کے خشک کلمے سمونا گویا کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن خوشحال خان کے تخیلات کے گلستان کا دروازہ ہر ایک خیال کے لئے ہر دم و نظر آتا ہے۔ ان کا گلستان تخیل اگر ایک طرف ملی روحانی اور اخلاقی پھولوں سے مزین ہے تو دوسری طرف سائنس کے پھولوں کی کلیاں بھی چمکتی نظر آتی ہیں۔ اس نے سائنسی اور تکنیکی قوت کا اظہار بہت خوبی سے یوں کیا ہے:-

”محبوب کے چہرے کے سوا میں کسی چیز کو اپنی پتلی سے نہیں دیکھتا۔
 آنکھ کی دونوں پتلیاں سورج کی روشنی سے ملک کا نظارہ کرتی ہیں“
 ”لگ بھگ ساڑھے تین سو سال پہلے ایسے باریک سائنسی نکتے سے
 آگاہی خان بابا کے فہم و ادراک پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا
 ہے کہ وہ ایک نابجا انسان تھا۔ اگر کوئی اسی شعر کو باریکی سے دیکھے تو پتہ
 چلے گا کہ انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ دو متضاد خیالات یعنی
 رومان اور سائنس کو ایسے کججا کیا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا
 ہے۔ آپ محبوب کے چہرے کو سورج سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر
 ہے کہ دیکھنے کی طاقت سورج کی روشنی کی محتاج ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو

وہ کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے محبوب کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی نظر نہیں لگتی یعنی اگر اسے کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ چہرہ یاد ہے۔ یہی خیال اگر ایک طرف عظیم رومانی کیفیت رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سائنسی نظریے کا ایک تصور سامنے آ جاتا ہے اور وہ یوں کہ بقول انگے یہ آنکھ کی پتلی کا کمال ہے کہ پہلے سورج کی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور پھر واپس منعکس کرتی ہے۔ یہ روشنی جس چیز پر پڑے وہ نظر آ جاتی ہے۔ موجودہ طبعی سائنس کا نظریہ انکاس نور ہو، ہو خوشحال بابا کے اوپر بیان شدہ شعر کی ترجمانی کرتا ہے:-

(محمد نواز تنک۔ ”بابائے انسانیت“ ص ۱۹۸ خوشحال نامہ ۱۹۸۰ء پشاور)

ہوائی جہاز اور راکٹ کسی دھماکے یا رسی کی مدد کے بغیر بھی اڑتے ہیں یہی اشارہ آج سے ساڑھے تین سو سال (پہلے جب کہ ہوائی جہاز اور راکٹ ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئے تھے) خوشحال بابا نے اپنے چند اشعار میں یوں کیا ہے:-

ترجمہ:- ”اگر یہ سچ ہے کہ کاغذ کی پتنگ اوپر اڑ سکتی ہے تو وہ بغیر ڈور کے بھی اڑا کرے۔“

ترجمہ:- ”میں نے پوچھا میں اڑ کر آسمان تک کیسے جاسکوں گا؟

کہا: یہ کام ہمت کے بال و پر کے ذریعے ہوتا ہے“

ترجمہ:- ”ہمت کے بال و پر لگا کر میں آسمانوں سے ہوا تا ہوں“

خوشحال نے اپنے دوسرے چند اشعار میں سائنسی نکتے یوں بیان کئے ہیں:-

ترجمہ:- اے خوشحال چاروں عناصر تو (فقط) نوکر ہیں اور نوکر وہی کام کرتا ہے جس کا آقا کلمہ دیتا ہے۔“

ترجمہ:- ”فرشتے نور سے اور جنات آگ سے ہیں“

ترجمہ:- ”آدمی چار عناصر سے مرکب ہے۔ (اگر تمہیں معلوم ہو) اسکی ذات سے اس لیے فتنے اٹھتے ہیں کہ وہ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کا مرکب ہے۔“

ترجمہ:- ”سونا کچھ اور چیز ہے اور گندھک کچھ اور۔ کیا ہوا اگر گندھک میں سونے کا رنگ اور آب و تاب بڑھ جاتا ہے“

کیہا و ان خوشحال کا یہ شعر ایک عجیب تاثر پیدا کرتا ہے:-

ترجمہ:- اگر اسے آگ کے شعلوں میں جلاؤ اور راکھ ہو جائے تب بھی سیما (پارہ) سے زندہ رہنے کا ہنر کوئی نہیں جھین سکتا“

خوشحال ”تاریخ نویسی“ بھی تھے اور ”تاریخ گو“ بھی تھے۔ تاریخ گوئی کے متعلق خورشید اقبال تنک یوں رقمطراز ہیں:-

”علمی اور فنی دونوں لحاظ سے تاریخ گوئی مختصر مگر جامع اور سائنسی طریقہ استخراج کے نزدیک ایک فن ہے۔ اس کو تاریخ نویسی پر اس لئے برتری حاصل ہے کہ اس میں ایک اہم تاریخی واقعہ نہایت مختصر ہندسوں میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کوزے میں سمندر کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ یہ علمی طور پر سائنس نویسی پر اسی لئے برتری ہے کہ اس میں علم ریاضی کے حروف کی عددی قیمتوں کے ذریعہ خاص اصولوں اور قواعد کے تحت ایک“

واقعہ کے وقت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو تاریخ گو خوشحال کے سائنسی تخیل کی طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے کلام میں تاریخ گوئی کے ذریعے جگہ جگہ اہم واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں اور یوں اپنے زمانے کے اہم تاریخی واقعات کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے صفحہ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے۔“

خوشحال نے آج سے کم دہائی ساڑھے تین صدیاں پہلے DNA کے مسئلہ پر یوں روشنی ڈالی تھی۔

ہر و بستہ چہ بہ صورت باندی لیدہ شی

کہ ہر خیر شبی د شناخت و رہ درتہ واکا

ترجمہ:- ایک ایک بال جو بدن پر نظر آتا ہے۔ اگر اس پر غور کر دے تو تم پر شناخت کا دروازہ کھل جائے گا۔

آخر میں سراوٹ کیر دا اور ایولن ہاکل کی کتاب The Poems of Khushal khan Khattak (1963) سے خوشحال کی نظم ”پانی کے بلبلے“ کے ایک شعر کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کریں۔ اس میں بھی ایک سائنسی نکتہ پنہاں ہے:-

"Blowing bubbles bubbles blown

Are nī sooner Blown than flown

Scarcely sooner flown than ended

Bubbles burst when they are distended

And can never more be mended"

غالب اور سائنس

ظاہر ہے کہ خوشحال نے غالب سے لگ بھگ پونے دو صدیاں پہلے سائنسی تخیل کا مظاہرہ کیا۔ غالب کے زمانے تک مغربی سائنسی ترقی اور سائنسی ایجادات کی شروعات ہو چکی تھیں۔ اسلئے جب غالب نے اپنے چچا کی جاکیر کے صلے میں ملنے والی پنشن کا قضیہ نمٹانے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ تو اس سلسلے میں انھیں انگریزی عدالتوں سے واسطہ پڑا اور انگریزی طرز حکومت کا اندازہ ہوا۔ وہ کلکتہ، بنارس اور دوسرے مقامات اور حالات سے بھی واقف ہوئے۔ کلکتہ میں غالب نے جدید عمارتیں دیکھیں اور ایک نیا بننا ہوا تمدن دیکھا۔ سید احتشام حسین نے بڑی خوبی سے کلکتہ اور غالب کے ذاتی تعلق پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

”تاج محل اور لال قلعے کی عمارتوں کے لاشریک حسن کی یکتائی اور بے ہنگمی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں۔ بادشاہی دور کے آخری شاعر کی زکاوت ذہن ایک نئے جمہوری فن تعمیر کی زیبائش اور پوری شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔۔۔ اس نیم فرنگی، نیم ایشیائی شہر میں مشرقی اور مغربی معاشرت کا عجیب احتراش نظر آتا تھا انگریز اگر عطر الاپتگی اور پان کے استعمال سے بے خبر نہ تھے۔ تو ہندوستانی بھی دھکی اور اولڈ ٹام سے مانوس ہوتے جاتے تھے“

(احتشام حسین خان، ”غالب کا فکر“)

غالب کلکتہ سے جو خیالات اور تصورات اپنے ساتھ واپس لائے۔ وہ ان کے دلی کے

حریفوں اور ہم عصروں کے ”سرحد اوراک“ سے باہر تھے۔ غالب نے اس سفر میں نہ صرف ایک نئے طرز حکومت اور طرز سلطنت سے واقفیت حاصل کی۔ بلکہ سید احتشام حسین خان کے مطابق وہ سائنس کی حیرت زانیوں اور برکتوں کا بھی اندازہ کر چکے تھے۔ اس ضمن میں سید احتشام حسین خان کہتے ہیں:-

”غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی۔ ان سے یہ مطالبہ فضول ہے کہ انہوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی۔ محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے کچھ کیوں نہیں لکھا۔ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے بدلتے زمانے کو کس نظر سے دیکھا۔ اس وقت کتنے شاعر تھے۔ جو اسٹیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی کا نام جانتے تھے۔ غالب نے آئین اکبری کے مقابلے میں اس نظام کو سراہا جو سائنس کی ان برکتوں سے مالا مال کر سکتا تھا۔“

(سید احتشام حسین ”غالب کا فکر“)

کچھ ہمارے نابعد عصر غالب کی اپنی ذہنی آماج اور کچھ کلکتہ میں دو سالہ قیام کے دوران جدید سائنس کے تعارفی دور کے احساس نے لکرائے کلام میں جا بجا ایسے اشعار کا روپ دھارا جس سے انکے سائنسی تخیل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اہل علم اس شعر کے روحانی، صوفیانہ اور نہ جانے کس کس زاویے سے توضیح کرتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا محرک غالب کے ذہن میں کائنات کے وجود میں آنے اور دوبارہ فنا ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گو کہ جدید سائنس کی The Big Bang تصوری غالب سے بہت عرصہ بعد پیش کی گئی۔ ہمیں غالب کے اس شعر میں یہ تصوری پوری آب و تاب کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہے پہلے مادے کا شیرازہ بکھرا اور ان اجزائے پریشان سے زمین اور دوسرے اجرام فلکی وجود میں آئے۔ قیامت میں یہ سب کچھ بھی تباہ ہو جائے گا اس جہاں کی طرف بڑھنے کے عمل کو غالب نے کس فراست اور چابکدستی سے جادہ راہ فنا سے تعبیر کیا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

اے کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

جب غالب کے دور کے دوسرے شعراء کا کلام صنف نازک کے ناز و ادا سے مغلوب نظر آتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام میں سائنسی استقام کا یہ نمونہ ایک عجیب تاثر دیتا ہے۔ غالب جاننا چاہتے ہیں کہ سبزہ و گل کیا ہیں کہاں سے اور کیسے آئے۔ پھر دوسرے مصرعے میں خودی بالواسطہ طریقے سے اس سوال کا جواب دے دیتے ہیں۔ یعنی آسمان سے ابر برسائے زمین کو آباد کیا۔ اور ہوانے اس زمین میں سبزہ و گل کی پیدائش و افزائش میں مدد دی۔ غالب اگلے شعر میں ابر بننے کے عمل کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:-

ضعف سے گر یہ مہل بہ دم سرد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ذیل میں دیئے گئے شعر میں غالب ہموکا اپنے سائنسی تخیل کی بھول بھیلوں میں یوں لاکھنچتے ہیں:-

تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوئے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ہم غالب کو آئن سٹائن کا پیش رو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اینٹم اور اسکی کارفرمائوں کا علم غالب کو بھی تھا۔ یہ نیوٹرانز کی بے قراری نہیں تو اور کیا ہے:-

بے پردہ سوئے وادی بختوں گذر نہ کر

ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

یوں لگتا ہے کہ غالب نے اس قبیل کے اکثر اشعار کے پہلے مصرعے میں اشاروں سے کام لینے پر اکتفا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں کھل کر سائنس سے متعلق بات کی ہے۔ گو کہ ان تمام اشعار کو بھی خوشحال کے اسی قسم کے اشعار کیساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ مگر آگے جو اشعار آتے ہیں انکا موازنہ خوشحال کے دیئے گئے اشعار سے کرنا سودمند ہو سکتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب بھی کوئی کم تر جغرافیہ دان ماہر فلکیات اور ماہر موسمیات نہ تھے۔

ہے تجلی تری سامان وجود

ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کچھ نہ کی اپنے جنون مار سانسے ورنہ یاں
ذره ذره روکش خورشید عالم تاب تھا

چہرے کے ہے شبنم آئینہ برگ گل پہ آب
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا قبول

•

اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ باز گر کھلا

ہیں زوال آواہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار پادیاں

دخم گردب گیا لہو نہ تھا
کام گر رک گیا روانہ ہوا

فرانسیسی سائنسدان پاسکل نے روانی خون کی تیوری غالب سے برسوں بعد پیش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ غالب کو انسانی رگوں میں روانی خون اسکے رکنے اور جاری ہو جانے کے مضمرات سے بخوبی آگاہی تھی۔

خوشحال کی طرح غالب بھی تاریخ نویس تھا۔ اس نے مہر نیمروز اور دشتبولکھ کراپنے تاریخ نویس ہونے کا بین ثبوت دیا ہے۔ چونکہ تاریخ نویسی بھی سائنسی اصولوں کے تحت کی جاتی ہے اس لیے اس فن کو خوشحال اور غالب کی سائنسی علییت ہی گردانا جائے گا۔

موازنہ

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ خوشحال و غالب دونوں کے کلام میں جابجا سائنسی تخیل کی کارفرمائی محسوس کی جاسکتی ہے جس سے ان دونوں شخصیتوں کے ماہر عصر ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

خوشحال و غالب کا فلسفہ غم

خوشحال کا فلسفہ غم

”یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک جوانمرد صاحب کمال اور خود آگاہ شخص کی شخصیت کی بلندی اور ترقی کا راز فتنوں اور امتحانوں میں مضمر ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنی عالی فطرتی کے بل بوتے پر خارجی شر اور مصیبت کو خیر اور برکت میں بدل دیتا ہے۔ خوشحال خان بابا کے نزدیک غم، مصیبت، تکلیف اور شر ایک انسان کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کی ایک کسوٹی ہے“

(دوست محمد خان کمال مرحوم ”خوشحال مطالعہ ص ۸۰“)

ہمارے عظیم شاعر خوشحال کا فلسفہ غم انکی رجائیت سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ یہاں غموں سے مراد وہ غم ہیں جو اولوالعزم لوگوں کو مہمات عظیم سر کرتے وقت پیش آتے ہیں۔ اور جو انکو

زندگی کی ذکر پر آگے بڑھنے میں ہمیں زکا کا مہ دیتے ہیں۔ خوشحال اپنی بے شور زندگی کے متعلق خود فرماتے ہیں:-

”مجھ سے ابھی ایک شور رخصت نہیں ہوا ہوتا کہ دوسرا شور مجھے آ لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں شور و شر کے دن پیدا ہوا ہوں“

جس بچے پر آٹھ سال کی عمر میں مکان کا چھپر آگرے اور وہ اسکے نتیجے میں چند دن بے ہوش رہے۔ جو ۱۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسفزیوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہو جائے۔ جسے جوان ہونے پر ۱۸ برس کی عمر میں عین اپنی شادی کے دن سخت بخار آگھیرے جو بارہویں دن چاکر ٹوٹے۔ جسے ۲۸ برس کی عمر میں جیم ہو جانا پڑے اور اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالنی پڑے۔ جو پچاس برس کی عمر تک یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرتے ہوئے مغل بادشاہوں کے لیے تلخ بدخشاں اور کانگرہ (قلعہ تارہ گڑھ) کی مہمات میں حصہ لیتا رہا ہو۔ جسے ۵۱ برس کی عمر میں مغل گورنر کابل کی ایک سازش کے تحت گرفتار کر کے پاپہ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا ہو۔ اور پانچ برس تک قید و نظر بند رکھا گیا ہو۔ جس دوران میں اسکے اہل خاندان اور قبیلے کو بے انتہا تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جس نے قید و بند سے آزادی کے بعد مغل تاجدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے چند معرکوں میں مغل فوج کو پے درپے شکستوں سے دوچار کیا ہو۔ جس کے خلاف مغلوں کے اکسانے پر اسکے اپنے بیٹے آٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور آخر کار انکے ہاتھوں زنج ہو کر جلا وطنی پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ جس کو آخری داؤد کے طور پر پشتون قبائل کو مغلوں کے خلاف متحد

کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہوا ہو۔ اور ان تمام مصائب پر مستزاد اس نے اپنی زبان کے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہو تو وہ خوشحال خان خلک ہو گا۔ خوشحال اپنے بار غم پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”خوشحال کا بار غم اگر پہاڑ پر ڈالو تو وہ بھی بال جیسا پارک ہو جائے“

اپنے نصیب کو دوش دینے کی بجائے خوشحال بابا ایک نیا ڈھنگ اختیار کرتے ہوئے غم ہی کو اپنی مصیبتوں کا دوش دیتے ہیں:-

”اے غم ادنیٰ میں تیرے لائق کوئی اور بھی ہے۔ یا تم بس خوشحال ہی کے بن کر رہ گئے ہو“

غم کے ساتھ انسان کا دو ہر ارشتہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو انسان کو بنیادی طور پر غم کی انفرادی حیثیت اور اسکے ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، کو یا غم کی موجودگی کے احساس کے ساتھ زندگی کے گزارنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ہر انسان کو اپنی اپنی جبلت، فطرت اور حواس کے مطابق غم کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا تو غم کو غم کے طور پر من و عن تسلیم کر لیا جاتا ہے یا اس کے سامنے سینہ تان کر اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یا پھر رجائیت کے اسلحہ سے لیس ہو کر غم کو مار بھگا یا جاتا ہے۔ خوشحال بابا نے غم کا مقابلہ سینہ تان کر بھی کیا اور اس کے خلاف رجائیت کا اسلحہ بھی استعمال کیا اس سلسلے میں خوشحال کے کہے ہوئے چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

”اس دنیا میں بانٹ بانٹ کی باتیں ہیں اور جگہ جگہ لشکر پڑے ہوئے

ہیں۔ لیکن میرا دل بڑ سکون ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا۔ پہاڑ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”اے خوشحال پہاڑ کا چہرہ سورج کی گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا ہوا جو وہ کچھ دنوں کے لیے برف سے منجمد ہو جائے“

”خدا نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ غم مرد اور نامرد میں تیز کرنے کی کسوٹی ہے۔“

”اس دنیا میں وہی جوان (بہادر) کہلانے کے لائق ہیں۔ جو سختی اور مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہونا جانتے ہوں۔“

خوشحال نے ہمیشہ غم کو گلے لگایا اور پچھاڑ دیا۔ اس کے نزدیک انسان میں غموں کو گلے لگانے اور پچھاڑنے کی خاصیت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ غیرت مند اور باہمت ہو۔ اسی لیے خوشحال نے اپنے کلام میں ہمت کو اپنانے پر بہت زور دیا ہے فرماتے ہیں:-

”اگر آسمان تمہیں شیر کے منہ میں بھی دے دے تو وہاں بھی اپنی ہمت کو قائم رکھ“

”مرد وہ اچھا جو باہمت اور باہرکت ہو۔ اور دنیا کے ساتھ اچھے بُرے وقت میں زندہ رہ سکے“

”بلند ہمت انسان اوپر ہی اوپر ترقی کرتا جاتا ہے۔ پست ہمتی انسان کو پاتال میں کرا دیتی ہے“

خوشحال کا فلسفہ راجائیت کی طرف مائل ہے۔ بڑے سے بڑا غم بھی انہیں شکست خوردہ نہیں

کر سکتا۔ وہ مصیبتوں کے درمیان رہ کر بچنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ جناب میر عبد الصمد خان اس حقیقت کا ثبوت خوشحال کے کلام کی روشنی میں ذیل کے اشعار سے دیتے ہیں:-

”مسرت اور شادمانی کے دنوں میں تو ہر شخص کا دل پُر سکون اور مسرور ہوتا ہے۔ لیکن (اصل) دل وہ ہوتا ہے جو ایام غم میں مردانہ اور شیر ہو۔“

”ہر شام کے بعد صبح ہوتی ہے۔ جو ٹمکن ہو گئے وہ بالآخر مسرور و شادمان بھی ہو گئے“

”اگر میں منحوس ستارے کی گردش میں آ گیا ہوں تو کیا ہوا۔ ہلال بھی تو کبھی کبھی گہنا جاتا ہے“

”خدا مجھے دنیا میں بے غم نہ کرے۔ غم اور خوشحال تو آپس میں دیرینہ دوست ہیں۔“

”میرا دل پُر سکون ہے۔ کیونکہ غم اور خوشی دونوں گزر جانے والی چیزیں ہیں“

(میر عبد الصمد خان ”رجائیت پسند خوشحال“)

خوشحال کے کلام میں غم کے سلسلے کا ایک عجیب شعر وارد ہوا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس سے ضرور لطف اندوز ہوں:-

”ناکھوں کے حڑے ہیں کہ انہیں غم و اندہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں جو بھی غم ہیں ہوشیاروں اور عقلمندوں کے لیے ہیں۔“

غالب کا فلسفہ غم

”غالب کی ساری زندگی بلاشبہ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ عمر بھر بے اطمینانی کے شدید احساس سے دوچار رہے۔ ان کے سامنے غم کا ایک پہلو دار تصور سن شعور سے لیکر زیست کے آخری لمحوں تک موجود رہا۔ غم تنہائی، غم عشق، غم بے مہرئی احباب، غم ستم ہائے روزگار، غرض انہیں ہر دیکھنے اور ہر رنج اٹھانے کی توفیق ملی۔

غم درحقیقت فن کار کی تخلیقی قوت کے لئے بہت بڑا محرک بن جاتا ہے لیکن اس بے اطمینانی کو بعض فنکار اپنی ذات پر اس قدر طاری کر لیتے ہیں کہ اس سے مغلوب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن غالب ہر ایسی انقلابیت کی بجائے ایک اثباتی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے فن میں ان کے ذاتی رجحانات سے آخری حد تک ہم آہنگی موجود ہے۔ ان کے لب و لہجہ کی تندگی اس نشاط آرزو کی پیداوار ہے جو لذت و درد و غم کے نتیجہ میں انہیں حاصل ہوئی۔“

(صبح اللہ قریشی ”غالب اور غم دوران“)

ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں کہ غالب نے زندگی کی حسرتوں میں تابناکی ڈھونڈی ہے۔ ناکامیوں کے باوجود آرزو مند کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور غم انہیں اپنے دور کی فکر

سے علیحدہ اور ممتاز کرتا ہے:-

”درد و غم کی طرف بھی رویہ ہے جو غالب کو جدید ذہن کے لیے قابل قبول بناتا ہے۔ غالب غم آشنا ہیں لیکن غم پرست نہیں۔ وہ آرزو کرتا جانتے ہیں۔ اور اپنی دور روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار بھی پورے درد و غم کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے تھک کر نہ وہ دنیا اور اس کی آرزو ترک کر سکتے ہیں اور نہ ذہن کو غم پرستی کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ نہ آتش ہیں نہ میر، غم کی یہ سرمستی اور جان نوازی غالب کے کلام کا بنیادی نغمہ ہے۔ غالب نے اس رویہ کو خود اس طرح کیجا کر دیا ہے:-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(ڈاکٹر محمد حسن۔ ”غالب کا تصور غم“)

غالب کو بچپن میں جو آسائشیں میسر تھیں۔ وہ انہیں تا عمر چاہئیں تھیں مگر حالات نے انہیں یہ آسائشیں تو میسر نہیں کیں مگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر انہیں معاشی تک و دو میں گرفتار کر دیا مگر ان کی فطری عالی ہمتی نے اسے زندگی کرنے کا حصہ جانا اور اپنی ذکر پر خوشدلی سے آگے بڑھتے رہے:-

”عام زندگی میں غالب کو اتنے مصائب اور مصدمات سے دوچار ہونا پڑا کہ انکی قوت برداشت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ وہ مصائب کو خند و استہزاء میں اڑ دینے کے قابل ہو گیا

تھا۔ اس سے اس کا وہ فلسفہ حیات مرتب ہوا جس کے مطابق درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوا بن جاتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کی آساں ہو گئیں

بعض دوسرے ادباء کے نزدیک غالب غالب حوادث زمانہ سے بُری طرح متاثر ہو کر پورے سنسار کو دکھیا تصور کر لیتے ہیں۔ گو کہ وہ غم کا خوگر ہو کر اسے اپنے اوپر طاری کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ذیل کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے:-

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی در ماندگی میں تالے سے دو چار ہے

غالب کے تصور غم، فلسفہ غم اور قنوطیت کا مطالعہ کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان کے تعزل میں نہ یہ کہ شوقی کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ بلکہ انہیں اس شوقی کلام کی وجہ سے حیوان ظریف کا درجہ بھی عطا کیا گیا۔ یہ سب غالب کی فنکاری اور جدتِ ادا سے ہی ممکن ہوا۔ آئیے اس ضمن میں چند آراء ملاحظہ کریں:-

”غالب کی شاعری کی ساری فضا پہ انہی حزیں ارقسامات اور غمگین ارتعاشات کی دیز چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس چادر کو آپ جب بھی کبھی اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ غالب کے لب چاہے کتنے ہی آشنائے خندہ کیوں نہ نظر آئیں لیکن اس کا دل ہمیشہ محیط

گریہ ہی دکھائی دے گا۔۔۔۔ غالب کا کلام ایسے جواہر پاروں سے
 بھرا پڑا ہے جن کی چمک دمک رہتی دنیا تک مانع نہیں ہو سکتی :-
 غنچہ لگا پھر کھلے آج ہم نے اپنا دل
 خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
 ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
 ایک مرگ ناگہانی اور ہے “

۷

(شریف رزمی ”غالب اور قنوطیت“)

اسکے برعکس جب حالی نے اپنے استاد محترم یعنی غالب کو حیوان ظریف لکھا تو گویا ہمیں
 غالب کی فطرت کے راز سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسن فاروقی کا خیال
 ہے۔

”غالب کو نہ معلوم کیا کیا کہا گیا ہے۔ مگر سب غلط۔ وہ حیوان ظریف
 کے سوا اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ ان کو مفکر، الیہ نگار، غزل خواں، مدح سرا،
 تنقید نگار اور نہ معلوم کیا کچھ ثابت کیا گیا۔ وہ یہ سب ہیں مگر یہ سب
 باتیں ان کی ظریف حیوانیت کا حصہ ہیں۔ وہ مکمل حیوان ظریف ہیں
 جو اپنی غرافت میں تمام کائنات کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے جذباتی
 تاثرات کو لے لیتے ہیں۔“

آگے چلکر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :-

”میتھیج آرٹلڈ نے ٹیکسپیر کے بابت جو دقیق ترین تنقیدی بات کہی ہے۔ وہ یہ ہے: Thou Smiles and Art Still تو مسکراتا ہے اور خاموش ہے۔ یہ بنیادی مسکراہٹ ہی ٹیکسپیر کی ہر تخلیق کی جان ہے اور یہی غالب کے ہر شعر میں موجود ہے۔ غالب کا ادراک بھی آفاقی ہے۔ جس میں دردناک سے دردناک بات کے پس منظر میں بھی ایک گفتگو ہے جو درد کے پیچھے ایک عجیب دائمی مسکراہٹ کو چھپا ہوا دکھاتی ہے۔“

(ڈاکٹر احسن فاروقی ”حیوان ظریف“)

غالب نے اپنے ایک شعر میں قدرت سے بظاہر ایک گلہ کیا ہے مگر اس میں چھپی ہوئی غالب کی طرافت ہم سے چھپ نہیں سکتی:-

میری قسمت میں غم مگر اتنا تھا

دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

غالب کے فلسفہ غم پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گویا حرف آخر کے طور پر فرمایا ہے:-

”یوں غالب کی شخصیت میں بڑا غم ہے۔ زندگی سے ان کے

جو تکانے تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ انہوں نے جس بات کی تمنا

کی تھی وہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ ان کے ارمان اگرچہ بہت

بھلے ہیں لیکن پھر بھی کم بھلے ہیں۔ ان کے دل میں حسرت ہستی کا

داغ ہے اور اس صورت حال کو انہوں نے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔ کیونکہ ان کا دل غم کھانے میں بہت بڑا ہے۔ لیکن داغ حسرت ہستی سے پیدا ہونے والے غم اور غم کی کام کی کمی سے پیدا ہونے والے درنج نے ان کے یہاں اداسی کی تاریکی پیدا نہیں کی ہے۔ اس اداسی کے باوجود ان کے یہاں روشنی کا احساس ہوتا ہے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر سکتے ہیں مسکرا سکتے ہیں۔ وہ روتے ہیں لیکن انہیں رونا نہیں آتا۔ اسی لئے وہ رونے میں بھی جنتے ہیں۔ انہیں جسنے پر رونا نہیں رونے پر ہنسنا ضرور آتا ہے۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس سماجی تہذیب اور فکری ماحول کی پیدا کردہ ہے۔ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق و شعور کا نشوونما ہوا۔

(ڈاکٹر عبادت بریلوی ”غالب کے تغزل میں شوخی کا پہلو“)

مگر کیا سمجھئے کہ غالب کی نوک خامہ سے یہ شعر بھی نکلا ہے:-

غم نہیں ہوتا ہے آراؤں کو پیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

موازنہ

خوشحال و غالب ہر دو کے کلام میں دوایسے اشعار وارد ہوئے ہیں جو ان نابجہ شعراء کے تصورات غم کو صاف طور پر سامنے لاتے ہیں اور ان کا فرق اجاگر ہو جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے کہا:-

کہ آسمان د مژکھی خله و بلہ و وری

د خوشحال خاطر بہ نہ وی بی سرورہ

ترجمہ:- ”اگر آسمان اور زمین باہم بیست ہو جائیں تو بھی خوشحال کا دل مسرت سے تہی نہ ہوگا۔“

وہاں غالب حوادث کا مقابلہ اس طور کرتے ہیں:-

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

خدا نے ہم کو دیا ہے وہ دل کہ شاد نہیں

لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو جہاں خوشحال اپنے غموں کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں غالب بھی غم سے شکست نہیں کھاتے اور اپنے غم و اندوہ کو مزاج و ظرافت کی ڈھال سے روکتے ہیں۔ یوں یہ دونوں اپنے اپنے طور پر غم و دواں کا مقابلہ کرتے رہے۔

خوشحال وغالب کی نثر

اگر خوشحال جدید پشتو نثر کے بانی ہیں تو غالب جدید اردو نثر کے بانی ہیں۔ آئیے ان دونوں کی نثر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

خوشحال کی نثر

خوشحال سے پہلے پشتو ادب میں نثر کی چند ہی تحریروں موجود تھیں۔ پشتو کے اولین نثر نگار ابو عمر ہاشم (۱۲۲۳ھ تا ۱۲۹۷ھ) تھے۔ جس نے ایک نثری کتاب ”ذسالو وچ مہ“ کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کی نثر پر عربی کا اثر نمایاں تھا۔ کیونکہ یہ عربی شاعری کی فصاحت و بلاغت سے متعلق تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

ابو محمد ہاشم کے بعد جس پشتو نثر نگار کا نام سامنے آتا ہے وہ قندھار کا سلیمان ماکو ہے۔ جس نے ۱۲۱۶ھ میں تذکرۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب پشتو نثر میں لکھی۔ یہ کتاب پشتو نثر کے اولیاء اور شعراء کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ افغان محقق صدیق اللہ رشتین کے مطابق یہ کتاب پشتو زبان کی پہلی نثری کتاب ہے۔

سلیمان ماکو کے تقریباً دو صدیوں بعد ۱۸۲۰ھ میں مشہور یوسٹری شخصیت شیخ علی

نے دفتر شیخ ملی کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی جس میں زمین کے بندوبست کی تفصیل اور ہدایات دی گئی ہیں۔

شیخ ملی کے بعد ایک دوسرے یوسٹو کی ادیب کچو خان رانی زئی نے ۹۰۰ھ میں تاریخ کچو خان کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جس میں اس نے پشتونوں کی تاریخ اور حالات لکھے ہیں۔

اس کے بعد ۸۷۹ھ میں بایزید انصاری نے خیرالبیان کے نام سے ایک نثری کتاب چھوڑی ہے جس کا موضوع مذہب تھا۔ اس کتاب کے جواب میں ایک اور عالم حضرت اخوان درویش نے بایزید انصاری کے خیرالبیان میں دیئے گئے مذہبی عقائد کو جھٹلانے کے لئے ۱۰۱۵ھ میں مخزن اسلام کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جناب خاطر غزنوی ان دونوں کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

”خیرالبیان اور مخزن دونوں کتابوں کی نثر سچ اور منطقی ہے“

(خاطر غزنوی ”خوشحال نامہ“)

خیرالبیان اور مخزن کے بعد ۱۰۷۶ھ میں خوشحال خان کی نثری کتاب دستار نامہ منظر عام پر آئی۔ جسکی نثر خیرالبیان اور مخزن کی نثر کے مقابلہ میں غیر سنجیدہ اور سادہ تھی۔ دستار نامہ سے جدید پشتو نثر کا آغاز ہوا۔ میاں سید رسول رسا کے مطابق (پشتو میں) دستار نامہ کی نثر سے بہتر نثر کسی نے نہیں لکھی۔

خوشحال بابا نے اس کتاب کے لکھنے کی وجہ اور مقصد کو کتاب کے شروع میں یوں بیان کیا

ہے:-

ترجمہ:- اس انشاء اور املا کا بانی کہ اس تصنیف کے لکھنے کا باعث ہوا یہ شعر ہے:-

دستار باندھنے والے تو ہزاروں ہوتے ہیں

لیکن صاحب دستار چند ایک ہی ہوتے ہیں

یہ شعر فراق نامہ میں وارد ہوا ہے۔ اس شعر کی دو بحریں اور دو قافیے

ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ایک ایسا مختصر رسالہ لکھوں جس کی عبارت

رواں ہو۔ قریب الفہم ہو۔ نام دستار نامہ اس شعر کے معنی کی نسبت

سے رکھوں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس مشغلے کے ذریعے اپنی فکر کو خرچ

کروں اور یوں اپنی دلگیری کو دفع کروں اور یہ کہ اس کے لکھنے سے

کسی کا فائدہ ہو جائے ان اسباب نے میرا ارادہ اس کتاب کو لکھنے

کے لیے مبہم کیا۔

اس کتاب میں خوشحال خان نے یہ بتایا ہے کہ ایک قوی رہنما کو کن صفات کا حامل ہونا

چاہیے۔ دستار نامہ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں پشاور سے اور ۱۹۶۶ء میں کابل سے شائع ہوئی۔

قیام الدین خادم نے بھی دستار نامہ چھپوایا۔ دستار نامہ کا اردو ترجمہ جناب خاطر غزنوی نے

کیا اور ۱۹۸۰ء میں پشتوا کیڈمی نے شائع کیا۔

محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۰۷۱ھ بمطابق ۱۶۶۵ء میں لکھی

گئی۔ محترمہ بی بی مریم نے لکھا ہے کہ محترمہ خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی

زندگی پر اپنے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ) کے مقالہ میں دستار نامہ کی تکمیل کا سال ۱۶۸۵ء بتایا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ محمد زبیر حسرت آگے چل کر کہتے ہیں:-

”پشتون نثری ادب میں اس کتاب کو پہلی جدید نثری کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسے خوشحال خان نے رتھنپور میں اپنی اسیری کے دوران لکھا۔ اور یہ کہ اس کتاب کو لکھنے کے دوران خوشحال بابا کے پاس نہ تو مطالعہ کے لیے کوئی کتب موجود تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرے ذرائع میسر تھے۔ خوشحال خان تنگ خود اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے پچھلے مطالعہ اور اپنی غلیٹ کے زور پر لکھی ہے“

(محمد زبیر حسرت ”دخوشحال نامے“)

جناب خاطر غزنوی مترجم دستار نامہ اس کتاب کی افادیت اور نثری محاسن پر یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال نے اپنی کتاب میں لائق دستار کے لفظ پر پوری توجہ دی ہے اور دو ابواب میں سرداری کی صفات کی نشاندہی کی ہے۔۔۔۔۔ اپنی افادیت کے لحاظ سے دستار نامہ کو افلاطون کی کتاب جمہوریہ، شیخ سعدی کی گلستان سعدی، امیر کیکاؤس بن سکندر قابوس کی قابوس نامہ اور میکاؤلی کی شہرہ آفاق کتاب The Prince (شہزادہ) کے

مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ مگر دستار نامہ ایک الگ رجحان اور مختلف نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ خوشحال خان نے بیس خصلتوں کو تفصیل سے بیان کر کے بادشاہوں اور سرداروں کو اخلاقی بلند یوں کا راستہ دکھایا ہے۔ اپنے موضوع کی رفعت و وسعت اور آفاقیت کے ساتھ ساتھ دستار نامہ پشتو نثر کا نادر اولین نمونہ ہے۔ اس کی نثر سادہ اور رواں ہے جبکہ اس سے بیشتر بایزید انصاری اور آخون درویش کی تصنیفات مسجع، مقفی اور گجنگ عبارت کی حامل ہیں۔ یوں ہم دستار نامہ کو پشتو کی جدید نثر کا اولین حسین نقش کہہ سکتے ہیں۔ اس انداز نے آئندہ پشتو نثر پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور پشتو ادب کے دامن کو ایسے جواہر پاروں سے نوازا۔“

(خاطر غزنوی ”خوشحال نامہ“)

خوشحال کی پشتو نثر سے متعلق چند دوسرے شعراء وادباء کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

”خوشحال خان خٹک نے نثر میں دو تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک ان کی بیاض یا روز نامہ ہے تھا جس کا کچھ حصہ خوشحال خان کے پوتے افضل خان خٹک نے اپنی کتاب تاریخ مرصع میں شامل کیا ہے۔ مگر باقی (روز نامہ) اب دستیاب نہیں دوسری تصنیف دستار نامہ ہے“

(ڈاکٹر خالد خٹک ”خوشحال نامہ ۱۹۸۰ء“ ص ۲۱۸)

”خوشحال بابا کی گفتار اور کردار کی تعریف اور اعتراف ہر وہ شخص کرے گا۔ جس نے دستار نامہ میں دیئے ہیں ہنر اور فنِ خصال کا مطالعہ گہری فکر و نظر کیساتھ کیا ہو“

(روحانِ یوسفی، ”تاریخ اکویر - دسمبر ۲۰۰۱ء“ ص ۱۹۷)

پروفیسر محمد قاسم مظہر اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

”گوکہ خوشحال نثر میں عربی قاری سے متاثر ہے۔ اور مسیح و منقحی تحریر کو اس وقت کے رواج کے مطابق بہتر سمجھا ہے۔ لیکن اس کی نثر ایسی نہیں کہ اس پر ”ہلینک ورس“ کا گمان کیا جاسکے۔ خوشحال نے اپنے بعد آنے والوں کو سادگی سے لکھنے کی راہ سنجائی۔ یعنی ایک Pioneer کا کردار ادا کیا ہے“

(پروفیسر محمد قاسم مظہر ”خوشحال مطالعہ“)

”خوشحال جدید پشتو نثر کا بانی ہے اس نے پشتو نثر کو نیا موڑ دیا۔ اسے منقحی مسیح و تکلفات سے چھڑا کر بے تکلف، سادہ اور عام فہم اسلوب دیا۔ اور اس طرح اس پر ترویج و ترقی کے راستے کھول دیئے“

(فارغ بخاری رضا ہدانی، ”خوشحال خان خٹک“ مطبوعہ لوک ورثہ اسلام آباد ص ۱۵)

”خانِ عظیم مکان کی نثر پشتو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے وہ پہلا افغان ادیب ہے جس نے پشتو نثر کو بڑی حد تک

غیر ضروری تکلفات اور عربی فارسی کے نامانوس الفاظ سے آزاد کیا
اور عام پشتو انداز گفتگو اور روزمرہ محاورہ کے بالکل قریب لے آیا۔

(دوست محمد خان کامل مرحوم۔)

آخر میں دستار نامہ کے آغاز کا ذکر خوشحال خان کے الفاظ میں بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔
جناب خاطر غرض نوی مترجم دستار نامہ نے انہیں پشتو سے اردو میں یوں ترجمہ کیا ہے:-
”معلوم ہونا چاہیے کہ سر پر دستار باندھنے کا مطلب نمود و نمائش نہیں۔
دستار آدمی کی حیا اور عزت کا نشان ہے۔ مرد کی حیا تمام تر دستار میں ہے۔
دستار کی اہلیت ان خصائل اور فنون پر موقوف ہے جن کے عدم حصول کی
صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ہنر، پیشے، فنون، صنعت و حرفت، عادات و
خصائل بے حد بے شمار ہیں۔ ان کا احاطہ کرنے کے لئے عمر نوج درکار
ہے۔ ان کا حصول تصور سے بعید لیکن پھر بھی جس قدر ان کی تحصیل سے
انسان اہل کہلا سکے ان کا حصول لازمی ہے۔ اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو ایسے
شخص کو نا اہل قرار دیا جائے گا۔ وہ لائق دستار نہیں گردانا جائے گا۔“

اس مضمون کو ہم اس نوٹ پر ختم کرتے ہیں کہ خوشحال بابا نے فارسی نثر میں کوئی قابل ذکر
تحریر نہیں چھوڑی گو کہ صرف ان کا فارسی شعری کلام ہم تک پہنچا ہے۔

غالب کی نثر

اپنی فارسی نثر اور شاعری کو اپنی اردو نثر اور شاعری سے بہتر سمجھنے والے غالب کو انکی اردو نثر اور شاعری نے ہی شہرت و وام بخشی۔ غالب صرف اردو شاعری میں ہی اعلیٰ مقام نہیں رکھتے بلکہ اردو نثر میں بھی صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انکی جدت پسندی نے ان کے خطوط کو مراسلے سے مکالمہ بنا دیا۔ طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:-

”غالب کے زمانے تک اردو نثر نے ترقی کی دو بڑی منزلیں طے کی تھیں۔ ایک ملاوچی سے فورٹ ولیم کالج تک اور دوسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ جب مرزا غالب نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے ایک وہ پُر تکلف انداز جو فارسی انشا پر وازی کے نتیجے میں اردو میں رواج پا چکا تھا۔ دوسرا سادہ اور سلیس طریقہ جس کو فورٹ ولیم کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔ مرزا غالب نے ان دونوں طرزوں کے استخراج سے نثر نگاری کی ایک نئی طرز ایجاد کی“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو نثر“)

فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو نثر میں جو پر تکلف انداز اپنایا جاتا تھا اس میں واقعیت اور اصیلت سے زیادہ شاعرانہ رنگ کی بہتات ہوتی پُر شکوہ الفاظ کو انکے معانی پر ترجیح دی جاتی۔ مقصدیت کا عنصر کم ہوتا اور اس کے مقابلے میں عبارت کی آرائش اور زیبائش پر زیادہ دھیان دیا جاتا۔ فورٹ ولیم سے پہلے کے اردو کے دو بڑے نثری کارنامے ملا وجہی کی سب رس اور قسین کی نو طرز مرصع اسی طرز انشا کی حامل کتابیں ہیں۔

جہاں تک سادہ اور سلیس اردو نثر کا تعلق ہے تو اس کی تحریک اور ترقی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مرحون منت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد انگریزوں کو اردو سکھانے کی غرض سے رکھی گئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے نمائندے میرامن دہلوی، حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس تھے۔ ان اویوں نے اردو نثر میں فارسی اور عربی ترکیبوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ مگر انکی تحریروں میں بھی مسجع نگاری (یعنی قافیہ بندی جس سے نثر پر نظم کا گمان ہو) موجود تھی۔ اس دور کی نمائندہ کتاب کے طور پر میرامن کی ”بارغ و بہار“ کو رکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:-

”فورٹ ولیم سے غالب تک کے عرصے میں فورٹ ولیم کے طرز کی سادہ اردو نثر کو عوام میں قبولیت نہ ملی کیونکہ یہ تحریک کلکتہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ جو اردو کے دوسرے دو دبستانوں یعنی دہلی اور لکھنؤ سے دور واقع تھا۔ لکھنؤ کے ادبی دبستان میں ان دنوں تکلف اور طعمراتی سے

کام لیا جاتا اسلئے اس کے سامنے فورٹ ولیم کی سادگی اور سلاست کا چراغ نہ جل سکا۔ رجب علی بیگ سرور کی ”فسانہ عجائب“ اس دور کی نمائندہ تحریر ہے۔ جس میں اس دور کا پُر تکلف طرز موجود ہے۔ فسانہ عجائب ”سادگی“ کی تحریک کے خلاف ایک ایسا احتجاج ہے جو مرغوب کن ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوا۔

ان حالات میں غالب نے اردو خطوط نوئیسی کو ایک ایسے اسلوب سے روشناس کیا جس میں قدیم پر تکلف انداز اور فورٹ ولیم کالج کی سادہ نگاری کو یکجا کر دیا گیا۔ سادگی بول چال کی بے تکلفی نثر کی ضرورتوں کے احساس، مکتوب نوئیسی۔ جزئیات نگاری، جذبات، اثر آفرینی، شوخی، عرفان اور ذومعنی الفاظ کے استعمال جیسے امتیازی خصائص کی وجہ سے غالب کی نثر اردو ادب کے بہترین کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔

”غالب نے اگرچہ اردو شاعری کو نیا رنگ، نیا آہنگ دیا مگر اردو نثر کو انہوں نے ایک معنی میں نئی زندگی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو نثر کی اہمیت فارسی نثر سے زیادہ ہے۔ فارسی میں وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور کہنے مشق استاد ہیں مگر اردو میں وہ جدید نثر کے بانی اور مکتوب نوئیسی کے راہنما ہیں“

(آل احمد سرور ”غالب کی عظمت“)

ڈاکٹر شوکت ہنزدار کی کے مطابق :-

”غالب کی باد بہار طبیعت کی حسن آرائی کا تماشا دیکھنا ہوتا ان کے خطوط پڑھیے۔ خطوط میں اپنے یار دوستوں سے دوستانہ چھیڑ چھاڑ یوں جاری رہتی تھی۔

”سنو میاں سرفراز حسین ہزار برس میں تم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کو پڑھتا ہوں اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کوئی بات ہے مجھ کو کیا پیام ہے کچھ نہیں شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر‘ یارب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تقریر میں القاب میرا پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا یہ کیا سر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں میری بلا لکھیے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

”مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید‘ نہ رنجور ہوں نہ تندرست‘ نہ خوش ہوں نہ ناخوش‘ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جنے جاتا ہوں‘ باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پیتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا‘ شکر ہے نہ شکایت‘ جو تقریر ہے برہنہل حکایت“

غالب اپنے گرد و پیش کا نقشہ اپنے خطوط میں اس طور کھینچتے کہ اپنے مکتوب الیہ کو اپنے

ماحول میں سمجھنے لاتے:-

”کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ بٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا
 بھجرو دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں
 کرنے کو جی چاہیہ باتیں کر لیں“

غالب سے پہلے مکتوب نگار اپنی شخصیت اور سیرت کو چھپانے میں کامیاب رہتے تھے۔
 ڈاکٹر شوکت مینز واری کے مطابق ”غالب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بے باکی کے ساتھ
 اس آئینہ کے سامنے آ کر آنچلی نمایم ہستم کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اس لئے ان کی
 خوبیاں ہی نہیں ان کی برائیاں بھی ہمیں صاف صاف نظر آئیں۔ ان کی توانائیاں ہی نہیں
 ان کی کمزوریاں بھی ہم نے دیکھیں۔“

(ڈاکٹر شوکت مینز واری ”غالب خطوط کے آئینے میں“)

مالک رام نے اپنے مضمون آزاد بنام غالب میں غالب کی اردو نثر کو مولانا محمد حسین آزاد
 کی تنقیدی نظر سے یوں دیکھا ہے:-

”یہاں تک تو نظم کا بیان تھا۔ اب ڈرائنگ کا بھی سن لیجئے۔ جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ
 نئی اردو کا بانی بلکہ موجد غالب ہے۔ اور اردو نے معلیٰ اس دین کی ”ایزدی“ کتاب ہے۔
 مولانا محمد حسین آزاد غالب کے اردو خطوط کے مجموعے اردو نے معلیٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے
 لکھتے ہیں:-

”اس مجموعے کا نام مرزا نے خود اردو نے معلیٰ رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا

سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں یہ علم کی کم روایتی کا سبب ہے چنانچہ (غالب) فرماتے ہیں:-

”اب درنگ ورزی کی تقصیر معاف کیجئے“

”یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے“

مولانا آزاد کے مطابق غالب اردو نثر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے تھے۔ جو اردو کے اہل زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے۔ ان کی اردو سوائے غیر سنجیدہ تحریر کے اور کسی مصرف کی نہیں اور ان کے اردو خطوط عام قاری کے لیے بے مزہ ہیں۔

(مالک رام آزاد بنام غالب آجکل۔ دہلی)

آئیے اب زاویہ بدلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ معروف غالب شناس ڈاکٹر انجاز حسین غالب کی نثر کے متعلق کیا تاثر رکھتے ہیں:-

”غالب کی علمی جولان گاہ سے متصل ایک نیا میدان نظر آتا ہے۔ شعرو

شاعری کے گلستان سے نکل کر وہ نثر کی دنیا میں بھی خراماں خراماں چلتے

ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے مکتوب نگاری کا وہ انداز

پیدا کیا جو عدیم الشال تھا۔ جو شہرت و رفاقت ان کے اردو خطوط

نصیب ہوئی وہ نہایت اہم و ہمہ گیر تھی۔ یہ خطوط اپنی ندرت کی وجہ سے

بہت جلد مقبول ہو گئے۔ یہاں ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہنا صرف یہ ہے کہ ان کے اشعار کی طرح خطوط میں بھی اندرت و جا ذ بیت تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ نثری خدمت شعری کاوش سے بہتر ثابت ہوئی۔۔۔ یہ عجیب بات تھی کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا مشکل پسند ہو وہی شخص نثر کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اتنا اہل پسند و بے تکلف ہو جائے کہ ہر کس و نا کس اس کو بغیر کسی دماغی کاوش کے آسانی سے سمجھ لے۔ انداز بیان دیکھ کر یقین کرنا پڑے کہ کچھ کچھ مرزا نے۔۔۔ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔“

(ڈاکٹر انجاء حسین ”غالب اپنے زمانے میں“)

خطوط غالب کے متعدد مجموعے مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے چھاپے گئے۔ یعنی عمود ہندی ”اردوئے معلیٰ“ ادبی خطوط غالب، مکاتیب غالب، خطوط غالب، نادرات غالب، نادر خطوط غالب اور غالب کی نادر تحریریں۔ ان مجموعوں کی طباعت کا عرصہ غالب کی وفات کے سال ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔

غالب کا بہترین خط - میری نظر میں

یوں تو غالب کے خطوط دلچسپ کھلے لہجہ اور سادگی کی اکمل مثالیں ہیں۔ لیکن وہ جو ہم کہتے ہیں کہ غالب نے فن خطوط نویسی کو مکالمے کا فن بنا دیا ہے۔ تو اس کی بہترین مثال اب تک میری نظر سے گزری وہ اردوئے معلیٰ (مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل پبلشر مجلس ترقی اردو لاہور) میں ص ۳۳۹ پر موجود غالب کا یہ خط ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور خط اٹھائیے:

خط بنام ظہیر الدین خان صاحب

بج شنبہ ۲ نومبر ۱۶۶۵ء *

”اقبال نشان“ حکیم ظہیر الدین احمد خان کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پیونچے۔ کہوں میاں تمہارا مزاج کیسا ہے؟ اور تمہارے بھائی تفضل حسین خاں کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خیر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو بھی میری دعا کہنا۔

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی عافیت کہو۔ اور پوچھو کہ شہاب الدین خان نے اکتوبر مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں؟ کیدار ناتھ ڈیوڑھی پر آکر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا! یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیے۔ دیر نہ کیجیو۔

خط کے جواب کا غالب ’فقیر غالب‘

آخر میں غالب کی اردو نثری طرز تحریر میں سفرِ نصیبی، انسان دوستی اور بے تکلفی کے عناصر کو اجاگر کرنے کی غرض سے ایک خط کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:-

”قلندرِ ری و آ زادگی و ایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاشیٰ ہاتھ میں لوں اور اس میں خطرِ نجی اور ایک ٹہن کا لوٹا معہ سوت کی ری کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا، نہ وہ دستِ گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ کبھی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو دنیا بھوکا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقبوض، خلق کا مردود، پوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگتے وہ میں ہوں۔“

موازنہ

جب ہم خوشحال و غالب جیسی نابہ شخصیتوں کی نثر کا موازنہ کرتے ہیں تو کھلتا ہے کہ دونوں کی نثری کاوشوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب نے خوشحال کی نسبت اپنی نثر میں زیادہ پوٹلمونی دکھائی ہے۔ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو دونوں نے اپنی اپنی زبان کی جدید نثر کی بنیاد رکھی۔

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تصوف کے نظریے کے بنیادی نکات ذہن نشین کر لئے جائیں۔ جب ہم تصوف کی بات کرتے ہیں تو یونانی تصوف، عجمی تصوف یا اسلامی تصوف کی بات کر رہے ہوتے ہیں اور جب عجمی یا اسلامی تصوف پر بات چیت کرتے ہیں تو شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، مجاز، وحدت الوجود اور وحدت الہیہ جیسے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ آپس میں اس طرح سے گڈمڈ ہیں کہ قاری کو ایک پیچیدگی کا احساس دلائے بغیر نہیں رہتے۔ آئیے سب سے پہلے تصوف کے متعلق جانیں۔ ماہر خوشحالیات اور پشتو کے معروف ادیب میاں سید رسول رسا نے اسکی تفصیل یوں دی ہے:-

”افلاطون کو یونانی تصوف کا بابا کہا جاتا ہے افلاطون کا نظریہ امثال اور نظریہ حسن محض عجمی تصوف کی بنیاد ہیں۔ اگرچہ ظاہراً مسئلہ وحدت الوجود عجمی تصوف کی روح نظر آتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ جو دنیا ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے یہ حقیقی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی دنیا کوئی اور ہے۔ وہ عالم امثال کی دنیا ہے اور ہماری دنیا جیسا کہ ہم کو نظر آتی ہے عالم امثال کی دنیا یا حقیقی دنیا کا سایہ یا عکس ہے۔ افلاطون اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ

اگر ایک شخص کسی غار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے اور اسکی پیٹھ پیچھے سے قسمائیں مخلوقات گزریں اور وہ شخص غار کی اندرونی دیوار پر ان مخلوقات کا محض سایہ ہی دیکھ پاتا ہو اور اصلی مخلوقات اسکی نظروں سے اوجھل ہی رہیں۔ تو یہ افلاطون کے نظریہ امثال کا ثبوت ہوگا۔ یا آجکل کے زمانے میں سینما ہال کی مثال لیں۔ آپ ایک پروے کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہیں اور آپکے پیچھے ایک مشین میں سے اصلی تصاویر کو گزار کر روشنی کی شعاعوں کے ذریعے ان کا عکس پروے پر ڈالا جاتا ہے۔ تو آپ اصلی تصاویر نہیں بلکہ ان کا عکس دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ افلاطون کا نظریہ حسن محض یہ تھا کہ جمال حقیقی کی خوبصورتی انسان کو ایک حسین چہرے میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور پھر یہ جمال انسان کو ہر چہرے پر نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ اسے یہ پوری کائنات اس جمال کے نور سے منور نظر آتی ہے۔ افلاطون کے حسن محض کا نظریہ اس پشیمانی میں بند نظر آتا ہے:-

اول خوبن مہی دیار حسن بیا مہی خوبن ہمہ حسین وو
اوس بہ داسہی ثنائے مقیم ہم چہی مہی خوبن دی خیال د حسن
ترہ:- پہلے پہل مجھے یار کا حسن پسند آیا بعد میں تمام حسین اچھے لگنے لگے۔ اور اب میں ایک ایسے مقام پر مقیم ہوں کہ مجھے حسن کا خیال تک بھاتا ہے۔

آگے چلکر میاں سید رسول رسا وحدت الوجود پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:-

”وحدت الوجود کا نظریہ چین کے مچی الدین العربی نے دیا ہے۔

تصوف کے اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عالم میں ہزاروں لاکھوں

مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ یہ ظاہری کثرت دراصل ایک وحدت محض ہے۔ یا وحدت محض کی مختلف شکلیں یا رنگ ہیں۔ ان تمام چیزوں میں وہی ایک ذات جاری و ساری ہے اور ہر چیز میں اس کا حسن جھلکتا ہے۔ یا اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں۔ تمام موجودات اور ممکنات اس وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا کرشمہ ہیں۔ وحدت الوجود کے اس فلسفہ سے صوفیاء نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ دنیا اور مافیہا کی کچھ وقعت نہیں کیونکہ اس دنیا کی کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ اسی لیے دنیا کی چیزوں میں دل لگانا ایک عبث کام ہے۔۔۔ ہندوستان میں مسئلہ وحدت الوجود کی اصطلاح حضرت مجدد الف ثانی نے سب سے پہلے استعمال کی اور فرمایا کہ یہ حقیقی تصوف میں ایک مقام ہے اور چاہیے کہ سالک اس مقام سے نکل آئے کیونکہ اگر وہ اس مقام پر پھنس کر رہ جائے تو وہ راستہ بھول جائے گا اور بھٹک جائے گا۔ اسلامی تصوف میں دنیا کی زندگی آخرت کا گوشہ ہے۔ یہ زندگی بیکار نہیں ہے دنیا حقیقی ہے۔“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ سارمغان خوشحال“)

معلوم ہوا کہ اسلامی تصوف میں دنیا کو چھوڑنا یا اس سے منہ موڑنا منع ہے۔ مسلمان اپنی دنیاوی زندگی اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے مطابق گزارتا ہے اور ہر دم اس کی نظر

اللہ کی ذات پر ہوتی ہے۔ اگر مسلمان دنیاوی کاروبار چھوڑ دے تو اسلامی تصوف کی نظر میں یہ ایک غیر اسلامی قدم ہوگا۔

لیکن شاعری میں حقیقت اور مجاز کے الفاظ کا سرچشمہ تصوف ہے۔ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور تصوف کی برکت سے ان جذبات میں پاکیزگی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ تصوف کا خیر عشق حقیقی یا عشق الہی ہے اور عشق حقیقی ایک نہایت ہی پاک جوش اور بڑے مطہر اور مقدس جذبے کا نام ہے کہ یہ جذبہ انسان میں اولیٰ اخلاقی اور روحانی زندگی اور آگہی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جب شاعری میں تصوف کا مضمون جاگزیں ہوا تو عشق مجازی کی باتوں میں بھی ایک مزہ پیدا ہو گیا۔ اور غمی شعر میں بہ حیثیت مجموعی ایک زعمہ ادب کی روح دوڑ گئی۔ اور یوں غم کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس لمبی بحث کو سمیٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خوشحال و غالب کی شاعری میں تصوف کا کیا مقام ہے۔ آئیے پہلے خوشحال کی دنیا میں چلیں۔

خوشحال کی شاعری میں تصوف

خوشحال کے زمانے میں پشتو شاعری تصوف کے نام سے آشنا ہو چکی تھی۔ خوشحال خود تو صوفی مشرب انسان نہ تھے۔ مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ ان کو تصوف کی باریکیوں کا علم حاصل تھا۔ جن میں سقراط کا نظریہ حسن مطلق بھی شامل ہے۔ جس کے مطابق حسن زندگی کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی۔ اور یہ کہ مرد کامل کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کے قول و فعل میں حسن ہو۔ اس کے تصورات حسین ہوں اور اسے حسن مطلق کا عرفان حاصل ہو۔ ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک حسن مطلق یا حسن ازل اور خوشحال کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس مزاج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا۔ جاتاقی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو“

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:-

”حسن ازل کے متعلق خوشحال کا نظریہ اسلامی تصورات پر مبنی ہے کیونکہ وہ ایک بڑے عالم اور مذہبی انسان تھے۔ اور احکام شریعت کے پابند تھے۔ گو خوشحال حسن ازل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تصوف کا چھوٹا راستہ پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ طریقت کا راستہ شریعت کی راہنمائی کے بغیر خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لئے خوشحال شریعت کو ایک درخت سے تعبیر کرتے ہیں اور

طریقت کو اس درخت کی شاخ کا درجہ دیتے ہیں“

خوشحال فرماتے ہیں:-

شریعت دونی بیخ دے

طریقت لکہ بناخونہ

حقیقت دونی پانی

معرفت میوہ گلونہ

ترجمہ:- شریعت درخت کی جڑ کے مانند ہے

طریقت اس درخت کی شاخیں

حقیقت اس درخت کے پتے ہیں

معرفت اس درخت کے پھل اور پھول

خوشحال کا پکا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کے تمام موجودات صرف اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ اور

کائنات کے ہست و نیست کا اختیار بھی اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اسے نہ آرام کی

ضرورت ہے اور نہ ہی نیند کی۔ وہ حسی قیوم ہے اور اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اسے

کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی کی مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تمام تعریفیں

اسی کے لیے ہیں:-

کل ثناء پہ ہغہ بنائی

چی ثنائی ہر خوک وائی

ترجمہ:- ساری تعریفیں اسی کو جتی ہیں۔ جسکی شاہر شخص کہہ رہا ہے۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک "خوشحال کا تصور جمال")

خوشحال میں صوفیانہ تجسس اور سوجھ بوجھ کے تین عوامل نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اپنے اساتذہ حضرت مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور حضرت شاہ اویس صدیقی ملتانی کی صحبت میں رہ کر تصوف کے مضمون سے متعارف ہوئے۔ دوسرے ان کو حضرت شیخ رحیم کار کا کاخیل سے جو عقیدت تھی۔ اسکی وجہ سے اور حضرت شیخ کی صحبت کی وجہ سے تصوف کی طرف خوشحال کا میلان طبع ہونا قدرتی امر تھا۔ تیسری وجہ خوشحال کا اپنا وہ علم تھا جو انہوں نے اپنی کوششوں اور مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ اس طرح وہ تصوف کی باریکیاں جاننے میں کامیاب ہوئے۔

خوشحال کی عشقی اور تصوفی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کہتے ہیں:-

"ان اور ایسے ہزاروں اشعار میں خان (خوشحال) بالکل ایک رنگین بیان، حسن و عشق کے داعی شاعر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب تصوف کی باریکیوں کا بیان کرتے ہیں تو ایک صاحب حال و صاحب معرفت صوفی لگتے ہیں۔ اور طریقت و سلوک کے مراحل سے جیسے کہ خود گزر چکے ہوں۔ تصوف میں ان کے زیادہ تر اشعار شیخ ابن العربی کے مسلک سے متعلق نظر آتے ہیں۔ یعنی خان وحدۃ الوجود کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہودی وجود پر مبنی نظریات بھی خان کے کلام میں ملتے ہیں۔ شہودی وحدت کے بارے میں فرماتے

ہیں:-

کہ مسجد گوری کہ دیر
 وارہ یو دے نشتہ غیر
 یو مہی بیا موند پہ ہر خہ کنہی
 چہی مہی و کپرہ دزہ سیر
 خوشحال یو وینی خوشحال دے
 ورتہ ورگ دے غیر و زیر
 ترجمہ:- مسجد میں دیکھو چاہے دیر میں
 سب میں وہی ایک ہے کوئی غیر نہیں
 میں نے ہر چیز میں اس واحد کو پایا
 جب میں نے اپنے دل کی سیر کی
 خوشحال خوش ہے کہ ایک ہی واحد کو دیکھتا ہے
 اور غیر و زیر اس کے لیے گم ہیں۔

(ڈاکٹر راج دلی شاہ خٹک ”رباعیات خوشحال“)

پشتو زبان کے مشہور شاعر ادیب اور تصوف کے علمبردار امیر اسفخر لہین جناب امیر حمزہ شنواری نے خوشحال کے کلام میں تصوف کے بارے میں کئی مقالے لکھے ہیں۔ اور خوشحال کے ایک تصوفی شعر سے متاثر ہو کر تو صرف ایک شعر پر پوری کتاب لکھ ڈالی ہے۔ اور اس

میں خوشحال کے تصوف پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جناب امیر حمزہ شنواری اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں:-

”جب خوشحال بابا نے عقل کی پرواز کے سلسلے میں عقل و آگہی کو

انسانی روح کے حوالے کر دیا تو انکے یقین کی روشنی میں اضافہ ہوا“

خوشحال کا عارفانہ کلام بھی انکی تصوفی شاعری کی ایک کڑی ہے۔ افغانی محقق جناب عبدالحی حبیبی اس ضمن میں فرماتے ہیں:-

”معرفت کی دنیا میں خوشحال ظاہری حواس اور مادی خواص کے علاوہ ایک دوسری روح اور باطنی حواس میں یقین رکھتے ہیں جن کے ذریعے سے معرفت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ کہا ہے:-

عارفان د سر پہ سترگو گوتہ کی پدی

د خیل زہ پہ سترگو گوری تعاشا کا

ترجمہ:- عارف اپنے سر کی آنکھوں پر انگلیاں رکھ کر اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ، اور تماشا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنے تحقیقی مقالہ (اور کتاب) خوشحال اور تصور جمال میں خوشحال کے تصوفی رنگ کو یوں سمیٹتے ہیں:-

”ان حوالوں اور مباحث کے نتیجے میں انسان اس حقیقت تک پہنچتا

ہے کہ خوشحال کا ”حسن ازل“ اور ”نور مطلق“ کے متعلق خیال نہ تو

”ترک دنیا“ کی بنیاد پر ہے اور نہ ہی نفس کو قتل کرنے پر۔ خوشحال
 نفس کے ساتھ جہاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن بے جا نفس کشی کے
 ذریعے انسانی وجود پر ظلم کرنے کے شدید مخالف ہیں۔ ان کا نظریہ
 حسن ازل اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر محکم کھڑا ہے۔ اسی لیے ان کے
 فکر و فن میں ایک خوبصورت اعتدال نظر آتا ہے ایک ایسا اعتدال جو
 دین اور دنیا دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ہم جب اس
 پورے باب پر غور کرتے ہیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ خالق کائنات
 نے اس بندے (خوشحال) کو کتنی تیز نظر، قوت مشاہدہ اور کتنا
 زبردست جمالی ذہن دیا ہے۔ ایک ایسا ذہن جس نے بیک وقت
 زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال رکھی ہے“

(ڈاکٹر اقبال نسیم ٹنک ”خوشحال کا تصور جمال مابعد الطبیعیاتی حسن“)

آخر میں تصوفی رنگ لئے ہوئے خوشحال بابا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

پہ ہر خلد کنبہی نندارہ دھغہ منہ کرم

چھی لہ دیبری پیدایی ناپدید شو

ترجمہ:- ہر شے میں اسی رخ زیا کا دیدار کرتا ہوں۔ جو کثرت شہود کی وجہ سے نامشہود ہو گیا

هر تشنه چي د وحدت په سيند سیراب شه

نور همه جهان و دۀ و ته سراب شه

ترجمہ:- جو پیاسا بھی ایک دفعہ دریائے وحدت سے سیراب ہو جائے تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں سراب بن جاتی ہے۔

آخر میں ظاہری اور حقیقی حسن سے متعلق خوشحال کا وہ شعر جو سراف کیر و اور سر ہوئل کی ”دی پرنسز آف خوشحال خان ٹنگ“ میں شامل کئے گئے ایک قصیدے میں شامل ہے:-

د بسکلیو د جمال په ننداره کښي ما خدائے بیا موند

لږ نه دی له مجازه حقیقت ته رسیدلی

ترجمہ:- حسینوں کے جمال کے نظارے میں میں نے خدا کو پایا۔ اور یوں مجاز سے حقیقت تک پہنچنے والے کچھ کم نہیں ہیں۔

سراف کیر و اور سر ہوئل کی کتاب میں اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"For me fair forms reveal, Such ecstasy I feel, I Swoon my senses real, Before all loveliness, All sense transcended in the form I see, Semblance that merges in Reality."

غالب کی شاعری میں تصوف

غالب کے مزاج میں فلسفیانہ انداز نظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تا آئنگہ قاری ان کے حیات و کائنات کی حقیقت مادہ روح اور سب سے بڑھ کر خدا کی ہستی سے متعلق خیالات کا مطالعہ کرتے کرتے ایک ایسی سرحد پر آکھڑا ہوتا ہے جس کے ایک طرف فلسفہ کا علاقہ ہے تو دوسری طرف تصوف کی پرچہ وادی۔ کیا غالب نے خود بھی یہ سرحد پار کی۔ کیا انہوں نے تصوف کی وادی میں قدم رکھا اور اگر رکھا تو اسکی نوعیت کیا تھی۔ کیا غالب صوفی تھے۔ یہی وہ سب سوالات ہیں جن کے جوابات قاری کو چاہئیں اور ان سوالات کے تسلی بخش جوابات ڈھونڈنا ہماری آج کی نشست کا مقصد ہے۔ آئیے سب سے پہلے اردو ادب میں تصوف کے مقام کو جانیں:-

”تصوف نفی ذات اور نفی کائنات پر زور دیتا ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کالفی کا تصور اثبات سے پیدا ہوا ہے۔ صوفی ایک وجود واحد کو ماننے کے بعد ہی نفی ذات و نفی کائنات کی تلقین کرتا ہے اور اسی وجود واحد میں اپنے آپ کو ضم کر دینے کے لیے اس کے تصورات میں جوش و انبساط کی ایک زبردست کیفیت پاتی جاتی ہے۔ یہ بات

بھی غور طلب ہے کہ قدیم زمانہ میں جب سماجی اور اخلاقی قد میں متزلزل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو اکثر صوفیوں اور بھگتوں ہی کی زندگی اور تعلیم میں انسان دوستی کا سراغ ملتا ہے۔ ایسے حالات میں تصوف ایک ذہنی بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔“

(ابو محمد سحر ”غالب کا فلسفہ“)

اب اردو ادب میں حسن کے زاویے سے بھی تصوف کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو غزل کے بارے میں فراق گورکھپوری نے کیا کہا تھا۔ پروفیسر افضل حسین اظہر بتاتے ہیں:-

”شاعری زندگی کے ہر منظر میں ایک ماورائی یا روحانی لامحدود مابینیت کا احساس کرتی ہے۔ اور اسی کو جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے بیک وقت لطیف بھی ہے، کثیف بھی، موجود بھی، معدوم بھی، محدود بھی ہے۔ لامحدود بھی، کثرت کی مثال بھی ہے اور وحدت کی بھی، الغرض قضائے عام ایک ماورائے عالم حقیقت ضرور پائی جاتی ہے اور شاعر کا ذہن اسی عالمگیر حقیقت کا احساس ہے۔“

آگے لکھتے ہیں:-

”تصوف کا مرکزی اصول وحدت الوجود یا حقیقت کا زمان و مکان و سبب و علت سے معرا ہونا ہے۔ حسن کا تصور آپ محدود طریقے پر کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ یہاں مقداری تصور کا گزر ہی نہیں۔ کتنا اور

کس قدر کا مفہوم ہم حسن سے متعلق نہیں کر سکتے۔ حسن کا تیز احساس ہمیں لامحدود کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا یہ احساس تیز ہوگا اتنا ہی حسن ہمد گیر ہوگا۔

(پروفیسر افضل حسین اظہر ”غالب و اقبال کی ہم آہنگی“)

اس مقام پر نیاز فتح پوری ہماری مدد کو نکلتے ہیں:-

”دراصل غالب کا تصوف اور فلسفہ ایک مستعار چیز تھا اور غالب نے اسے غالباً اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ ’برائے شعر گفتن خوب است‘ یا یہ کہ اس زمانہ کے محافل شعر و سخن میں اس چیز کی مانگ تھی اور غالب کے لیے ضروری تھا کہ ان مجالس میں درخور پانے کے لیے وہ اس رنگ کے اشعار بھی کہتے۔“

نیاز فتح پوری آگے فرماتے ہیں:-

”اس سلسلہ میں پھر غالب کی وہی کہی ہوئی بات سامنے آ جاتی ہے ”فارسی میں تاہن نقش ہائے رنگ رنگ“ اور اس میں شک نہیں کہ اس نقش ہائے رنگ رنگ میں اس کا نقش تصوف بھی بڑا دلکش بڑا جمیل اور بڑا عظیم نظر آتا ہے۔ فارسی کلیات میں پہلا شعر حمد ہی ملاحظہ فرمائیے:-

اے بہ ظلاء و ملا، خوئے تو ہنگامہ زرا

با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

تمام دوسرے صوفی شعراء کی طرح غالب نے بھی اس خدا کی وحدت و جود ہی کا ذکر کیا ہے لیکن الفاظ کے انتخاب ان کی نعت، لب و لہجہ کی متانت اور اسی کے ساتھ آفاقی قسم کی تہذیبی آہنگ نے خدا کی شوکت و جبروت اور عظمت و جلال کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

(نیاز فتح پوری ”ولی بادہ خوار“)

ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں فلسفہ، معینہ اقدار و تصورات، کائنات، مادہ، روح، فنا، عقیدہ وحدت الوجود، حسن کا احساس، حسن مطلق، حکیمانہ مزاج، فکر و جذبہ، عشقیہ جذبات، استدلالی انداز بیاں، تشنگ، کلمتہ آفرینی، رمز و مبلغ، مخصوص ترکیب، تخیل، تصور ارتقاء، بنیادی عناصر کا کام دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے ان عناصر کو اپنے مقالہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان عناصر پر ایک اچھی نظر ڈالیں۔ اس سے چند عناصر دوسرے عناصر کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے وحدت الوجود اور تشنگ کو لیتے ہیں۔ وحدت الوجود — لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اللہ کی ذات کو واحد مانے اور اس میں ذات نہ کرے۔ لیکن غالب کی شاعری میں تشنگ کا جو عنصر در آیا ہے۔ اس سے اس کے نظریہ تصوف کو نہیں نہ نہیں ڈال

ضرور پہنچتی ہے مزید برآں:-

”وحدت الوجود کی اصل روح اور آخری غایت تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن ہے۔ غالب نے اسے اپنی عملی زندگی میں نہیں برتنا تھا۔ پھر یہ عقیدہ ان کے ذہن میں اتنا جاگزیں کیسے ہوا؟ کیا یہ محض روایت پرستی کا نتیجہ تھا تو اس کے شاعرانہ اظہار میں اتنا توازن اور اتنی جان نہ ہوتی۔ احتشام حسین صاحب کا خیال بڑی حد تک سحت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ ”وحدت الوجود کی طرف غالب کا میلان مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا“

غلاطیس کے نظریہ کے بموجب روح اعظم کو جب یہ منظور ہوا کہ اپنی صورت کا مشاہدہ کرے تو کائنات وجود میں آگئی اور ماسوا کا ظہور ہو گیا۔

دہر نچو جلوہ یکنائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

(اسلوب احمد انصاری ”غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر“)

گو ہر مقصود اب بھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ ابھی ہمیں کچھ اور آگے بڑھنا ہے۔ کیا ایسا تو

نہیں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ غالب کے دل میں بہت گہرا ہوا۔ اس حد تک کہ انہوں نے احتیاط نہیں کی اور بھٹک گئے۔ کہ یہ راستہ وادی حیرت میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ غالب کے ان اشعار سے ہمیں ان کے نظریے وحدت الوجود یا ان کے تصوف کو جاننے میں کوئی مدد ملتی ہے؟

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم
کر دیا کافر اس انعام خیالی نے مجھے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب کے یہاں بیدل کے انداز میں ان مضامین کی بازگشت ملتی ہے۔ جو وحدت و وجودی کے صوفیانہ مسلک سے بیدل اور دوسرے شعراء نے متاثر ہو کر اپنائے۔ چونکہ بیدل اور ان دوسرے اردو فارسی کے شعراء نے تصوف سے اپنی اپنی دکان سجائی ہے۔ اس لیے غالب نے بھی تقلید ایسا ہی کیا ورنہ کہاں غالب اور کہاں تصوف۔ لیکن جی نہیں مانتا غالب کو تصوف سے کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور ہے ورنہ وہ یہ شعر کیوں اور کیسے کہتے:-

سراغ وحدت ذاتش تو اس زکثرت بخت
کہ سائر ست در اعداد بے شمار یکے

ایسا بھی تو ممکن ہے کہ غالب کی تصوفی شاعری کی جڑیں انکے اپنے زمانے اور اپنی تہذیب

اور بدلے ہوئے عمرانی حالات میں بیچوست ہوں:-

”ایک طرف اسلامی تصوف کی وہ روایت تھی جس نے اردو شاعری کی فکر کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے نشوونما میں اگر ایک طرف نو افلاطونی فلسفے، ایرانی اثرات اور ہندو یوگیوں کے رابطوں کا حصہ رہا ہے تو دوسری طرف اسلامی فکر کے مختلف عناصر خصوصاً معتزلہ فرقہ اور اس کی استدلال نے بھی کافی مدد بہم پہنچائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی تصوف اس دور کا غالب فلسفہ تھا۔ اور اردو شاعری نہ صرف نفس مضمون کے اعتبار سے بلکہ علامتوں، اشاروں، اسالیب بیان حتیٰ کہ تشبیہ و استعارہ کے سارے ذخیرے تصوف ہی کے مرہون منت ہیں۔

پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غالب عملاً صوفی نہ تھے۔ عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیاء کے بہت سے مروجہ عقائد کو مانتے تھے۔ وہاں نہ تو وہ ان کی راہ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے۔ اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفہ فکر پیش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تصوف کو برائے شعر گفتن خوب است کا درجہ حاصل رہا۔“

(ڈاکٹر محمد حسن ”غالب کے چند اہم نقاد“)

کہتے ہیں کہ صوفی تو خدا کی ذات میں اتنا کو ہوتا ہے کہ اس کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور

اس سے لا انتہا محبت کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں یہی کلیہ کسی خاص حد تک غالب کی زندگی اور انکی دنیاوی اور مذہبی روش پر آزمانا ہوگا۔ آئیے انکی زندگی میں جھانکیں:-

”غالب کے کلام کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں اور اس کے دائروں تک ہماری نگاہ جاسکے تو یہ بات آسانی سے سمجھ آ سکتی ہے کہ ماضی کے افکار و خیالات کے علاوہ غالب کے ذہن پر خود اپنے ذاتی مسائل کا بھی اثر پڑا تھا۔ زمانے کے مروجہ نظام معاشرت میں زندگی گزارنے کے لیے اور زمانے میں اپنے آپ کو پیش کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے غالب کو جو کچھ کہہ پڑے ان کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔ لیکن اس کے نتائج کو آپ دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے ان کے یہاں تخلیقی، شکست خوردگی، طغز، تنگدلی، تنہائی کا احساس، انانیت اور مردم بیزار پیدا ہو گئی تھی۔ ساج کے مروجہ قوانین اور رسوم سے وہ بے زار تھے ہی۔ ناکامیوں اور ناامیدیوں نے انہیں ”خدا“ کے متعلق بھی شبہ میں ڈال دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا صحیح ہے کہ اردو شاعری میں غالب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طغز میں خدا کو مخاطب کیا ہے اور خدا ہی کیا وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت اس کے فرشتوں اس کے دیر و حرم اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کی ہر شے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان سے لڑتے تھے۔ ان

پر استہزاء کرتے تھے۔ ہمارے مایوس ہوتے تھے اور ان پر فتح یاب ہونے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے لیے آمادہ بھی کرتے تھے۔ ان نقوش کو کہیں کہیں سے الٹ پلٹ کر دیکھیے:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دیر میں
تیرے سوا کچھ اور بھی ہم پر ستم ہوئے
کیا وہ ضرور کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(خلیل الرحمان اعظمی "غالب اور عصر جدید")

خدا پر طنز کرنے والا اور مردم بیزار غنص کیونکر تصوف کا دم بھر سکتا ہے۔ لیکن ظہریئے کچھ ہے جو ہمیں اکساتا ہے۔ کہ غالب کو تصوف کے رموز سے ضرور کوئی سروکار رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کی غزلوں میں عینیت اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ہستی کو فریب سمجھ کر مادہ کے وجود سے قطعی انکار عینیت کا انتہا پسند نظریہ ہے:-

"عینیت سے قدرتی طور پر دو شاخیں پھوٹی ہیں۔ مابعد الطبیعات اور
مثالیت مادہ سے ماوراء روح اور اس سے متعلق ایک پوری کائنات کا
تصور اور پھر اس سے متعلق سچ در سچ محسوس ہزار سال سے فلسفے کا اہم جز

رہی ہیں۔ غالب کے زمانے میں مہذب سماج کا مرغوب روحانی فلسفہ تصوف تھا۔ اور شاعروں میں تو اسے اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ کیونکہ اس کے بارے میں ”برائے شعر گفتن خوب است“ کہا گیا تھا۔ پھر ہماری شاعری کو اس سے ایک بڑی حد تک فطری اور روایتی تعلق بھی تھا۔ اس لئے غالب کی شاعری اس سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ تصوف کے متعلق ان کی معلومات بہت اچھی تھیں۔ ان کی شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں تصوف کے مختلف مقامات اور مسائل کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ تو کچھ خیر ہوئی بادہ خواری نے بچالیا ورنہ اچھے خاصے انسان سے ولی بن جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔“

(راجندر ناتھ شیدا ”غالب کا شعور۔۔۔ ایک مطالعہ“)

اوپر جو کچھ گزرا اسکے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالہ ”غالب اور نفسیاتی کشمکش“ میں چند نکات اٹھائے ہیں جو غالب اور تصوف کے سلسلہ میں ہمارے ممد ثابت ہو سکتے ہیں:-

(الف) بظاہر کثرت و وحدت دو جدا جدا اور متضاد حقیقتیں نظر آتی ہیں لیکن اگر بتایا جائے کہ کثرت و وحدت ہے یا وحدت ہی کے رنگ برنگ ظہور کا نام ہے تو اس انکشاف سے تھوڑی دیر کے لیے تحیر پیدا

ہو جائے گا۔ خصوصاً جب کہ تخیل نازک اور انداز بیان نادر ہو۔۔۔

اس لیے غالب نے بھی اس ترانے کو چھیڑا۔

(ب) ڈاکٹر صدیقی آگے چلکر یہ نکتہ سامنے لاتے ہیں کہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مطابق

”غالب کا تصوف مابعد الطبیعات“ اخلاق اور زندگی کے دوسرے

پہلوؤں پر محیط نہیں ہے۔ ان کا تصوف تزکیہ نفس یا دوسرے کی تلقین

کے لیے کم اور اپنے تحفظ کے لیے زیادہ ہے“

(ج) غالب نے اپنی فارسیت کو جلاوینے کے لیے تصوف کا سہارا لیا۔

(د) غالب کا تصوف ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس نے خود یہ اشارہ کیا

ہے کہ اس نے تصوف کو تفسن طبع کے لیے لگا رکھا تھا“ ظاہر ہے کہ یہ

قول یا تو غالب کی زندہ دلی پر دلالت کرتا ہے یا انکساری پر۔ اس لیے

کہ غالب کے کلام میں بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا کہنے والا

صرف ایسا شخص ہو سکتا ہے جو تصوف کے رموز سے آشنا ہو:

ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ان کے علاوہ ایک اور بات جو ڈاکٹر صدیقی سامنے لائے ہیں۔ وہ یہ کہ شیعہ مسلک یا

عقائد کے ساتھ تصوف کا تال میل ممکن نہیں۔ دوسری طرف غالب کے خطوط میں واضح

طور پر ان کے اہل تشیع ہونے کے اشارے ملتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر مظہیر احمد صدیقی اس مسئلہ کو ہمارے لیے یوں سمیٹتے ہیں:-

”ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مرزا مدقوں ایک چنی کٹکٹش کا

شکار رہے۔ ان کا متصوفانہ رجحان نفی خودی کی دعوت دیتا ہے اور ان

کی فطری انانیت ہر بار ابھر کر ان کو اثبات خودی کی دعوت دیتی تھی۔

بالآخر ان کے صوفیانہ چن دار نے ان کی انانیت سے ٹکست کھائی۔

ممکن ہے اس کے بعد بھی ان کے ساز سے صوفیانہ نغمے کبھی کبھی نکلے

ہوں مگر ان انکار کو حقیقی نہیں رکی کہہ سکتے ہیں“

(ڈاکٹر مظہیر احمد صدیقی ”غالب اور نفسیاتی کٹکٹش“)

تصوف کے ساتھ غالب کا رشتہ کچھ بھی رہا ہو۔ وہ تصوف کے رموز سے بہر حال واقف

تھے۔ اور اسکے نتیجے میں کافی گہرے تصوفی اشعار سامنے آئے ہیں آئیں ان سے خط

اٹھائیں:-

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے بگڑتا ہے دوا ہو جانا

فنا کو سوچ کر مشاق ہے اپنی حقیقت کا

فروغ طالع خاشاک ہے موقوف کلخن پر

دل ہر قطرہ ہے ساز انا ابھر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں دوش جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہے وہی بد مستی ہر ذرہ کا خود غدر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسمان سرشار ہے

للافت ہے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

آں راز کہ در سیمہ نہاں ست نہ وعظ ست
 بر دار تو اں گفت و بہ منہر نہ تو اں گفت

مقصود ما ز دریہ و حرم جز حبیب نیست
 ہر جا کہینم سجدہ ' ہذاں آستان رسد

خوشحال و غالب کی فارسی شاعری

غالب کی فارسی شاعری

بر عظیم میں فارسی شاعری کا سلسلہ سعود سعید سلیمان سے شروع ہوا اور خسرو نظیری، ظہوری، عرفی، فیضی، بیدل اور غالب سے ہوتا ہوا اقبال پر آ کر ختم ہوا۔ آجئے ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیں۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے ہمیشہ بہتر جانا اور فرمایا کہ:-

فارسی میں تابہ بنی نقشہائے رنگ رنگ

بگور از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگ من است

اسکی وجہ جاننے کے لیے ہمیں جناب شہرت بخاری کی یہ تحریر پڑھنی ہوگی:-

”مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کو فارسی شاعری سے شغف کی

وجوہات کیا تھیں۔ جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس (فارسی) کا آفتاب

غروب ہوا چلتا ہے۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نسلی برتری کا احساس

اس معاملے میں سب سے پہلے اس کا رہبر ہوا۔ ایرانی اور ترک

ہونے پر اس کا فقر غرور کی حدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ امیر خسرو اور بیدل کو بمشکل مانتا تھا۔ ایک اور وجہ وہ شکست ہے جو اتہام میں اس کو اپنی اردو شاعری کے سلسلے میں کھائی پڑی۔ دراصل وہ جس طرز کی شاعری کر رہا تھا یعنی تقلید ظہوری و بیدل وہ اردو کے لیے بالکل غریب تھی۔ اس زمانے میں ادھر ناخ ادھر شاہ نصیر اور ذوق کے ترانے فضا میں رچے ہوئے تھے لوگ

شمار سجد مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
کی طرف کس طرح متوجہ ہوتے۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ
میدان نہیں اور فارسی کی طرف ہمتیں متوجہ ہو گیا۔“

(شہرت بخاری ”غالب کی فارسی شاعری“)

ایران میں سعدی و حافظ اور ہندوستان میں سعد سلیمان، خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل، غالب سے پہلے فارسی شاعری کے بے بدل استاد گذرے تھے۔ غالب کے فارسی کلام پر یوں تو شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری، انوری، خاقانی اور نظیری کا اثر نظر آتا ہے۔ لیکن جس فارسی شاعر سے غالب سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ مرزا بیدل ہیں۔ جس کے متعلق غالب اپنے ایک اردو شعر میں فرماتے ہیں:-

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب

عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

غالب کے فارسی کلام کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو :-

”غالب نے اپنے فارسی کلام کو زندگی بھر اپنے اردو کلام پر ترجیح دی۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فارسی کلام کی ناقدری کا افسوس تھا۔ مگر اصل یہ ہے کہ مرزا قاری میں کسی نئی طرز کے موجد نہیں ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کی روایات کو اچھی طرح اپنے اندر سولیا تھا اور اس علم کتابی اور اپنی مناسبت طبع کی بدولت وہ نہایت پاکیزہ شعر کہنے لگے تھے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کے ساز میں کوئی پردہ ایسا نہیں ہے جو ان کے پیشرو شعرائے فارسی کے یہاں موجود نہ ہو۔ انہیں فارسی شعر کی تاریخ میں زیادہ سے زیادہ اسالیب کے ایک ماہر کا درجہ مل سکتا ہے۔ لیکن جس مقام پر وہ خود کو فائز و یکنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ انہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اکرام نے لکھا ہے کہ ان کا فارسی کلام ”ہندوستان کے بہترین فارسی شعراء سے پیچھے نہیں ہے“ یہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن غالب جو ہند کے فارسی شعراء کو اپنے مقابلے میں پیچ سمجھتے تھے اکرام کے اس جملے کو اپنی صریح توہین پر محمول کرتے“

(شجاع احمد زیا ”اردو غزل اور غالب“)

غالب نے اپنی شاعری کی ابتداء آگرہ میں اپنے فارسی کلام سے کی۔ مگر دلی آکر اردو شاعری کی ابتدا کی جو ان کی مشکل پسندی اور فارسیت کی وجہ سے اُس زمانے میں اپنی جگہ نہ بنا سکی۔ اسلئے انہوں نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی۔ ان کا تقریباً تمام فارسی کلام (جو دس ہزار چار سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے) ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک یعنی بیس سال کے عرصہ میں لکھا گیا۔ شروع شروع میں مشکل پسندی کی جھلک غالب کی فارسی غزلوں میں بھی جھلکتی رہی۔ مگر فارسی رباعیات، قطعات، مثنویوں اور قصائد میں مشکل پسندی نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالب کی ۳۲۵ فارسی غزلوں میں سے ۲۷۶ غزلیں ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان یعنی گیارہ سال میں کہی گئیں۔ اپنے فارسی دیوان کی تعریف یوں کی ہے:-

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے

آں دیں را بزدی کتاب ایں بودے

غالب نے اپنی فارسی شاعری میں بھی دو تخلص یعنی اسد اور غالب استعمال کئے۔ جہاں تک غالب کی شعری خصوصیات کا تعلق ہے تو انہوں نے غزل کے دامن کو وسعت بخشی۔ دنیا کی ہر بات اور ہر مسئلہ پر غزل لیں کہیں۔ یوں غزل کو تنگئی دلاں کا گھونڈ رہا۔

شہرت بخاری کے مطابق غالب نے غزل کو صنفِ سخن نہ رہنے دیا۔ بلکہ اردو اور فارسی زبان کی تقدیر بنادیا۔ غزل کو تہذیب کا درجہ دیا۔ اور اس قائل بنایا کہ آج ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کو اس سے مفر نہیں۔ مرزا نے اردو اور فارسی غزل کو دلیری اور دلیری دی۔ انہوں نے فارسی شاعری میں خدا کو شدید طور سے مخاطب کیا:-

بیا کہ قاعدۂ آساں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:-

”خوشی بیان، ندرت خیال و معنی، آفرینی، عالی ظرفی، حسرت و یاس،
ذوق و شوق، حرکت و سفر، اندیشہ، منزل، نو میدی، جاوید، نازک و دماغی،
راہ عشق اور درد و فراق کے نادر مضامین کی ایسی مثالیں کلام غالب
میں موجود ہیں جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے یہاں بہت کم
ہیں اور جن کی بنیاد پر مرزا بجا طور پر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے
ہیں۔“

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ”نقشبائے رنگ رنگ“)

آئیے اب غالب کے فارسی کلام کے ان نقشبائے رنگ رنگ کا لطف اٹھائیں:-

مشکل پسندی:-

بودی کہ در آں خطر را عصاء مخفت است
ہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پانخت است

غبارِ طرفِ حرام پہ بیچ و تابے ہست
ہنوز درِ رگ اندیشہ اضطرابے ہست

ہسان موجِ می پالم پہ طوقاں
ہرگ شعلہِ می رقصم درِ آتش

شیوہٴ زندان بے پرواہِ خرام از من پُرس
ایں قدرِ داغِ کمِ مشکل است آساں زِ یستن

تصورِ غم:-

گر ہو مشکلِ مرنجِ اے دل کہ کار
چوں رود از دستِ آساں می رود

شادی و غم ہمہ شرمگشتہ تر از یک دگر اند
روز روشن بوداں شب تار آمد و رفت

وجدانی کیفیت:-

بیا کہ قاعدہٴ اسماں بگردانم
قضا پہ گردشِ رطلِ گراں بگردانم

گل انگینم و گلابے بہ را بگور پاشیم
سے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ہوں گیری:-

گہے بہ لا بہ خن با ادا بیامیزم
گہے بہ یوسہ زباں در دہاں بگردانیم

تکلف برطرف لب تھوے یوس و کنار اتم
ز را ہم باز چھک دام نوازش ہائے پنہاں را

خودداری و تقاخر:-

بے برگئی من داغ لہذ بدل ساماں
بے مہرگی من زرد کند روئے درم را

شکوہ و پیشگوئی:-

کو کسم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

تصوف:-

مقصود ما ز دی و حرم بخ حبیب نیست
ہر جا کینم سجدہ ہداں آستان رسد

سراغ وحدت ذاتش تو اس زکثرت جست
کہ سائر ست در اعداد بے شمار یکے

دنیا اور کائنات کی حقیقت:-

جہاں چسیت ' آئینہ آگہی
فضائے نظر گاہ ' وجہ الہی

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری بہ نگاہے دریاب

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست
مکوئی ظلم شش بہت آئینہ خانہ ایست

عشق و عقل:-

عشق بے دہلئی شیرازہ اجزائے حواس
عقل زنگار رخ آئینہ حسن یقیں

خوشحال کی فارسی شاعری

نگار من غضب آلودہ من ز سادہ ولی
 پہ قہر خندوی آگرہ نکشتم از غضبش
 گراں بُت راجہ محراب است ابرو
 من او را سجده در محراب مُردہ

خوشحال کے یہ فارسی اشعار کسی بھی ایسے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں جس کی ماوری زبان فارسی ہو اور نام حافظ، سعدی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب ہو۔ جب ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو کھلتا ہے کہ وہ ظہوری، نظیری اور بیدل کی فارسی نظم اور فن شاعری سے متاثر ہوئے مگر خوشحال کے فارسی کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ شیرازی کی طرح جام شراب کو موضوع بناتا ہے اور سعدی کی طرح اپنے دل کے رازوں کو۔ آئیے خوشحال کی فارسی شاعری کی خصوصیات کو جانیں:-

(۱) خوشحال کی ماوری زبان فارسی نہیں تھی۔

(۲) خوشحال سے پہلے کوئی پشتون شاعر معلوم نہیں جس کا فارسی کلام دستیاب ہو۔

(۳) فارسی شاعری میں خوشحال نے دو تخلص استعمال کئے۔ خوشحال اور کوہی

(۴) خوشحال کے فارسی کلام میں صرف پچیس غزلیں دستیاب ہیں۔ جن میں لگ بھگ

ڈھائی سوا شعرا ہیں۔

(۵) خوشحال کا فارسی کلام انکے پشتو کلام کے خنیم دیوان کا حصہ ہے۔

(۶) خوشحال نے فارسی میں صرف غزل گوئی کی ہے۔ جس میں انکی آواز سادہ شیرین اور مترنم ہے۔

(۷) خوشحال نے اپنی فارسی غزلوں میں زیادہ تر چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں۔

خوشحال بابا اپنے زمانے اور مغلیہ دربار میں رائج فارسی زبان پر بخوبی حاوی تھے۔ انکے علاوہ ان کا فارسی زبان اور شاعری کا مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے۔ جب ہی تو انکے کلام میں سعدی و حافظ جھلکتے ہیں۔ خوشحال کی فارسی ادبیات سے یہ واقفیت پشتو زبان کے لیے سہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف فارسی میں شاعری کی بلکہ فارسی شاعری کی خصوصیات کو پشتو شاعری میں سمو کر پشتو نظم کو ایک اعلیٰ مقام تک لے گئے اور اس میں وسعت پیدا کی۔

خوشحال کی فارسی غزل میں سعدی و حافظ کے رنگ سخن سے متعلق ڈاکٹر سید پرویس مر قنصی جعفری نے فرمایا:-

”خوشحال خان بابا کی فارسی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایران کا ہر گہر فرہنگ و ہنر فلسفہ اخلاق و تصوف اور ان کا ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خوشحال اپنی فارسی شاعری میں سعدی و حافظ کے شیرین اور مترنم لب و لہجے سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اس غزل میں شیراز کی شیرینی کا لطف آ جاتا

ہے:-

از او دل بر گرفتن کار من نیست
 کہ از جاں سیرگشتن کار من نیست
 مرا کوئی بگو وصف دہانش
 چگونم چوں در او جائی خن نیست
 من و سودائی رویت تاکہ ہستم
 اگرچہ خود ترا بر رائی من نیست
 غمت تاور دل و جانم وطن کرو
 مرا در کوچہ شادی وطن نیست
 مرا خوشحال او پری کہ چونی
 مگر از چہرہ خالش مبرہن نیست

(ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری "خوشحال بابا کی فارسی شاعری")

اب ہم ایک ایسی حقیقت کا اظہار کرنا چاہیں گے جس کی وجہ سے خوشحال کی فارسی شاعری میں ایک ایسی جدت پیدا ہوئی جس نے فارسی شاعری کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ تفصیل اس جدت کی یہ ہے کہ خوشحال نے پشتو قافیے اور روایات اپنے فارسی شعروں میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کی ہیں۔ اس سے ان کے فارسی کلام کی تدرت و رعنائی میں اضافہ ہوا ہے۔ ذیل میں خوشحال کے چند ایسے فارسی اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں پشتو قافیہ

ردیف استعمال ہوئے ہیں۔ قارئین کی آسانی کے لیے ان پشتو قافیہ اور ردیف کو نہ صرف خط کشیدہ کیا گیا ہے بلکہ انکے سامنے انکے اردو معنی بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ ان اشعار کو پشتو قافیہ ردیف کے اردو ترجمے کے ساتھ پڑھیے اور ان ”سآتھ“ اشعار کا خط اٹھائیے:-

بگرد کوئے تو کشتن مراد نمادے (میری ہے)

بود کہ روئے تو نیم کہ کعبہ یادے (میرا ہے)

من اس جمال ترا کے مثال در یابم

کہ خود خیال تو از مہر و ماہ اعلیٰ دے (اعلیٰ ہے)

مضم کہ غیر تر اور جہاں نمی یابم

خلاف نیست خبر دار حق توئی دے (حق تعالیٰ ہے)

نمی شوم متحمل ہر روز و حد و وصال

بیابیا کہ دلم خوار و زار بے تادے (خیرے بغیر ہے)

گماں مبر کہ بگرد و ز عشق تو خوشحال

چرا کہ بروغ خوب تو ڈیر شیدا دے (بہت شیدا ہے)

جب تک کسی شاعر کو دونوں زبانوں پر کامل دسترس حاصل نہ ہو وہ کسی شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں اور دوسرا مصرع دوسری زبان میں لکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ خوشحال بابا چونکہ پشتو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک مصرع غزل اپنے دیوان میں چھوڑی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

- فارسی مصرعہ:- چہ کنم چہ چارہ سازم
پشتو مصرعہ:- چلہ زړه م شے کنار (جب تم میرے دل سے کنارہ کش ہو جاتی ہو)
فارسی مصرعہ:- نکلہ بدل سرايت
پشتو مصرعہ:- که زارے کوم بے شمار (اگر میں بے شمار متیں بھی کروں)
فارسی مصرعہ:- اگر از فراق میرم
پشتو مصرعہ:- لا په خوښ شے لږ وے کار (تم اس پر اور بھی خوش ہو جاؤ گی)
فارسی مصرعہ:- نرو زور گئے تو
پشتو مصرعہ:- که خوشحال شوے سل واز (اگر تو خوشحال کو سو پار بھی دھککارے)
آئیے خوشحال بابا کے فارسی کلام میں سے چیدہ چیدہ اشعار پڑھیں:-
مے خوری :-

چشم محنور تو آخر کار کرد

زاهد صد سالہ را میخوار کرد

چہ شر بیست ایں کہ رو می را

پہ کی جہدہ بی خبر کردی

بیار عشق :-

روئے زرد و آہ سرد و چشم تر

عشق کو بی را چنیں بیار کرد

روانی و سلاست :-

لبت از آب حیواں آب برده
زُخت نور از رخ مهتاب برده

سحر انگیزی :-

نه دامن در دو چشم او چه جادوست
که از پشمان عاشق خواب برده

صبر و بے تابی :-

بتاب زلف و بچا بچا گیسو
صبری از دل چناب برده

ظفر :-

نه تنها دل ز خوشحال تنگ برده
که زهد از دست شیخ و شهاب برده

اثرات الم :-

اگر روی ترا در دل الم نیست
چرا از دیدگان خوں میچکانی

اترا تا :-

بہ فرقت و محنت دیدہ بر خواباں وقت
باہم سلطان وقت و باہم سلطان وقت

گری عشق :-

حدیث روی او باہم بگوئید
پہ بلبل از گل و گلشن بگوئید
ند آں چشم و نہ آں مژگاں نہ ابروست
بلائے دین و جان و تن بگوئید

وقت کی اہمیت کا احساس :-

آہ و واویلا کہ دیدم بی ثبات و بی ہوا
عمر چوں باد بہار و عیش چوں بیان وقت
نالہ مرغان ایں گلشن بہمن معلوم شد
آہ و فریاد و فغان دارند در بہستان وقت

خوشحال و غالب کی فارسی شاعری

موازنہ

جہاں فارسی غالب کی نسل زبان تھی۔ وہاں خوشحال کی مادری زبان پشتو تھی۔ قدرتی امر ہے کہ اپنی نسل زبان میں غیر مادری زبان کی نسبت بہتر شاعری کی جاسکتی ہے۔ خوشحال اکثر کہا کرتے کہ فارسی میں مجھ سے بہتر شاعر موجود ہیں لیکن پشتو میں میرا ہمسر کوئی نہیں۔ یاد رہے خوشحال کے پشتو اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ باایں ہمد خوشحال نے تاریخ درست رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا:

”میرا قلم فارسی میں بھی گویا اور روان ہے۔ مگر کیا کروں کہ ہر شخص کو

اپنی مادری زبان پیاری ہوتی ہے“

اور کیوں نہ ہو کیونکہ خوشحال نے اپنی قوم کو جو پیغام دینا چاہا تھا۔ اسکے لیے پشتو زبان ہی سب سے زیادہ موزون تھی۔ لیکن ہلب کی بات اور ہے ان کو فارسی زبان پر کھل دسترس حاصل تھی۔ اور اردو میں جو کلام کہا وہ انکی فارسی شاعری سے زیادہ مقبول ہوا۔ لیکن اس سے غالب کے فارسی کلام کی عظمت پر کوئی آئینہ نہیں آتا۔

ہم غالب کے فارسی کلام (دس ہزار چار سو چوبیس اشعار) کے مقابلے میں خوشحال کے فارسی کلام (ذو حائے سوا اشعار) کو رکھتے ہیں۔ تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کا کیوں بہت زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے فارسی میں نہ صرف غزل گوئی کی بلکہ رباعی، مثنوی، قصیدہ اور قطع کے ذیل میں بھی انکے ہزاروں اشعار موجود ہیں۔ دوسری طرف خوشحال کا تمام تر فارسی کلام پچیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خوشحال کے اتنے کم تعداد میں فارسی اشعار معیار کے لحاظ سے فارسی کے کسی بھی اچھے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری کہتے ہیں:-

”خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں اشعار کی مجموعی تعداد ڈھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں“

(پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ”خوشحال بابا کی فارسی شاعری“)

جہاں غالب کی فارسی شاعری میں مشکل پسندی، مسئلہ تو حید، تصوف، فلسفہ، عشق، حسن پرستی اور حقیقت کو پانے کے لیے پکی تلاش کے جذبے جیسے مضامین پائے جاتے ہیں۔ وہاں خوشحال کی فارسی شاعری میں ایران کا ہمہ گیر فرهنگ و ہنر، فلسفہ، اخلاق و تصوف اور ان کا

ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے دونوں نابغہ شعراء کا لب و لہجہ شیریں اور مترنم ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جہاں خوشحال نے اپنے فارسی کلام میں حسن و عشق کے مضامین کو زیادہ برتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام فارسی میں معنی افرینی، عالی ظرفی، حسرت، دیاس، ذوق و شوق، حرکت و سفر، اندر، منزل، تولیدی، جاوید، نازک و باغی، راء عشق اور درد و فراق کے نادر مضامین پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے فارسی کلام میں شوخی، بیاں اور ندرت خیال بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس پر اتنا اضافہ یہ کہ خوشحال نے اپنے محو و وفارسی کلام میں بھی فارسی اور پشتو کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

خوشحال و غالب

جرات اظہار اور بے باکی

شاعری کے میدان میں جرات اظہار اور بے باکی متنوع الفاظ ہیں۔ ان کے نتیجے میں حق کوئی، صاف کوئی، رنگین بیانی، بہادری اور غیرت جیسے عناصر سامنے آتے ہیں۔ تو دوسری طرف لب و لہجہ میں عیسیٰ، تیزی، یقین، توانائی اور بے نیازی کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض اوقات جرات اظہار اور بے باکی شخصی شاعری کو جنم دیتے ہیں۔ خوشحال و غالب کے کلام میں جرات اظہار اور بے باکی کا اندازہ لگاتے وقت ہمیں علامہ اقبال کا یہ شعر سامنے رکھنا ہوگا:-

آئین جواں مرداں، حق کوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو بائی

خوشحال۔ جرات اظہار اور بے باکی

رماژید نژدہ اور دہ مگذارونہ دتوپک کا

ترجمہ:- میری زبان میں آگ ہے۔ ہندوؤں کی طرح وار کرتی ہے۔

خوشحال کا یہ شعرا کی جرات اظہار پر دلالت کرتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کے لب و لہجہ کو سمجھنے کے لئے اس کے معروضی حالات اور ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم خوشحال جیسے نابینہ شاعر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے دماغ کے پچھلے حصہ میں بار بار انکے مظلوم کے ساتھ اچھے اور برے دونوں قسم کے تعلقات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انکے اپنے خامدانی حالات و تعلقات نے بھی انکی شاعری اور اس شاعری کے لب و لہجہ کو متاثر کیا ہے۔ اس ضمن میں انکی علیست کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب کے علاوہ ایک انسان ہونے کے ناطے خالق نے انکی فطرت میں جو عادات اور لب و لہجہ ودیعت کر دیئے تھے۔ انہیں بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ جناب فضل حق شیدائے خوشحال کے ماحول پر یوں نظر ڈالی ہے:-

”پشتو زبان میں کافی بڑے اور مشہور شاعر گذرے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں تنوع‘ رنگین بیانی‘ شوخی‘ مضمون آفرینی‘ جدت پسندی‘ عمیق مطالعہ‘ باریک مشاہدات اور مختلف علوم کے مطالعہ کے حصول کے لحاظ سے جو عظمت خوشحال خان کو حاصل ہے وہ پشتو کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کے بھی بہت کم شعراء اس کے ہمسرہ ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ انکی شخصیت باغ و بہار ہے ویسی ہی اس کی شاعری بھی نہایت پہلودار ہے اگر ایک طرف وہ سپاہی‘ سالار اور سردار ہے جنگجو ہے اور تگوار کا وطنی ہے فتیاب ہے تو دوسری طرف اس کے کلام میں پازیبوں کی جھنکار .. کی کات .. رن ..

سیاسیات‘ دینیات‘ دنیاوی معاملات‘ ذاتی مشکلات‘ قدرتی آفات‘ نباتات‘ پشتون روایات

جمالیات، اخلاقیات، جنسیات، نئی اصطلاحات، نازک احساسات اور دوسرے موضوعات شکار باز بھنوروں، مورچوں اور رنموں کا بیان ملتا ہے۔ اسکے کلام کا مطالعہ کرنے والے حیران ہوتے ہیں کہ خوشحال کا دامن کتنا وسیع ہے کہ اس میں یہ سب کچھ سما یا ہوا ہے۔ اسکے ذہن میں کتنی وسعت ہے کہ اس سرچشمے سے بے شمار ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اپنے زمانے کا یہ اونچا انسان اور عظیم شاعر مجموعہٴ اضداد ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شعراء پہاڑی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں انکی زبان ٹرش، لمبہ سخت اور کھانا اشنا ہوتا ہے۔

اگرچہ خوشحال کی جائے پیدائش اکوڑہ کے شمال مغربی سمت میں پورساک اور نوشہرہ کے درمیان واقع پہاڑیوں میں ہے۔ اسکے جنوب میں نخلوں کے پہاڑ ہیں۔ اور خوشحال نے افریدیوں، مہمندوں اور سوات کے پہاڑوں اور دروں پر باز کی مانند پرواز کی ہے مگر اسکی زبان کمزری اور کرخت نہیں ہے۔ نرم اور لطیف ہے۔ رواں اور شیریں ہے۔ اس میں اگر ایک طرف لنڈے (دریائے کابل) کی خوش رفتاری اور آہستہ خرابی جھلکتی ہے۔ تو دوسری طرف اباسین (دریائے سندھ) کی بے قابو لہروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اسکی زبان کا آہنگ ان دونوں دریاؤں کے عظیم کاحراج دان ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اٹھکلیاں، حسن، چمک اور کانی زلفوں کے سائے میں آرام ڈھونڈتا ہے تو دوسری طرف جنگ،

ننگ 'ننگ اور مخمر خوں رنگ کی باتیں کرتا ہے۔ چوڑیوں کی باتیں
اور بیڑیوں کی باتیں بھی'

(فضل حق شیدا "خوشحال کی حماسی شاعری")

خانہدانی وجاہت کا جرات اظہار پر اثر انداز ہونا لازمی امر ہے۔ خوشحال کے باپ دادا اور
وہ خود اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنے والد شہباز خان کو حاتم کی
طرح نئی شیر دل اور رستم سے زیادہ تلوار کا وحشی 'شرع پر قائم اور سچا' دادا بچی خان کو سرتاپا
یوسف کی طرح خوبصورت اور قد میں اتنا دراز کہ اگر دوسرا شخص گھوڑے پر سوار ہو تو بچی
خان اسکے ساتھ پیدل چلتے ہوئے بھی قد و قامت میں برابر ہوتا تھا۔ پر دادا ملک اکوڑ کو
خانہدان کے لیے بڑا مقدم حصہ حاصل کرنے والا کہا ہے۔ خوشحال نے ایک شعر میں اپنے
باپ دادا کی میدان جنگ میں شہادت کو یوں اجاگر کیا ہے:-

پلار نیکنہ می شہیدان و گور تہ تللی

پشت پہ پشت می ہنر دادنے آل پہ آل

ترجمہ:- میرے والد دادا اور پردادا شہید ہو کر اپنی قبروں میں دفن ہوئے ہیں۔

پشت در پشت اور آل در آل میرا بھائی ہنر ہے۔

بخرو نی د تیغ راکرہ پہ اصل کنبی پنبستون یم

پلار پہ نیکنہ نہ بی دولتہ بی حشمہ

ترجمہ:- قدرت نے میرے ہاتھ میں تلوار لکھی ہے کہ میں اصل سے پشتون ہوں۔ میں

اپنے باپ دادا کی طرف سے بھی بے دولت اور بے حشم نہیں ہوں۔
محترمہ چاند بی بی سلطانہ حیدر آباد سندھ سے خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر پشاور تشریف لائیں۔ اور اباسین آرٹس کونسل کے زیر اہتمام قومی مجلس مذاکرہ (۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء) میں اپنا پر خیال مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ سے ایک حسب حال اقتباس ملاحظہ ہو:-

”خوشحال کا قلم آتش فوا تھا۔ اس نے واقعات، حقائق اور تجربات کو بڑی صداقت اور جوش کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثنویاں بھی لیکن غزل میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ غرض یہ کہ ان کی نظم ہو یا غزل وہ ہر مقام پر ایک غیرت مند انسان نظر آتے ہیں“

(چاند بی بی سلطانہ ”خوشحال۔ ایک شاعر غیر متند“)

شاعری کی زندگی کے تجربات اسکی شاعری کی اساس بنتے ہیں۔ تعبیری شاعری کو جنم دیتے ہیں۔ بلکہ میں تو اسے تعبیری شاعری کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ ہم خوشحال کی شاعری کو اس لیے تعبیری شاعری سمجھتے ہیں کہ اس میں اپنی زندگی کے تجربات کا انچوڑ اپنی قوم کے تناظر میں دیکھتے تو خوشحال کی پوری شاعری کا مقصد مکمل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ایسی شاعری میں لذت و آزار، مسرت و غم اور وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللطیف جس قدر شاعری کی زندگی کے تجربات وسیع اور مختلف النوع ہو گئے

اسی قدراں کے مجموعی معانی کی ہم آہنگی بڑی ہوتی جائے گی۔ اور اسی قدر اسکی شاعری بھی بڑے درجے کی ہوگی۔

خوشحال بابا کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ گفتار اور کردار دونوں کے غازی تھے۔ جہاں تک بے باکی کا تعلق ہے تو صرف گفتار میں بھی بے باکی آ سکتی ہے۔ مگر کردار یا عمل میں بے باکی ”چیزے دگراست“ ایسا کرنے کے لیے شیر کا دل چاہیے۔ روخان یوسفزے یہی بات ان الفاظ میں کہتے ہیں:-

”محترم قلمند صاحب نے اوپر جو کچھ فرمایا ہے اسکی موافقت اور تناظر میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ معلوم ادبی تاریخ میں اکیلے خوشحال بابا وہ شاعر اور تابع ہیں جنہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اور جو کچھ کیا تو بعد میں وہ کہا بھی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے کسی قسم کا سیاسی، سماجی اور مذہبی دباؤ، مصلحت یا کسی اور جوڑ توڑ کی پروا نہیں کی اور بڑی بہادری اور مردانگی کے ساتھ ایسی باتوں اور حقیقتوں کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ایسی باتیں اور حقیقتیں کہ جن کا اظہار انکے دور میں تو کیا آج بھی ہماری تہذیب میں کرنا ایک جرم عظیم گردانا جاتا ہے۔ پر یہ صرف ایک خوشحال ہی تھا جس نے کسی کی پروا نہیں کی کیونکہ:-

دروغ و ٹیل ہفہ کا چپی ٹی ویرہ وی لا طمع
خوشحال پہ دا لہ نہ دیے حق بہ وائی خو ٹی سرشتہ
ترجمہ:- جھوٹ تو وہ شخص بولتا ہے جسے کوئی ڈر یا طمع ہو۔ خوشحال کے لیے ایسی کوئی
رکاوٹ نہیں ہے۔ جب تک اس کا سر باقی ہے وہ حق بات کہتا رہے گا۔

اور اسی دعویٰ اور دلیل کی بنیاد پر ہم خوشحال کو گفتار اور کردار کا حامل شاعر کہتے ہیں
(روحان یوسفی "گفتار اور کردار کا شاعر")
بدی کو دنیا کی تمام اقوام نے برا جانا ہے۔ اور نیکی کو اچھا۔ اسلام ہمیں بدی کو ہاتھوں سے
روکنے یا زبان سے روکنے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننے کی تلقین کرتا
ہے۔ مگر خوشحال ان سب سے ایک قدم اور آگے جاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ویال نی تہول زما پہ غارہ
فتوئے د عدل دہ خو چپی بدان وژنی
ترجمہ:- (بے شک) جتنے بدوں کو مار سکوا رو۔ ایسا کرنے کا سارا وبال میری گردن پر
کیونکہ یہ عدل کا فتوہ ہے۔

خوشحال نے مغلوں کی قید کے دوران رخصتور (بے پور) کے بندی خانے میں وطن کی یاد
میں ایک شعر کہا ہے:-

پشتنی جونہ د زلفی باد تہ نیسی
چپی شمال نی بوئی راؤری رتنہ بور کینی

اس شعر کی نوعیت سے پہلو ہے۔ اس کے کہنے سے ایک تو یہ مقصود ہے کہ شاعر اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دیار غیر میں محبوس ہے۔ دوسرا تاثر جو شاعر اس شعر سے دینا چاہتا ہے وہ حب وطن کا ہے۔ لیکن ایک تیسری بات اس شعر کے باطن میں چھپی ہوئی وہ بے باکی ہے جو خوشحال ہی کا حصہ تھا۔ آج سے لگ بھگ ساڑھے تین صدیاں پہلے اس بندہ خدا خوشحال میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی اپنے وطن کی حسیناؤں کو کہتا ہے کہ اپنی زلفیں کھول کر کھڑی ہو جاؤ تاکہ بادِ شمال تمہاری زلفوں کی خوشبو دیکھو۔ اڑالائے۔

خوشحال جب مغلوں کی پانچ سالہ قید و نظر بندی سے آزاد ہو کر اپنے وطن لوٹا تو اسکی زندگی میں دو بڑی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس نے نہ صرف مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ مغل سلطنت بہر حال ایک غیر ملکی اور بیرونی طاقت نے قائم کی ہوئی تھی بلکہ اسکی اپنی اولاد اور دوسرے رشتہ دار (پچا وغیرہ) مغلوں کے ساتھ مل کر خوشحال کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔ خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام اور اسکی ماں کے متعلق خصوصاً اور دوسرے بیٹوں کے خلاف عموماً جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف تاریخ کا حصہ ہے بلکہ خوشحال کی بے باکی اور حق گوئی پر بھی دلالت ہے۔ یہ دیکھیں کہ خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کے متعلق کیا کچھ کہا ہے جناب ایوب صابر مرحوم نے اس قبیل کے اشعار کا یوں ترجمہ کیا ہے:-

”یہ اچھا ہے کہ ایک حاملہ کے بطن سے سانپ پیدا ہو جائے نہ یہ کہ کوئی ناموسار بیٹا پیدا ہو“

”صد اعلت ہے اس وطن پر جس سے بہرام جیسے پوت پیدا ہوں“

”نالائق بیٹا ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے لطن سے خنزیر پیدا ہو“

”وہ شخص ایک لمحے کے لیے بھی عذاب سے محفوظ نہ ہوگا جس کے لیے اپنا بیٹا دوزخ بن جائے“

”ناخلف اولاد کسی کی بھی بڑی نہ ہو کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ قسم قسم کے فساد کرتی ہے“

”اکوڑ خان، یحییٰ خان اور شہباز خان سب سونا تھے۔ ان سب نے اپنے ادوار بڑی شان سے گزارے۔ اب جبکہ بہرام خان کی باری آئی ہے تو خود کچھ لو اس نے ان نامداروں کی مٹی کس طرح پلید کر دی ہے“

”اے بہرام، تمہیں سرداری کا ہنر نہیں آتا۔ تم نے اپنے دور میں سردار کو بدنام کر دیا ہے“

”جود کھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے کہ بہرام لشکر کشی کر رہا ہے۔ اولوالعزم خوشحال خان پر“

”میرا یہ ایک عیب میری سوخویوں پر بھاری ہے کہ بہرام میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں“

”اچھا فرزند باپ کے گھر کی روشنی ہوتا ہے اور بُرا فرزند ظلمت ہوتا ہے۔ جب ایسے کتے اس سے پیدا ہوئے ہیں تو مجھے شک گزرتا ہے کہ خوشحال کب انسان تھا“

(ایوب ساہو ”خوشحال خان خٹک کا الیہ“)

یہی نہیں خوشحال خان کی بے باکی نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کی ماں کو بھی بہرام کے پیدا

کرنے پر مورد الزام ٹھہرایا۔ خوشحال کا کہنا تھا کہ ایک بد ذات اور چھوٹے خاندان کی عورت بد ذات اور کمینہٴ اولاد کو جنم دیتی ہے۔

خوشحال نے جرات اظہار اور بے باکی کے سلسلے میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا:-

کہ مازدہ وے چہ دزویو ہسی کار دے

ما بہ زنا کاوہ نہ کور د کور روزگار

ترجمہ:- اگر مجھے (ان) بیٹوں کے کڑوت سے پہلے سے معلوم ہو جاتے تو میں زنا کر لیتا مگر گھر گھر ہست کے دھندے میں کبھی نہ پڑتا۔

خوشحال حق گوئی میں اپنی مثال آپ ہے۔ زندگی میں اسے جن لوگوں سے واسطہ پڑا۔ ان کا خوشحال نے بغور مطالعہ کیا۔ اور جب ان کے متعلق اسے سب حقائق معلوم ہو گئے تب اس نے ہر ایک کو اپنی حق گوئی کے ذریعے آڑے ہاتھوں لیا۔ چاہے وہ مغل تھے۔ یوسفزی تھے مہند تھے افریدی تھے حتیٰ کہ اپنے قبیلے خٹک کو بھی خوب لٹاڑا ہے۔ اپنے کلام میں ایک موقع پر پوری افغان قوم کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یوں خوشحال خان نے حق کو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو شاعر افغان شناس بھی ثابت کر دیا:-

”اس پہاڑی ملک میں اگر آج کوئی اچھے پشتون کے نام سے یاد کئے

جاتے ہیں تو وہ مہند، نگلش اور ک زئی اور آفریدی ہیں۔

مہندوں کے کتے نگلش لوگوں سے بہتر ہیں

اگرچہ مہند کتوں سے ہزار گنا بدتر ہیں

اور کزنی چوہڑے ہیں آفریدہاں کے
 گوکہ افریدی خود سب کے سب چوہڑے ہیں
 یہ سب پختونخوا کے اچھوں میں شمار ہوتے ہیں
 تو جو بُرے ہیں انہیں کون انسان کہے گا
 ”زندہ پشتونوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے
 جو اچھے تھے وہ گور کے نیچے دبے ہوئے ہیں“

اپنے اہل قبیلہ (نٹکوں) کو یوں سخت دست کہا ہے:-

”نٹکوں کے کتے بہتر ہیں پوسٹروں سے

اگرچہ خود نٹک اپنی عادات میں کتے کی طرح بیکار ہیں
 ہزاروں نٹکوں نے میرے سامنے لاف زنی کی تھی آج ایک بھی نہیں ہے
 کسی بھی دوسرے کی دوستی نٹکوں سے بہتر ہے۔

اے خوشحال ہر اس شخص سے یاری اور مردت کے آرزو مند نہ ہونا

جس نے دریائے انک کا پانی پیا ہو

نٹک لوگوں کی دوستی سے توبہ ہے توبہ

کیونکہ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو میرا دل رکھ سکے

میرا دل نٹکوں سے اتنا ناخوش ہے

کہ پوری نٹک قوم کے نام سے بھی توبہ ہے

پشتون ہیں تو آدم زاد

لیکن عادات میں ہیں ہناد

نہ یہ حکمت رکھتے ہیں نہ عقل

خوش رہتے ہیں آماوہ بہ فساد

ایک دوسرے کی گردن پر سوار ہے

اسی لیے ان کو بلا کے نام سے پکارا گیا ہے

اے خوشحال وہ تو شکر کرو

کہ محکوم نہیں ہیں آزاد ہیں

یہ (افغان) عفریت کی اولاد ہیں یا دیوزاد ہیں یا درندوں کے بچے ہیں

میں افغانوں کو آدم کی نسل میں شمار نہیں کرتا

ان کو جتنی بھی چند و نصیحت کرو

ان کو اپنے باپ کی نصیحت بھی اچھی نہیں لگتی

گو کہ خوشحال بابا اوائل عمر میں مغلوں کی ملازمت میں خوش تھے۔ اور اپنی پوری صلاحیتوں کو

بروئے کار لا کر اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہے۔ لیکن بے گناہی کے باوجود انہیں

مغلوں کی قید کاٹنی پڑی تو وہ سراسر مغلوں کے خلاف ہو گئے۔ قید کے دوران انہوں نے

مغلوں کے خلاف اپنا بہترین کلام لکھا۔ شہنشاہ وقت اور نگزیب کے خلاف خصوصاً اور

مغلوں کے خلاف عموماً ایسی آگ برساتی جو روز بروز فزوں تر ہوتی گئی۔ جہاں شعراء

بادشاہ وقت کے دربار میں حاضری اور تعریف شاہ میں اپنا قصیدہ پیش کرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں وہاں خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہنشاہ وقت اور اسکے درباریوں اور حواریوں کو خوب برا بھلا کہا ہے۔ اور ان کو ان کے کرتوتوں کا صحیح عکس اپنے کلام کے آئینے میں دکھایا ہے:-

”اگر دیکھو تو اورنگ بادشاہ گمراہ ہے
 کیونکہ اس کو اپنے پرانے کی پہچان نہیں ہے
 اورنگ بادشاہ کے دور میں آرام نہیں
 کون کہتا ہے کہ یہ جہان آرام کی جا ہے
 جیسا کہ چہرے سے سیاہ نظر آتا ہے
 (اورنگزیب) اندرون سے بھی اتنا ہی سیاہ ہے
 اگر اسکی نیت کو دیکھو تو ایک یزید ہے
 لیکن اسکی طاقت کو دیکھو تو اہل اللہ ہے
 مجھے اورنگزیب کا عدل و انصاف خوب معلوم ہو گیا ہے
 اس کی اچھی مسلمانی بھی اور اس کا اعتکاف بھی
 اپنے سکے بھائیوں کو باری باری قتل کرنے والا
 اور اپنے باپ کو نظر بند کرنے والا
 کوئی ہزار بار زمین پر اپنا سر مارے

یا جھک جھک کر نمازیں پڑھے
 جب تک اچھے عمل کے ساتھ ساتھ نیت بھی ٹھیک نہ ہو
 تو ساری عبادت اور اطاعت فضول ہے
 جسکی زبان اور دل کے راستے الگ الگ ہوں
 تو اسکا جگر حنجر سے شکاف شکاف ہو جائے
 سانپ کا بدن باہر سے جتنا خوبصورت نظر آتا ہے
 اندر سے اتنا ہی نا صاف ہوتا ہے

یہاں دوں کا عمل زیادہ اور کہا کم ہوتا ہے
 مگر تاروں کا عمل کم اور لافیں زیادہ ہوتی ہیں
 اگر یہاں (اس دنیا میں) خوشحال کا ہاتھ ظالم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا
 تو قیامت کے دن خدا میرے دشمن (اور نگزیب) کو معاف نہ کرے۔“

تعارف میں بے باکی اور جنسی کلام کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب وہ مقام
 آ گیا ہے کہ خوشحال کی اس بے باکی کو بھی متعارف کرایا جائے۔ مقصد وہی جرات اظہار
 ہے۔ جو بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خوشحال کا جنسی کلام اس لیے بھی
 پیش کیا جانا چاہیے کہ جنسیات سے کسی کو بھی مغر نہیں اور اگر یہ ہماری حیات کا اتنا ضروری
 امر ہے تو پھر اسے وہی اہمیت دی جائے جس کی یہ مستحق ہے۔ خوشحال کی جنسی شاعری سے
 کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:-

ترجمہ:- ”اگر سفید ریش آدمی اپنی ڈاڑھی خضاب کے ساتھ کالی کرے
اور اپنے آپ کو اپنی جوان بیوی کے سامنے جوان سمجھے
تو (یاد رکھو) جوان بیوی کا دل بوڑھے خاوند سے بے زار رہتا ہے
اگر چہ وہ اپنی جوان بیوی کو بڑے ماز و نعم سے رکھے“
”شکریوں کے بوسے بوڑھے کو جوان کر دیتے ہیں
یہ بات خوشحال کی آزمائی ہوئی ہے“
”عشاق جب اپنے سروں کی بازی لگا دیتے ہیں
تب جا کر دلبروں کے نرم اور غمگینی ہو نٹوں کو چومنا نصیب ہوتا ہے“
”وہ اپنا سفید منہ میرے کانوں کے پاس لائی
اور نہایت نرمی سے کہا کہ
میں تو اپنی زلفیں کھول کر تیرے پنک کے پاس آئی ہوں
پر میری جان تم ابھی تک سوئے ہوئے ہو“
”اگر کبھی بھی میرا ہاتھ تجھ تک پہنچ سکے
تو تیرے سفید چہرے پر اپنے دانتوں کے سیاہ نشان چھوڑ دوں گا“
”اپنے دونوں ہونٹ خوشحال کے ہونٹوں پر رکھ دے
کہ لوگ طوطوں کو شکر ہی کھلاتے ہیں“
”کوئی بھی اس بے درد زمانے کو مطلع نہ کرے

کیونکہ آج محبوبہ نے خوشحال کو چھپا کر بوسہ دیا ہے۔
 ”یا اپنا سرا اپنی گردن کے خون سے رنگ دوں گا
 یا پھر تیرے خوبصورت ہونٹ چوم لوں گا“

غرض یہ کہ خوشحال میں انسان کی جنسی ضروریات کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ یہ چند اشعار وہ سب کچھ نہیں جو خوشحال کے جنسی کلام میں پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ خوشحال کا اپنے شہوانی جذبات پر جرات اظہار اور بے پاکی کا زندہ ثبوت ہیں۔ اسی سلسلے میں خوشحال کی یہ نمائندہ غزل دیکھیں جو ایک نو خیز لڑکی کو دیکھ کر لکھی گئی ہوگی:-

ترجمہ:- ”آج میری محبوبہ بدی ہے جو علالتے بھر میں آشکارا ہے
 ابھی کم عمر لڑکی ہے سر کے بال کٹے ہوئے

جسے ابھی اپنے باپ بھائی سے بھی شرم و حجاب نہیں

سونے کا ایک چھوٹا سا لال رنگ کا بلاق ناک میں پڑا ہوا

اور رانیں چھوٹی چھوٹی سی، نستین چہرے والی سر جبین

سنبل کی طرح بالوں والی پری

ہونٹ جیسے شکر، خوش خوش (رہنے والی) ہر فی کی سی آنکھوں والی

پھول سے گالوں والی

قد میں عرصہ کا چیز، کمر یاں کی طرح پتلی، سر سے پاؤں تک ایک قلمی تصویر

دل کی پتھر، شوخ چنگل، ظلم کی عادی، دل دکھانے والی

میں تو اس کی ایک ایک نگاہ پر جان دیتا ہوں
 اور اسے میری پرواہ بھی نہیں ہے
 جب اسکے آگے کوئی میرا نام لیتا ہے
 تو گالیوں پر اترا آتی ہے
 کیا کروں اس کا کیا علاج اور کیا تدبیر کروں
 ڈر کے مارے دم نہیں مارا جاتا
 ادھر تو اس کی خوب دلی ہے
 اور ادھر مجھے اس سے بے حد محبت ہے
 خدا را مجھ غریب پر یہ کیا بلا آ پڑی
 در پردہ راز و نیاز چاہوں تو اسے ان باتوں کا علم ہی نہیں
 اگر تہہ رز بردستی چلاؤں تو اس کے گھرانے والے بڑے خوشخوار ہیں
 دولت کے عوض مانگتا ہوں تو وہ بے حساب دولت طلب کرتے ہیں
 یہاں نہ زور سے کام لگتا ہے نہ زور سے
 اور دنیا میں یہی دو وسیلے ہیں
 خوشحال کو بھروسہ خدا پر ہے اور اسے شیخ رحمکار یا پھر تم پر ہے
 آئیے خوشحال کی حق گوئی اور بے باکی کو ایک اور زاویہ سے دیکھتے ہیں :-
 ڈاکٹر اقبال کا ایک شعر ہے :-

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روہا ہی

خوشحال خان خٹک اور ڈاکٹر اقبال اس شعر کی زندہ مثالیں ہیں۔

خوشحال کی حق گوئی اور بیباکی ان کی کلیات سے واضح ہے اور انکی

جوانمردی انکے کردار سے ظاہر ہے۔ خوشحال خان کے کردار شیر اور

شائین ہیں اور انکی شاعری شیر اور شائین کے کردار کی ترجمان ہے۔

خوشحال خان کی شاعری میں جتنی حق گوئی اور بیباکی ہے میں نہیں کہہ

سکتا کہ کسی اور شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت کے ساتھ پائی

جاتی ہو۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی حق گوئی اور

بیباکی ایک ایسا نادر نمونہ ہے کہ خوشحال خان کے علاوہ شاید ہی کسی

دوسرے شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت سے پائی جاتی ہو۔

(میاں سید رسول دسا "خوشحال خان اور اقبال میں حق گوئی اور بیباکی")

اسی لیے تو علامہ اقبال نے خوشحال کے متعلق کہا تھا:-

خوش سرود آں شاعر انفاں شناس

ہر کہ بیند' باز گوید بی ہر اس

راز تو سے دید و بے باکانہ گفت

حرف حق با خوئی رندانہ گفت

خوشحال کے کلام سے چند اشعار جن میں جرات اکھبرا کا عنصر بد رجحانم موجود ہے:-

مست یم منے پرست یم رندی کرمہ کرمہ کرمہ

وآورہ محتسبہ باذہ خورمہ خورمہ خورمہ

ترجمہ:- میں مست ہوں اے پرست ہوں رندی کرتا ہوں کرتا ہوں کرتا ہوں۔

سن اے تختب میں شراب پیتا ہوں پیتا ہوں پیتا ہوں۔

سر پہ دار لک شوے بنہ دے

نہ لک شوے پہ پیغور

ترجمہ:- طعنے کے بوجھ تلے سر جھکانے سے دار پر

سر کا لنگ جانا بہتر ہے۔

خو وانخلی لہ غلیمہ انتقام

مرد نہ خوب کا نہ خوراک کا نہ آرام

ترجمہ:- مرد جب تک اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لے

اس وقت تک نہ سوتا ہے نہ کھاتا ہے اور نہ ہی آرام سے بیٹھتا ہے۔

د پیپلو پانہی خورہ پہ غرہ کبھی اوسہ

نہ چہ پان د ہندوستان خوری زما جندہ

ترجمہ:- اے میرے نو جوان بیٹیل کے بچے کھا اور پھاڑوں میں رہ

نہ کہ ہندوستان کے پان کھاتا پھرے

د منت دلرو کہ مرم پکار مہی نہ دی
کہ علاج لرہ مہی راشی مسیحاحہم
ترجمہ:- اگر میرے علاج کے لئے مسیحا بذات خود بھی آ جائے تب بھی مجھے منت کی دوا
قبول نہیں ہے چاہے میں مری جاؤں۔

غالب

جرات ، اظہار اور بے باکی

جب ہم غالب کے ذاتی اور معروضی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو انکی خود پرستی کا
عنصر انکی پوری زندگی اور انکی شاعری پر اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی شخصیت پر
بحث کرتے ہوئے اسی کتاب میں غالب کی خود پرستی اور اسکے اثرات کے بارے میں
ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالے ”غالب کی شخصیت“ سے جو اقتباس پیش کیا گیا تھا وہ اس پوری
صورت حال کو سمیٹنے کے لئے کافی ہوگا۔ اس اقتباس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:-

”غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے
وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت، چوہ، آب، پنشن، نصب، خلعت،
دربار تک رسائی وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ (چنانچہ) دوسرے لفظوں میں

غالب اپنے شعر میں خود کو احساسی اور جذباتی طور پر لوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے۔

یہاں خاندان و جاہت اور پیٹھ آباء کو غالب کی خود پرستی کی وجوہات میں شامل کیا گیا ہے۔ دونوں وجوہات پر بھی غالب کی شخصیت پر بحث کے دوران سیر حاصل گفتگو ہو چکی یہاں صرف اتنا عرض کرتا ہے کہ غالب کے مزاج کی تشکیل میں ان عناصر کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کے اندر زندگی کی رقت کچھ زیادہ ہی توانا تھی اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر ان کی زندگی کے آخر تک رہا۔ اگلے آخری زمانے کے مکاتیب اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ خاندانی و جاہت اور پیشہ آبا غالب کی شخصیت پر اثر ڈالتے ڈالتے ان کی جرات اٹھار اور بے باکی پر کس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں:-

پروفیسر یوسف زاہد غالب کی خاندانی و جاہت اور پیٹھ آباء کے بارے میں فرماتے ہیں:-

”یعنی وہی حب و نسب پر فخر، حد سے بڑھا ہوا احساس برتری،

خود دنگری، اپنی ذات کو دوسروں سے بلند سمجھنا، وہی سپاہیانہ لب و لہجہ،

قوت مردانگی، مزاج کا جوشیلا پن، اپنی ہی بات کو صحیح خیال کرنا، کسی

کے آگے سر نہ خم کرنا، وضعداری کی سختی سے پابندی اور اپنی آن پر

حرف نہ آنے دینا، یہ وہ خصوصیات تھیں جو غالب کو ورثے میں ملی

تھیں اور جن کا اظہار ان کی شاعری میں چاہتا رہا ہے۔ بلکہ اکثر وہ

خود اس پر بڑے فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کے

اس پہلو نے بھی ان کے لب و لہجے کی توانائی اور تندی و تیزی میں
نمایاں حصہ لیا ہے۔

غالب از خاک پاک تو را نیم
لا جرم در لب فرو مندیم
شک ز اویم و در نزد ہے
بسترگان قوم پیوندیم
ایکم از جماعتِ اتراک
در تمامی زمانہ در چندیم
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گیری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

(پروفیسر یوسف زاہد "غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ")

غالب کی خود پرستی ہی ان کے لہجے کی قوت و جوش کی واحد وجہ نہیں تھی۔ غالب کے زمانے
میں بدلتی تہذیبی فضا نے بھی ان کے لب و لہجے کی تیزی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مغلیہ
حکومت کے جاگیرداری نظام سے مسلک معاشرتی حالات کے زیر اثر اردو شاعری کے
لب و لہجے میں تیزی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غالب سے پہلے اردو شعراء ہندوستان
کی پرانی تہذیب سے چٹے رہنے اور ملی دکنی کی پیروی کرتے کرتے اردو شاعری کو بے بسی
اور محرومی کے سوا کچھ بھی نہ دے سکے۔ ظاہر ہے اس سے اردو شاعری کے لب و لہجہ میں

زندگی اور توانائی کی آخری رمق بھی مفقود ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ غالب ایک منفرد اور توانا لب و لہجے کے ساتھ ہندوستان کے ادبی افق پر نمودار ہوئے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آتشیں سے بال عطا جل گیا

چونکہ غالب میں ذوقِ تجسس بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لیے وہ نت نئے حقائق کی تلاش کر کے ان پر اظہارِ خیال کرتے۔ انہوں نے قیس کی صحرانوردی میں حرکی توانائی دیکھی اور اسے تسلیم کر لیا لیکن فرہاد اور منصور حلاج کی قربانیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس سے انکی شاعری کے لب و لہجے کو ایک اور سمت بھی مل گئی۔

آئیے غالب کے ان اشعار کا لطف اٹھاتے ہیں جن میں غالب نے فرہاد اور منصور حلاج کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا ہے:-

تجسّے بغیر مر نہ سکا کو بہن اسد
سرکشۂ غمارِ رسوم و قیود تھا
عشق و مزدوریِ عشرت کہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نگو ہی فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تک ظرفی منصور نہیں

غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں انسانی نفسیات سے دلچسپی تھی
انکی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو دوسروں کی نفسیات کو پرکھنے کا عمل اور دوسرے خود اپنی ذات
کے معنوی وجود کا احساس۔ اسے احساس ذات کہہ لیجئے یا عرفان ذات اس کے نتیجے میں اپنا
آپ ہمارے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ آپ انکی اچھائیاں دیکھ لیں اور چاہیں تو اپنی
شخصیت کی کمزوریاں اور بد وضع گوشے۔

ہنگامہ زبونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اگر جذبے، فکر اور تخیل کے احتجاج سے الفاظ میں موسیقیت پیدا کی جاسکتی ہے تو ترکیبوں
تشبیہوں اور استعاروں سے شعر میں اس سے بھی زیادہ جادو جگایا جاسکتا ہے۔ غالب نے
اس صفت گری میں بھی کمال پیدا کر کے اپنی شاعری کے لب و لہجے کو سنوارا:

”غالب کے ہاں جو تازہ و مختلف استعاروں، تشبیہوں اور خصوصیات سے

ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے اس میں بھی دراصل یہی انفرادی ایج
دکھانے کی کوشش کا درما ہے۔ اس کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے
ہیں۔ اس لیے اس نے انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی
تادور اور منفرد تشبیہات، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس نے

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کے انداز بیاں میں جوتازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ اس نے اپنے اظہار مطلب کے لیے نئے سے نئے حیرائے تلاش کئے ہیں۔ بحیث میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں۔

(آفتاب احمد ”اردو شاعری میں غالب کی اہمیت“)

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ہر شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتیہ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

ذمہ دے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

ننگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد

ہے چراغاں خس و خاشاک گستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی و تندگی 'توانائی' مردانگی اور یقین سے پراشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہرانہ و باغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کرد و ام ایمان خود را دست مزد خویش

می تراشم بیکر از سنگ و عبادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب و لہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب و لہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیمہ ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز و تند لب و لہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز و تند لب و لہجہ لئے ہوئے نہیں ہیں۔ آئیے ایسے اشعار کا بھی مزہ اٹھائیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کے اندازِ بیاں میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ اس نے اپنے اظہارِ مطلب کے لیے نئے سے نئے پیرائے تلاش کئے ہیں۔ بحیثیت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں۔“

(آفتاب احمد "اردو شاعری میں غالب کی اہمیت")

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا دہشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ابھرتی آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش پرستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنہ شور قیامت کس کے آبِ دگل میں ہے

ڈھونڈے ہے اس مفعی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

نمک گرم سے اک آگ چلتی ہے اسد

ہے چہ اغان خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی و تندہی 'توانائی' مردانگی اور یقین سے پراشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہرانہ و باغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کرد و ام ایمان خود را دست مزد خوشتن

می تراشم چیکر از سنگ و مہادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب و لہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب و لہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیمہ ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز و تند لب و لہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز و تند لب و لہجہ لئے ۱۱۰۰ نہیں ہیں۔ آئیے ایسے اشعار کا بھی مزہ اٹھائیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

یہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ ملے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

سمجھنے دے مجھے اب ناامیدنی کیا قیامت ہے
کہ دامن خیال پار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مختصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دہلی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

لے تولوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اسد مجھ میں ہے اس کے بوسے پاکی کہاں جرات
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیر ادب کاٹے

نہ لڑنا صح سے غالب کیا ہوا مگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلا ہے گریباں پر

پھر جی میں ہے کہ دردِ چ کسی کے پڑے رہیں
سر زیم بار منت درہاں کئے ہوئے

نے حیرت کماں میں ہے نہ صیاد کہیں میں
گوشتے میں نفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب سے کشی تو کرتے ہی تھے۔ ان کے سے آلودہ اشعار بھی کچھ کم خوار نہیں رکھتے۔
قارئین کی دلچسپی کے لیے ایسے چند اشعار حاضر ہیں کہ یہ بھی مرزا کا ایک لب و لہجہ ہے:-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

ساقیادے ایک ہی ساغر میں سب کو سے کہ آج
آرزوئے بوسے لب ہائے میگوں ہے مجھے

رات کے وقت سے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

جب سے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

رات اپنی دھرم پہ سے اور صبح دم
دھوئے دے جلد احرام کے

کہاں سے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتکا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے سفر بنارس و کلکتہ کا بیان پہلے گزر چکا۔ اس سفر سے واپسی پر غالب نے جو فراموش لکھیں۔ وہ جنسیات کے ذمے میں تو نہیں آتیں لیکن ان اور ان سے پہلے اپنی ایک محبوبہ کی موت پر لکھی ہوئی غزل میں غالب کا شعری لب و لہجہ جنسیات اور حسن پرستی کے بین بین میں چھپتا ہے۔ غالب نے اپنی محبوبہ کی موت پر جو غزل لکھی اسکے چند اشعار:-

عمر بھر کا تو نے بیان وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھینا نقاب خاک میں

ختم ہے الفت کی تجھ پہ پردہ داری ہائے ہائے

کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تاری برشکال

ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

اس کے کئی سال بعد کلکتہ سے واپسی پر غالب نے یہ اشعار لکھے :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نہیں

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے ملر آ کہ ہے غضب
 وہ ناز نہیں بیتان خود آرا کہ ہائے ہائے
 صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حق نظر
 طاقت رہا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

غالب نے ٹککتے جاتے ہوئے بتارس کی سیر بھی کی۔ واپسی پر بتارس کے متعلق جو مشنوی لکھی
 ہے اس میں ”خراہش گیرائی“ کا اظہار بہت صاف صاف ہے:-

زرنگیں جلوہ ہا عارنگری ہوش
 بہار بسترد نو روز آغوش
 بہ تن سرمایہ افزائش دل
 سراپا مژدہ آسائش دل

غالب سلیم الخیال انسان تھے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ حد جنسیت یہاں آ کر ختم ہوتی
 ہے:-

زچشم و دل بہ تماشا قمع اندوزیم
 زجان دتن بدارا زیاں بگردانیم
 گہے بہ لا بہ سخن با ادا بیا میزیم
 گہے بہ بوسہ زباں درد ہاں بگردانیم

اور یہ حسرت بھرا شعر:-

تکلف برطرف لبِ سخنِ بوس و کنار اتم

ذرا ہم باز چیں دامِ نوازشِ ہائے پنہاں را

مرزا کے لب و لہجہ کی ایک اور قسم وہ ہے جو وہ خالص اردو زبان استعمال کرتے وقت برہیں۔ اس میں فارسی الفاظ و تراکیب کم ملتی ہیں۔ اور یہ لب و لہجہ اپنا ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کی چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی اردو غزلوں کے چند اشعار دیکھئے اور لب و لہجہ پر نظر رکھیئے:-

چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری

اور پھر وہ بھی زبانی میری

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہے

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کوئی دن مگر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کہتے ہیں کہ غالب کے شاعرانہ لب و لہجہ کے بڑے بڑے عمرک انکی شخصیت میں موجود انانیت پُر جوش الفاظ کا استعمال 'ان الفاظ کا صوتی آہنگ اور زیر و بم' موسیقیت 'شوقی' جنسیات و حسن پرستی اور بعض اوقات فارسی الفاظ و تراکیب سے پاک خالص اردو الفاظ کا استعمال ہیں۔ مجموعی طور پر انکے فارسی کلام میں جوش و ولولہ اور مردانہ وقار نہ رنگ انکے اردو کلام سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ غالب کا لب و لہجہ انکے اردو کلام میں متوازن سطح پر رہتا ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام کے مطابق ان کے متوازن تحت اشعار کو یہ گوارہ نہ تھا کہ وہ فور جذبات سے جس تناسب جاتی رہے۔

مگر غالب کو ہم ناخن نہ مانتے اگر ان کا یہ شعر ہماری نظروں سے نہ گذرتا:-

میں جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ

خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

خوشحال و غالب کی شاعری میں حُسن و عشق

”حسن کیا ہے؟ اس سیدھے سے سوال کا جواب مشکل بھی ہے اور
 وحیدہ بھی۔ حسن سرور انگیز بھی ہوتا ہے اور نظر افروز بھی۔ وہ جسم سے
 منزہ بھی ہوتا ہے اور جسم سے وابستہ بھی۔ اس کی پہچان فطری ہے اور
 اس پہچان کی تطہیل نے فلسفہ و فکر کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں۔
 سقراط (۳۹۰ ق م۔ ۳۹۹ ق م) کے خیال میں حسن ذات الہی کا
 مظہر ہے اور تناسب وہم آہنگی اس کے ناگزیر اجزا ہیں۔ افلاطون کی
 نظر میں یہ ”خیر محض“ کا فیضان ہے اور اس کو محسوس کرنے کے لیے
 ذہن کی رفعتیں ضروری ہیں۔ حسین ترین شے وہ ہے جو رفیع ترین
 ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ ارسطو (۳۸۳ ق م۔ ۳۲۲ ق م)
 افلاطون کے نظریے کو عقلیت کا رنگ دیتا ہے۔ لیکن اس سے بات
 بدلتی نہیں۔ حسن پھر بھی ایک مظہر رہ جاتا ہے۔ اور حسین صرف عقل کا
 خدایا کائنات کی ذات“

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کا کاخیل ”خوشحال خان کا تصور جمال“)

حسن کی اس تعریف کے بعد عشق اور حسن و عشق کے باہمی تعلق کو معلوم کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ اسلئے آئیے پروفیسر حمید اللہ خاں نے اس سلسلے میں جو وضاحت کی ہے اس سے حائکاری حاصل کریں:-

”حسن و عشق کو ہم یہاں بطور ایک ملی جلی حقیقت کے دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے۔

شوقی حسن و عشق ہے آمینہ دار ہم و در

خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا کچھ

اس یکانیت کے باوجود ہم حسن و عشق کے درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں۔ حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں یقیناً ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے“

(پروفیسر حمید اللہ خاں ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

اب ہم خوشحال و غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا جائزہ لیتے ہیں:

خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق

حسن

گو کہ حسن و عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا جائزہ لیتے وقت اگر ہم ان دونوں کو الگ الگ برتیں اور اسکے بعد (یا اس عمل کے دوران بھی) ان کا باہم ملاپ ہو تو یہ نہ صرف ایک دلچسپ امر ہوگا بلکہ ہم موضوع کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کر پائیں گے۔

تعارفی کلمات میں حسن کی جو تعریف کی گئی ہے اگر اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ بعض انسان پیدا نشی حسن شناس ہوتے ہیں تو کیسا ہو:-

”خونخاں نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس مزاج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ نباتاتی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک وہ کونسا موضوع رہ جاتا ہے جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو“

(ڈاکٹر اقبال صمیم خٹک ”خوشحال اور جمالیات“)

خوشحال نے انسانی حسن کے موضوع پر گراں مایہ اشعار چھوڑے ہیں لیکن ان میں سے جس شعر کو حسن کے ضمن میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور جسے قبول عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے یہاں بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے:-

پہ خان او پہ جہان کنبی نہا دوہ خیزہ دی او کنبلی

پہ خان کنبی دوارہ ستر گئی بہ جہان کنبی وارہ کنبلی

ترجمہ:- اپنے آپ میں اور اس پورے جہان میں میں نے دو چیزیں پسند کی ہیں۔

اپنے آپ میں دونوں آنکھیں اور جہان میں سارے حسین“

یہ خوشحال کا ایک نہایت ہی پہلو دار اور اثر انگیز شعر ہے۔ ذرا غور کیجئے انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ حسن اور عشق کو ایک ہی جگہ پر مجتمع کر دیا ہے۔ آنکھوں سے حسن کو دیکھا جاتا ہے یہاں آنکھیں بدیعہ عاشق کے سامنے آتی ہیں۔ اور دنیا کے تمام حسین حسن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ہی شعر میں حسن و عشق اس خوبصورتی سے سمودینا خوشحال جیسے حسن بین شاعر ہی کا حصہ ہے۔

انسانی حسن میں ایک ایک عضو کی تعریف کر کے انہیں حسن مکرر پیدا کرنے میں بھی خوشحال کو کمال حاصل ہے۔ خوشحال کی جو غزل اب پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں پشتو زبان نے جو چاشنی پیدا کی ہے اسکا اردو میں ترجمے سے قدرے متاثر ہونے کا امکان تو بہر حال رہے گا۔ غزل کی طوالت کے باعث اس کا پشتو متن پیش نہیں کیا جا رہا لیکن آپکو اس کے اردو ترجمے میں خوشحال کی حسن بینی کی خاصی جھلک نظر آئے گی۔ اس غزل میں نہ

صرف اپنی محبوبہ کے حسن بلکہ اس حسن میں ہم آہنگی کی بھی تعریف کی ہے:-
 اردو ترجمہ:-

غزل

”تیری کالی چوٹیاں درخت کے گرد لپٹے ہوئے سانپ ہیں
 تیری زلفیں نو بہار کے سنبل کے تار ہیں
 تیری کالی آنکھیں ملک خطا کی ہر نہیں ہیں
 جو سنبل زاروں میں مست خرام ہیں
 تیرے کالے امروکمان سے مشابہ ہیں
 اور تیری پلکیں تیروں کا کام دیتی ہیں
 عاشق ان دونوں کے وار سے زخمی پڑے ہیں
 تیری مصف پیشانی بلور کو شرماتی ہے
 اور بیدل لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسکے خریدار ہیں
 یہ جو تیرے دونوں امروؤں کے درمیان ایک خال ہے
 اس کو تو دیکھ کر ملک خطا کے اصلی نافر بھی قربان قربان جاتے ہیں
 تیری سفید ناک زنبق کی کلی ہے
 اور اس کے چہار سو گزار کے پھول کھلے ہوئے ہیں
 اور تیرے دونوں رخسار چنے کے پھولوں سے بہتر ہیں

تیرے سفید دہن کو میں غنچے کے ساتھ نسبت دیتا ہوں

اس غنچے کی تمام کلیاں شکر بار ہیں

تیرے دونوں لال ہونٹ سرخ لعلوں کو شرماتے ہیں

اور تیرے سفید اور بے بہا دانت جیسے در شہوار ہیں

تیری خوبصورت ٹھوڑی شرقند کے سیب کی مثال ہے

جسکی مٹھاس بہات کی مٹھاس سے زیادہ ہے

تیرا سفید گلا چاندی کا بنا ہوا ہے

اور تیرے سیم آسا کاندھے بھی اسی شمار میں ہیں

تیرا پورا تن بدن حلب کے شیشے کی طرح صاف ہے

ایسا کہ درون کے راز اس میں سے نمودار ہوئے جاتے ہیں

تیرے سفید بازوؤں نے مصری کی ڈلی کی سفیدی کو اندھیرے میں وکیل دیا ہے

اسی لیے ان کے گلے پر ہزاروں کا خون ہے

تیرے سرخ ناخن باقوت کے گلینے ہیں

اور یہ تیری مخروملی انگلیوں پرانکے ہوئے ہیں

تیری ناف کی گانٹھ گلاب کا ایک پھول ہے

اور اسکے ارد گرد پھولوں کی چٹیوں کا اتبار لگا ہوا ہے

تیری چنڈیوں کی تعریف سے قاصر ہوں

مگر یہ سفیدی سے بھی زیادہ سفید ہیں

حیران قدمرو کے درخت کی مثال ہے

اور جب تم سنگسار کر کے نکلتی ہو تو سر تا پا دیکھنے کی چیز ہو

ایسی حالت میں تو ہندوستان کی تمام رائیاں تم پر قربان جائیں“ (۱)

خوشحال کی حسن شناس طبیعت نے حسن کی پارکیوں کو خوب سمجھا اور پرکھا ہے۔ وہ صرف

خوبصورتی کو حسن کا درجہ نہیں دیتے بلکہ انسانی اعضاء اور چہرے کے ناک نقش کی ہم آہنگی

سے حسن کا جو مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے اس سے حسن کا تعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نسیم

ننگ کے نزدیک یہی عمومی تاثر دل میں جانیاتا ہے خوشحال فرماتے ہیں:-

بنہ صورت خو ہم ہخہ چہ زبہ نہی یورو

نہ چہ کمرہ ورہ نہی بنہ دی بنہ صورت دیو

ترجمہ:- اچھی صورت تو وہی ہے جو دل لے جائے

یہ نہیں کہ بس اچھی صورت ہے۔

خوشحال نے اپنے کلام میں جا بجا آنکھوں اور دل کو بہت اہمیت دی ہے۔ آئیے اس کا سبب

ڈاکٹر اقبال نسیم ننگ سے جانتے ہیں:-

(۱) خوشحال کا تصور جمال ”خوشحال مطالعہ ص ص ۱۶۵ تا ۱۶۷

”خوشحال نے حسن کے مشاہدے کے سلسلہ میں آنکھوں کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے مطابق اللہ پاک نے ہمیں آنکھیں ایسے بخش دی ہیں کہ کائنات میں بکھرے ہوئے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ سکیں:

زنا بہ ولہی دہنہ مخ نندارہ نہ کرم

ننداری لرہ نہی زہ یسم پیدا کرے

ترجمہ: میں اچھی صورت کا نظارہ کیوں نہ کروں۔

کہ دیکھنے ہی کے لیے تو مجھے پیدا کیا گیا ہے۔

ولہی راتہ واتہی چہی بہ ہنکلیو نظر مہ کرہ

سترگھی چہی پیدا دی خو خیل یار لرہ کنہ

ترجمہ:- حسینوں پر نظر ڈالنے سے مجھے کیوں منع کرتے ہو۔ آنکھیں تو اپنے محبوب کو دیکھنے ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

بہ کالیو سرہ مخ بنائستہ کیہی

ستا بہ مخ بنائستہ ستاد مخ کالی دی

ترجمہ:- زیورات سے تو چہرہ خوبصورت ہو جاتا ہے مگر (میں دیکھتا ہوں کہ) تیرے چہرے کی خوبصورتی نے زیورات کو خوبصورتی بخشی ہے۔

خوشحال خان نے فارسی میں آنکھوں کی تعریف یوں کی ہے:-

چشمِ مخمور تو آخر کار کرو
 زہدِ صد سالہ را بخوار کرو
 روئے زور و آہِ سرد و چشمِ تر
 عشقِ کوئی را چمنِ بیمار کرو

جمال کے ادراک میں دل کی بھی ایک خصوصی اہمیت ہے۔ اور خوشحال اس اہمیت کو یوں
 اجاگر کرتے ہیں:

زہدِ مہیِ خدائے مبینِ کوی پہ بنائستہ و
 ہسی نہ چہ زہ پہ خیلہ زہدِ مائلِ کریم
 ترجمہ:- قدرت میرے دل کو حسینوں پر عاشق کرتی ہے۔
 نہ کہ میں خود دل کو ایسا کرنے پر مائل کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ”خوشحال کا تصور جمال“)

انسانی حسن کے علاوہ خوشحال نے مناظرِ فطرت یعنی پہاڑوں، دریاؤں، ندی نالوں، چشموں،
 پانی، پتھروں، سبز وادیوں، پھولوں، پرندوں اور نباتات و حیوانات کے حسن کو بھی سراہا ہے۔
 یوں ہم خوشحال کے تصور حسن کو ایک مربوط علم کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ پھولوں کی تعریف
 کرتے کرتے خوشحال رنگوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں:

”آگستان (۳۵۳ء۔ ۴۳۰ء) نے کہا ہے کہ ”ہر مادی چیز کا حسن
 اس کے حصوں کا تناسب، اعتدال اور رنگ کی نظر افزائی ہے“ رنگ

کایہ تصور خوشحال خان کے ذہن پر بھی چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے
پورے مجموعہ شعری میں کہیں بھی مادی حسن رنگ کی نظر افروز یوں
کے بغیر نہیں پایا جاتا۔ حسن انسانی کا سرو پا ہو یا مناظر فطرت کی
تصویر۔ خوشحال خان کے ہاں ”رنگ“ کا تذکرہ ضرور ملے گا۔

دگلونو ہار پہ غارہ د دلبرو

شرموی لال و یاقوت لود لالا ہم

لرغوان کہ بنفشہ کنیں شقائق دی

زبانی لری بو خانے جدا جدا ہم

ترجمہ:۔ پھولوں کے چار حسینوں کے گلے میں لعل، یاقوت اور گوہر تابدار کو غیرت دلاتے
ہیں۔ لرغوان ہوں یا گل، لال ہوں میں کربھی خوبصورت ہیں اور الگ الگ بھی۔

دیکھیے ایک ساتھ تین تین چار چار رنگوں کی ہم آمیزی ہے اور اس

آمیزش سے ہی نہیں خوشحال ان کے باہم احتراج سے بھی لطف لیتا

ہے۔ بلکہ میدان جنگ میں بھی رنگوں کا حسن اس کے احساسات پر

حاوی نظر آتا ہے۔

سہینہ توری نہی گلگونہی کری پہ وینو

پہ اہار کنسہ شگفتہ شو لالہ زار

ترجمہ:۔ انہوں نے اپنی سفید چمکتی کواروں کو خون سے سرخ کر لیا ہے۔ اور یوں اسازھ

کے مینے میں گل لالہ کے کھیت کھل اٹھے ہیں۔

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کا کافیل ”خوشحال کا تصور جمال“)

خوشحال کی شاعری میں حسن کاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسن کا بیان خوشحال کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:-

پہ رنگ رنگینہ نہ پہ مخ نسرینہ نہ

پہ لب شیرینہ نہ پہ تن سیہینہ نہ

درستہ گلزار نہ ترسرتا پایہ

عیب دی دادے پہ زرہ سنگینہ نہ

ترجمہ:- تمہاری رنگت رنگین ہے اور چہرہ سفید گلاب جیسا۔

تمہارے لب نقد و نبات کی طرح شریں ہیں اور تمہارا تن چاندی جیسا

تم مکمل گلزار ہو سرتا پا

لیکن تمہارا عیب یہ ہے کہ ننگین دل ہو۔

فارسی میں خوشحال کی حسن کاری قابل دید ہے:-

تاب زلف و بیچا بیچا گیسو

صبری از دل بے تاب بردہ

عشق

اے عشق کے تاج، اگر تو میرے سر پر رہے
تو مجھے غم کے خراج سے آزادی مل جائے
بے درد تیری قدر کیا جانیں
اے عشق اپنے مالِ قیمت سے مجھے مالا مال کر دے

یہ خوشحال کی ایک رباعی کا اردو ترجمہ ہے اور انکے کلام میں عشق کا بہترین تعارف بھی۔
خوشحال نے عشق کو بادشاہوں سے بھی اولاد جانا۔ تب ہی تو یہاں تک دہل عشق کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”عشقہ تہ تر اور نگزیب بادشاہ بہتر نہی

چھی خوشحال دی پہ عالم کنبی سر بلند کچ

ترجمہ:- اے عشق تو اور نگزیب بادشاہ سے (میرے حق میں) بہتر ہے۔ کہ تو نے خوشحال کو
تمام عالم میں سر بلند کر دیا۔

خوشحال کی مشقیہ شاعری میں تین اقسام کے اشعار ملتے ہیں۔ پہلی قسم ان اشعار
کی ہے جن میں شاعر اپنے عشق کا بے دھڑک اور برملا اعلان کرتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ
اشعار شامل ہیں جن میں حماسی رنگ پایا جاتا ہے۔ ان میں بازو شاہین، میدان جنگ کے

مناظر اور جنگ میں استعمال ہونے والے تیر و تلواری کا ذکر آتا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ عشق اور محبہ کی سنگدلی اور تاز و ادا کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں عاشق کی مردانہ وجاہت اور دبدبہ کا وقار قائم رہتا ہے۔ گوکہ بعض اوقات عاشق کو محبہ کے سامنے اپنے مجز و انکسار کا اظہار کرنے میں بھی مزا آتا ہے۔ تیسری قسم خوشحال کے عشقیہ اشعار کی وہ ہے جو فلسفہ و فکر اور حکمت کی چاشنی لئے ہوئے ہیں۔ آئیے خوشحال کی عشقیہ شاعری کے ان تینوں پہلوؤں پر نقادوں کی آراء معلوم کرتے ہیں۔

”خوشحال کے ہاں عشق بزدلوں کا کام نہیں بلکہ عشق تو ان لوگوں کے لیے ہے جو سر کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوں:-“

چہي زړه نې ونيسي زړه نې بيا پرېږدي

خو يو نامرد به وي زړه به نې رېږدي

بيا دې زلفې به لاس کښې نه نيسي

بيا دې ونيسي سر دې به کيږدي

ترجمہ:- جو اس (محبوب) کو جلدی پکڑ لے اور جلدی چھوڑ دے۔ یہ ایک نامرد ہوگا۔ جس کا دل خوف سے کانپ رہا ہوگا۔ محبوب کی زلفوں پر یا تو ہاتھ نہ ڈالے یا اگر ڈالے تو پھر چاہے اس میں عاشق کا سر بھی چلا جائے تو زلف کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

زه خوشحال کمزور یم نہ یم چہ به ډار شم

په ښکاره نارې و هم چي خوله نې را کړه

ترجمہ:- میں خوشحال کمزور نہیں ہوں جو کسی سے ڈروں۔

میں سب کے سامنے پانگ ڈال کہتا ہوں کہ اس نے مجھے بوسہ دیا۔

کہ نیولے زر کہ باز ہر پردی لہ چنگ

زہ بہ ہم لہ لاسہ ہر پردم شوخ و شنگ

ترجمہ:- اگر باز اپنے بچوں میں پکڑے ہوئے چکور کو چھوڑ دیتا ہو۔

تو میں بھی اس شوخ اور طرحدار معشوقہ کو ہاتھ سے جانے دوں گا۔

اور منہ بجز ذیل شعر میں خوشحال اپنے دل کو شہباز اور معشوقہ کو شکاری کہتا ہے:-

زہ مہی ستا بہ زلفو بند شو تا کیاب کرو

شو کہ شہباز ہم د کیاب دپارہ نیسی

ترجمہ:- میرا دل تری زلفوں کے دام میں گرفتار رہا اور تو نے اسے کیاب کر ڈالا۔

بھلا شہباز کو بھی کہیں کیاب بنانے کے لیے پکڑا جاتا ہے۔

(پروفیسر شاہ جہان خان۔ ”خوشحال خان خٹک۔ بابائے پشتو شاعری“)

جناب سید انوار الحق نے منتخبات خوشحال خان خٹک کے صفحہ (۴۷) پر ان کی حماسی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

”خوشحال خان کے کلام میں اگرچہ ہر نوع اور ہر صنف کا کلام ہے مگر سب پر اس قدر جنگی و

حماسی رنگ چھایا ہوا ہے کہ جیسے ان کی شاعری کی غرض دعاوت یا متعجبانی کچھ ہو۔ حتیٰ کہ

حسن و عشق کے رنگین و رومانی جذبات میں بھی جو کنائے اشارے اور تشبیہیں یا

استعارے استعمال کئے ہیں وہ بھی اپنے اسی انوکھے اور نرالی انداز میں باندھے ہیں۔ جن میں باز، شاہین، شیر، چیتے، تلوار، نیزے، مخنجر، شکار، میدان جنگ، خون ریزی اور سربازی کے سوا عام مثالیں کم ہیں۔ مثلاً معشوقہ کی آنکھوں، چکوں، بھوؤں، خال اور عارض و کاکل کو اس طرح بیان کیا ہے:

لکھ پت سوارہ د جنگ، نیزی بہ غارہ
دا اوږدہ بانہ پری پوری سترگہ ستا
ترجمہ:- جیسے جنگجو مسلح سوار نیزے لئے گھات میں بیٹھے ہوں
ایسی ہی تیری آنکھیں اور ان کی یہ لمبی لمبی پلکیں ہیں۔

توری سترگہ نی تور باز بانہ نی نوکھی
چہی زما خاطر نی یورو پہ نوکارو
ترجمہ:- اس کی کالی آنکھیں کالے باز ہیں اور پلکیں انکے نیچے ہیں۔
جنہوں نے میرے دل کو کھروچ کھروچ کے ختم کر ڈالا۔

ستا د مخ سپا بیان ہمہ توری پری باسی
ولی دہ سترگہ دی لا دی جنگیالی
ترجمہ:- یوں تو میرے چہرے کے سارے ہی سپاہی تیغ زن واقع ہوئے ہیں۔
مگر تیری یہ دو آنکھیں تو بلا کی لڑاکا ہیں۔

تورے تورے زلفی، کبود خال پکنبے کوترہ

راشہ کہ نہ گوری، پری بندی یو خٹہ شہباز دے

ترجمہ:- کالی کالی زلفوں (کے دام) میں نیلا خال جیسے کبوتر

یگنا اس کبوتر کے پیچھے ایک کیسا شہباز آ کے پھنسا ہے۔

معشوقہ کے تکبر اور تمکنت کے ساتھ ساتھ اپنی شان و شوکت بھی جتلا نا چاہتا ہے۔ کس قدر

اونچا اور اچھوتا خیال ہے:-

مرگ لہ نہی وارہ ددہلی لشکرے راغلی

تہ لاد خوشحال پہ مرگ خان روغ نہ گنہ ننگ کری

ترجمہ:- خوشحال کے قتل کرنے کو تو دہلی سے ساری فوج آئی ہوئی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ

ابھی تک تمہیں اس کے قتل کرنے میں عار ہے۔

(ڈاکٹر سید انوار الحق۔ ”منتخبات خوشحال خان خٹک“)

خوشحال کے فلسفہ و فکر اور حکمت کی چاشنی لیے ہوئے عشقیہ اشعار کو پروفیسر شاہ جہان خان

نے یوں تلمبہ بند کیا ہے:-

”خوشحال خان تو عشق ہی کو حیات جاوداں سمجھتا ہے:-

جی زہ ژوندی لری د عشق پہ مینہ

ہفہ کہ و مہری گنہ نہ مرینہ

فرہاد کہ مر دے مجنون کہ مر دے

نوم بہ نہی ہر کلمہ پہ جہان وینہ

ترجمہ:- جس کا دل عشق کی چاہت میں زندہ ہو۔ وہ مر کر بھی نہیں مرے۔ فرہاد اور مجنون
مگر چہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں لیکن دونوں کے نام اس دنیا میں باقی رہیں گے۔

چہی پہ عشق سرہ ژوندی وی ہفتہ نہ مری

چہی بہی عشقہ ژوندی گر خشی مرہ ہفتہ

ترجمہ:- جو لوگ عشق میں زندہ ہیں وہ مر نہیں سکتے۔ مردہ تو وہی ہیں جو بغیر عشق کے زندہ
ہیں۔

چہی خٹہ درد لری د عشق تری بہ زار سپم

کہ مومن دے کہ کافر دے کہ یہود دے

ترجمہ:- میں اس شخص پر قربان ہوتا رہوں گا۔ جو عشق کا کچھ نہ کچھ درد رکھتا ہو۔ خواہ وہ
مومن ہے یا کافر ہے یا یہود ہے۔

پہ بل ثنائے مہی پیرزو نہ نہی دیار غمہ

تہ زما د زرہ د مات گودی ریحان نہی

ترجمہ:- اے غم یار میں نہیں چاہتا کہ تو کسی اور جگہ رہے۔ تو تو میرے دل کے سفال شکستہ
کا ریحان ہے۔ (اسی میں رہ)

د خانسی۔ د توری کار نشته پہ عشق کنبی
معشوقی وتہ مرنیے اوسہ خوشحالہ
ترجمہ:- عشق میں خان کی تلوار کا کوئی کام نہیں۔
اے خوشحال یہاں تو معشوق کا غلام بن کر رہ۔

(پروفیسر شاہ جہان خان ”خوشحال خان خٹک۔ بابائے پشتو شاعری“)
عشق اور عشاق کو ایک ہی شعر میں سموتے ہوئے خوشحال نے فارسی میں فرمایا ہے:-

در درون سینہ راز عاشقان

عشق اندر کوچہ ہا اظہار کرد

خوشحال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ زندگی میں انکے تین مشاغل رہے ہیں۔ ایک
تو شکار جس کی خاطر بھیجن میں اگر ایک گھنٹہ کتب میں گزارتے تو دس گھنٹے شکار میں
گزارتے۔ اور اس پر بھی ان کو یہ کہنے میں عار نہ تھا کہ اگر وہ شکار میں کم اور تعلیم پر زیادہ
توجہ دیتے تو دنیا بھر کے علوم حاصل کر کے دکھاتے۔ خوشحال کے لئے دوسری محبوب چیز
کتاب کا مطالعہ ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ اسی خوشحال نے اپنے وقت کی عربی اور فارسی
کتابیں چاٹ ڈالیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ایک عالم کا درجہ حاصل کیا بلکہ کتابیں تصنیف بھی
کیں اور ترجمہ بھی کیا۔ تیسری چیز جس میں خوشحال کو کمال حاصل ہوا وہ دلبروں کی دلبری
اور حسن و عشق کے معاملات پر پوری گرفت ہے۔ اپنے ان تینوں مشاغل کا ذکر خوشحال نے
یوں کیا ہے:-

یو د بنکار بل د کتاب بل د دلبرو

پہ جهان کنبی نورې نه شوې دا درې مینې

ترجمہ:- ایک شکار دوسرے کتاب اور تیسرے دلبروں سے لگن دنیا میں ان تینوں محبتوں کے سوا اور کوئی محبت نہیں۔

اور خوشحال بابا نے جو کہا اسے سچ کر دکھایا۔ جوانی میں بڑھاپے میں اور موت کے وقت تک انکی زبان پر حسن و عشق کی باتیں موجود ہیں۔ بڑھاپے میں حسن پرستی جاری رہی:-

کہ خوشحال بہ عمر لاد تر اوسا تیر شو

لا پہ زړه کنبی نه د کنبلو اشنائی شته

ترجمہ:- اگرچہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر اسکا دل ابھی تک حسینوں سے آشنائی چاہتا ہے۔

اور دنیا سے رخصتی کے وقت صرف اور صرف حسینوں کا ارمان دل میں لئے ہوئے ہیں:-

د زړه مینه شي په بنکلو ماته نه کړه

خوار خوشحال به له دنیا نه دا ارمان وړی

ترجمہ:- اپنی زندگی میں حسینوں سے محبت کا ارمان پورا نہ کر سکا۔ بیچارہ خوشحال دنیا سے یہی ارمان لے کر رخصت ہوگا۔

خوشحال کی حسن کاری اور عشق کے والہانہ اظہار نے انگریز مستشرقین کو بہت متاثر کیا ہے۔ سروالف کیرو نے خوشحال کی چھوٹی بحر کی ایک غزل اپنی کتاب "دی پوےز

آف خوشحال خان ٹنک کے لیے منتخب کر کے اس کا انگریزی میں بڑا دل پذیر ترجمہ کیا ہے۔ اور اسے Love in a Garden کے عنوان تلے اپنی تاریخی کتاب میں جگہ دی ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان چند اشعار میں سے ہر ایک شعر میں حسن اور عشق دونوں کی واردات موجود ہے۔ یہاں اس غزل کے پہلے تین اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا موضوع بھی اختتام کو پہنچتا ہے:-

ترجمہ:-

دوارہ شونہی کرہ پہ بیارتہ	اے محبوب اپنے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے جدا کر
دوریزی و کرہ خیل یارتہ	اور اپنے یار کے سامنے در ریزی کر
زہ چہ ستا و مخ تہ گورم	میں جب تیرے خوبصورت چہرے کو دیکھتا ہوں
زہ مہ نہ کیہی گلزار تہ	تو میرا جی گلشن میں ہانے کو نہیں چاہتا
گل لہ شرمہ خولہ پر پردی	پھول شرم کے مارے پیٹے پیٹے ہو جاتے ہیں
چہ نظر کا ستار خسارتہ	جب ان کی نظر تیرے (گلابی) رخسار پر پڑتی ہے

"When her petalled lips are parting whitest pearls do lose their luster. When her glance to me is darting, Fades the Fairest flower cluster, Roses shamed forget to blossom Brighter radiance to discover, In the budding of a bosom"

Sir Olaf Caroe

غالب کی شاعری میں حسن و عشق

جیسا کہ گذر چکا شاعری میں حسن و عشق ایک ہی دہنی کیفیت کے بظاہر دو مختلف ظہور ہیں۔ اور ان دونوں میں شاعر کی شخصیت جھلکتی ہے۔ دیکھا جائے تو کسی شاعر کو اس کلیئے سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہے کیونکہ:-

”جیسے ہم خود ہیں ویسے ہی ہمارا عشق ہے لیکن ذرا سا غور کیجئے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہمارا حسن کا تصور بھی ہماری اپنی شخصیت سے محصور ہے۔ حسن کی کوئی اور آکھاپ خاطر میں لاتے ہیں۔ اور کس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ خود آپ کی افتاد طبع کا کرشمہ ہے۔ انسان کی شخصیت کے الگ الگ ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ ہمارے عمل اور خیال کی ہر سرگرمی ہماری خود فردی و خود داری ہماری محبت و نفرت ایک ہی ناقابل تقسیم شخصیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ غالب کا تصور حسن و عشق کیا تھا؟ یہ دراصل غالب کی شخصیت کا مسئلہ ہے“

(پروفیسر حمید احمد خاں غالب کی شاعری میں حسن و عشق)

غالب کے واقعات زندگی پڑھ ڈالئے۔ آپکو ہر دم ان کی شخصیت کی انفرادیت اور اس کے

نتیجے میں پیدا ہونے والی عیش پسندی اور اچھی چیزوں سے محبت کی موجودگی کا احساس ہوگا۔ اس محبت کے ڈانڈے ان کے بچپن اور جوانی کے عیش و عشرت کی فضا سے جاتے ہیں۔ غالب کا نظریہ محبت کیا تھا؟

کہتے ہیں کہ غالب کے کلام میں حسن پر کم اور عشق سے متعلق اشعار زیادہ ہیں۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہیں کی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق غالب کی حسن کاری میں کوئی واضح انسانی صورت سامنے نہیں آئی حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی صورت گری غالب کی شاعری کا موضوع ہی نہیں ہے۔

اب ہم غالب کی شاعری میں حسن کی تلاش میں اوپر دیئے ہوئے حالات کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں۔ تو دو نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ کہ غالب کو حسن کی تصویر سے نہیں اس کی تاثیر سے سروکار ہے اور یہ کہ حسن کی مصوری اجاگر کرنے کے لیے غالب اشارات سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

منہ نہ کھلے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ہم ان حالات میں بھی غالب کے ہمراہ چلنے میں خوش ہیں کہ اگر اس شوخ کا منہ دیکھ بھی لیتے تو ایک عارضی مسرت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ مگر غالب کی ہمراہی کے دوران ہمارے دلوں میں جو خلش پیدا ہوتی جاتی ہے اس کا مزاحیہ کچھ اور ہے۔

”نسوانی حسن کے تین عناصر ایسے ہیں جنہیں غالب کے تخیل میں مستقل

جگہ ملی ہے۔ ایک خاص کیفیت جو اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی
توجہ کو بدستور دعوت نظر دیتی رہی۔ قامت یار کی رعنائی ہے:

اگر وہ سر و قد گرم خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری تالہ فرسا ہو

معلوم ہوتا ہے عورت کے بدن میں لچک اور موسیقیت یعنی پورے پیکر کی شوخی و رعنائی پر
غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
آتا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گواہی

اسد انصاف قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس لقم میں بالیدن مضمون عالی ہے

جوش صفائے تن کے بعد غالب ہمیں جوش صفائے زلف کی طرف
رجوع کرتا ہے۔۔۔ غالب کے لیے جو تین عناصر حسن بنیادی
حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے تیسرا اور سب سے بڑا جز ”نگاہ“ ہے
۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے نزدیک محبوب کی چشم و نگاہ کی
لذتیں حسن کے سب سے بڑے انعامات میں داخل ہیں۔

(پروفیسر حمید احمد خاں ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

تو معلوم ہوا کہ غالب کے نظریہ حسن انسان میں تین عوامل کا دخل تھا۔ قد و قامت یار، زلف اور چشم و نگاہ، اسلئے اب ہم کلام غالب کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاکہ ان موضوعات سے متعلق غالب کے شاعرانہ خیالات جان سکیں۔ انکے اردو و یوان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں موضوعات میں سے قد و قامت یار پر چند گئے چنے اشعار ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار چشم و نگاہ اور زلف پر کہے گئے ہیں۔ پھر ہمیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی ہے کہ اول تو مرزا کے حسن پر کہے گئے اشعار عشق پر کہے گئے اشعار سے کم ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اردو کلام کے مقابلے میں ان کے فارسی کلام میں عشقیہ اشعار وافر تعداد میں موجود ہیں۔

قد و قامت یار پر غالب کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

تا در آب آئناہ عکس قد دل جویش
چشمہ بچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد و کُش سے جو گلزار میں آوے

غالب کے نظریہ محبت کے ضمن میں انکی نفسیات محبت پر بھی ایک نظر ڈالتے جاتے ہیں۔

غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں شاعر نے اپنی قلبی کیفیت تو خاص طور پر نمایاں نہیں کی لیکن نفسیات محبت کے بعض نئے یا اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک شعر نہایت بلیغ ہے:

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خوا ہوگا
نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

غالب نے حسن انساں کے بارے میں زلف کو جواہریت دی ہے وہ انجلی خاصی ہے۔ اردو دیوان میں ہر دو تین غزلوں کے بعد زلف کا بیان ضرور ملتا ہے۔ سیاہ لبے چمکدار بال آخر تک مرزا کی کمزوری رہے۔ شاید ان کا یہ شعر کچھ صورت حال بتا پائے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

زلف گیرہ گیر نے غالب کو کس طور الجھائے رکھا۔ ذیل کے چند اشعار سے ظاہر ہے:-

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا ز زعماء سے گھبرائیں گے کیا

قید میں تھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرا بھاری زنجیر بھی تھا

وہ حلقہ ہائے زلف کہیں میں ہیں اے خدا
رکھ لہجہ میرے دعائے وارستگی کی شرم

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

کئے تو شب کہیں، کانٹے تو سانپ کھلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم پہ خم کیا ہے

پڑا رہے دل وابستہ بے تاب سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پر چٹکن کی آزمائش ہے

مگر یہ سنبل کدو، تروضہ روضاں رستم
ہوئی زلف ترا سلسلہ جہاں رستم

غالب کی الفت چشم و نگاہ بھی ایک خامسے کی چیز ہے۔ اس سے انکی حسن کاری اور چشم
خواباں سے گلن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے لیے حسن کا سب سے
بڑا انعام یہی چشم و نگاہ کی لذت ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ جیسے زلف سیاہ پر مرتے تھے
ویسے ہی چشم سیاہ کے بھی دلدادہ تھے:

ابو سے ہے کیا اس نگہ تار کو پھیند
ہے حیر مقرر مگر اس کی ہے کہاں اور

چشم خواباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سر سے تو کہوے کہ دودھ طلعہ آواز ہے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سر سے تیز دھندل مڑگاں کئے ہوئے

حلقے ہیں چشم ہائے کشورہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہ سر سے سا کہوں

عشق

رواق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے مگر برق خرمن میں نہیں
غالب نے عشقیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے لئے عشق زندگی تھی اور
زندگی عشق۔

عشق نے غالب کی طبیعت میں ایک خاص مقام یوں بھی حاصل کیا۔ کہ انہوں نے بذات
خود عشق کی چاشنی چکھی تھی۔ تیرہ برس کی عمر میں انکی شادی ہوئی اور بیس برس کی عمر میں
شادی شدہ زندگی کی نا آسودگی نے انہیں گھر سے باہر عشق کرنے کی راہ دکھائی مگر محبوبہ کی
بے وقت موت کی وجہ سے غالب کے پہلے اور آخری عشق کا باب بند ہوا۔ مطلب یہ کہ
چونکہ غالب نے عشق کیا تھا اسلئے انہیں عشق کے رموز سے جو واقفیت حاصل ہوئی اس نے
انکی عشقیہ شاعری پر اپنا کس ضرور ڈالا ہوگا۔

ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے کہا ہے کہ ”محبت کے متعلق غالب کے اشعار کئی طرح کے ہیں۔
زیادہ تعداد میں ان اشعاروں کی ہے جنہیں مضمون افرینی اور خیال آرائی کی مثالیں سمجھنا
چاہیے۔ (اس پر اضافہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار مرزا کی جوانی کی تخلیق ہیں۔) اور فنی
عشق کی مثالیں ہیں۔ ان میں خیال بندی اور مبالغہ یا شوخی سے نئے مضامین پیدا کئے گئے

ہیں۔“

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا دگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں
شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں اس قسم کے اشعار کی بہتات تھی کہ یہ انکی خیال آفرینی کے نمونے ہیں۔ اسکے بعد غالب کے عشقیہ کلام میں گھٹنا اور شوخ اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان اشعار میں دلی جذبات کا بیان نہیں بلکہ بقول ڈاکٹر اکرام ”خیالی تصویر بنا کر اسی سے ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان کیا جاتا ہے“ ان میں رشک بھی موجود ہے۔

اجرا ہوا نقاب میں ان کے ہے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

مگر نکسوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکسوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

غالب کی عشقیہ شاعری سے تین مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان سے ان کی عشقیہ شاعری کے

خدا و خال نمایاں ہو سکیں گے۔ غالب نے نوجوانی ہی میں اپنے عشق کو اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے معشوق کے پہلو میں دفن ہوتے دیکھا تو فوہر جذبات میں سر تاپا احتجاج بننے ہوئے اپنی محبوبہ سے یوں گویا ہوئے۔

شرم رسوائی سے جا چھینا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دہلی میں ہی ہوتی تھی یہ خواری ہائے ہائے

بعد میں تیس تیس سال کی عمر میں جب غالب کو سفر کلکتہ ورنیش ہوا۔ تو کلکتہ جاتے ہوئے انہیں بنارس کا شہر دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا:

”بنارس میں نسوانی حسن و جمال کے نظاروں نے اسے بیتاب
کر دیا۔ کوچہ و بازار و رو باہم کنار دریا، جدھر نظر اٹھتی شاعر کی آنکھ
کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ مثنوی ”چراغ دیر“ اسی زمانے کی یادگار ہے۔
مسلل لطم اور پھر عورت کے حسن کا پُر جوش بیان، جزئیات حسن کی
مرقع کاری کی کوئی تقریب اگر ہو سکتی تھی تو یہ تھی۔“

(پروفیسر حمید احمد خاں ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

بنارس کی حسین عورتوں کو دیکھ کر غالب نے اثرات قبول کئے وہ بعد میں ان اشعار کی صورت میں سامنے آئے:

میانہا تازک و دلہا توانا
 زنا دانی بکار خویش دانا
 ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار
 خراسے صد قیامت فتنہ در بار
 قیامت کامتاں مڑگاں درازاں
 زمڑگاں بر صف دل نیزہ بازاں

ادھر غالب کے دل پر کلکتہ کے دوران قیام دوران بنگال کا انٹ نقش بھی موجود تھا۔ جس نے انہیں یہ کہنے پر آمادہ مجبور کر ہی دیا:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
 اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اگر غالب کی عشقیہ شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کھلے گا کہ انہوں نے جوانی میں جو کچھ کہا اسکے عوامل ان عوامل سے مختلف تھے جن کے تحت انہوں نے اپنے دور پختگی میں لکھا۔

ایک اور ضروری بات جو غالب کی عشقیہ شاعری کے ضمن میں یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض نقادوں نے اس شاعری میں سے کچھ کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے مقابل رکھنے کا کہا ہے لیکن انہی نے غالب کی عشقیہ شاعری پر بوجہ انگلیاں بھی اٹھائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

”بہر کیف غالب کے یہاں عشق کے نہ جانے کتنے مختلف جذبات

نظم ہوئے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کو دنیا کی
بہترین عشقیہ شاعری کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے
باوصف غالب کی عشقیہ شاعری کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو آج کے
بدلے سماج اور مذاق میں ہمیں مضحکہ خیز محسوس ہوں گے۔

گیوں میں میری لاش کو کھینچے پھر کہ میں
جاں دادہ ہوائے سر رہگذار تھا
اپنی نگلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

(راجندر ناتھ شیدا "غالب کا شعور۔۔۔ ایک مطالعہ")

گو کہ مجموعی طور پر غالب کے عشقیہ اشعار میں عشق کی گونا گوں کیفیتوں اور وارداتوں کو برتا
گیا ہے لیکن ان کے کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے عشق کے متعلق مایوسی نکلتی ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

جب ہم غالب کی عشقیہ شاعری کا ان کی جوانی اور دور پختگی میں جائزہ لیتے ہیں تو بحیثیت
مجموعی وہ ایک مشاق عشقی ماہر بن کر ابھرتے ہیں۔ جن کے کلام میں جذبہ عشق بدرجہ اتم

موجود ہے اور یہ کلام ہجر و وصال کے انمٹ تاثرات سے لبریز ہے۔

چہ دید جان من از چشم پر خمار بگو

چہ رفت بر سرم از زلف پر شکن یاد آر

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غم اگر چہ جاکسل ہے چہ بھیں کہاں کہ دل ہے

غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے

یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

شوqm خریدۂ رقم آرزوئے یوس

ذوقم کلرد ہوس مرثوۂ کنار

رہے اس شوخ سے آزرده ہم چننے تکلف سے
تکلف برطرف ' تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وقاف سہی
جس کو ہودین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

واں وہ غرور عز و نازیاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

ان شعراء و ادباء کے سوا جنہوں نے غم و حزن کو اپنے اوپر طاری کئے رکھا ادب کے بیشتر نگہنے والوں نے کسی نہ کسی درجے پر طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ خوشحال و غالب بھی اس دوسری قسم کے ادیبوں میں شامل ہیں۔ طنز و مزاح کے یہ عناصر جہاں خوشحال کی شاعری میں جا بجا اپنی بولسوفی دکھاتے ہیں وہاں غالب کی نظم و نثر دونوں میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کے وافر اور بلیغ نمونے ملتے ہیں۔

”انگریزی ادب کا سب سے بڑا مزاح نگار شکسپئر ہو گا۔“
ہے جس کے ڈرامے مزاح و ظرافت کی بنیادوں پر استوار ہیں۔
”مکمل حیوان ظریف کیا ہوتا ہے“ اس کا اندازہ لگانے کے لیے
شکسپئر سے شروع کیجئے۔ شکسپئر کی سب سے عظیم تصنیف جو تمام
یورپ کی بھی عظیم ترین تصنیف ہے ”کنگ لیر“ ہے۔ اس تصنیف
میں الیہ نگاری اپنے کمال پر پہنچی ہے مگر لیر کا الیہ کچھ نہیں رہ جاتا اگر

اس میں سے اس کے فول کے مزاج کو نکال لیجئے کلاسیکی نقاد
 آثار ویں صدی تک شیکسپیر کو طرہ یہ نگار ہی مانتے رہے۔ اور اس کی
 ایہ نگاری سے انکار کرتے رہے۔۔۔۔۔ شیکسپیر نشاۃ الثانیہ کی روح
 تھاجو بنیادی طور پر ظریف تھی مگر جس کی ظرافت کے دائرے میں ہر
 قسم کے تاثرات آ جاتے تھے۔ لیر کی تکالیف کے ساتھ آسمان و
 زمین متزلزل ہیں مگر اس حد سے زیادہ تاریک عالم میں فول ہر جگہ اور
 ہر وقت اپنی مزاج کی پچلمعزیاں بھی چھوڑ رہا ہے۔

(ڈاکٹر احسن قاروقی - ”حیوان ظریف“)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق اردو ادب میں غالب کی طرح سودا، انشا اور اکبر کی
 شخصیتوں کی بنیاد بھی شوخی و شگفتگی پر تھی۔ مگر ان کی شوخی کی تہہ میں کسی سے لیجئے کسی سے
 دست و گریباں ہونے اور کسی کی لٹی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا نظر آتا ہے۔ سودا چلتے چلتے
 لوگوں کو دھکا دیتے ہیں اور ان کا منہ چڑاتے ہیں پھبتیاں کہتے ہیں کہ وہ ان باتوں کے بغیر
 آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ وہ ہنستے ضرور ہیں لیکن ان کی ہنسی زہر خند بن جاتی ہے۔ کم و بیش
 یہی حال انشا کا ہے گو کہ وہ زیادہ شگفتہ مزاج ہیں مگر وہ بھی افراد کو ہدف بناتے ہیں۔ اکبر
 ان دونوں سے آگے ہیں۔ ان کی شوخی میں زمانے کا ردنا ہے۔ ان کے ہنسنے کی بنیاد یہ ہے
 کہ وہ زمانے کو آگے بڑھنے سے روک دینا چاہتے ہیں۔

پشتو ادب میں خوشحال سے پہلے کسی قابل ذکر طنز و مزاح نگار کا پتہ نہیں چلتا۔ خوشحال جدید

پشتو ادب کے بانی تھے۔ ان کے ہاں جا بجا طنز کے زیادہ اور مزاح کے کم نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

مناسب لگتا ہے کہ اس مقام پر طنز و مزاح کی تعریف پر روشنی ڈال لی جائے جس کے بعد خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و طراقت کا مطالعہ کیا جائے گا۔

”طنز جسے انگریزی زبان میں (Satire) کہتے ہیں وہ تحریر ہے جس میں طنز نگار مذاق کے پردہ میں ایک فرد، گروہ، قوم، نظریے یا ادارے پر بڑی تندگی اور بے رحمی کے انداز میں تنقید کرتا ہے۔ اور اس چیز کے مختلف پہلو اجاگر کرتا ہے۔ جو اس کی طنز کا نشانہ بنتا ہے۔

طنز کے بہت سے درجے ہیں۔ طنز کبھی کسی انسان کی کم مائیگیوں اور کمزوریوں کی ہنسی اڑاتا ہے کبھی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان و سماج کی مستقل حماقتوں اور ہائیکیر تاہمواریوں کو اجاگر کرتا ہے اور انسان کو انسانیت کے نزدیک تر لانے میں مدد دیتا ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک طنز اپنی افادیت کی وجہ سے مزاح پر فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنے اپنے دائرہ کار میں دونوں انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔ اگر طنز نگار ایک ماہر سرجن کی طرح علاج کی خاطر جسم کو جھرتا ہے تو مزاح نگار ایک ماہر فزیشن کی طرح روایتی انداز میں بیمار جسم کا علاج کرتا ہے۔“

(حکیم اللہ جان کچھر ر شعبہ پشتو پٹا اور یونیورسٹی

عبدالوحید کچھر ر شعبہ پشتو پٹا اور یونیورسٹی

”عظیم خوشحال۔ عظیم طنز نگار“)

آئیے اب خوشحال وغالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلے خوشحال کے کلام میں طنز و مزاح کے رنگ دیکھیے۔

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

کہتے ہیں کہ انسان پر اس تہذیب کا اثر رہتا ہے جس میں وہ بس رہا ہو۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم خوشحال کو تہذیبی لحاظ سے مغلیہ دور کے اس سرے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں سے اسکا انحطاط شروع ہوا۔ تہذیب کی پختگی اپنے افراد میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ نتیجتاً حالات کی خرابی یا غم ایسے افراد میں مایوسی نہیں پھیلا پاتی اور وہ غم کو اپنی خود اعتمادی سے فتح کرنے اور اپنی زندگی میں مسرت کے مواقع پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

گو کہ خوشحال کا تعلق مغلیہ دور کی ترقی یافتہ تہذیب کے ساتھ لگ بھگ تیس سال تک رہا۔ جب وہ اپنے قبیلے کے سردار کی حیثیت سے مغلیہ دربار سے منسلک رہے۔ مگر اسکے بعد تقریباً چھبیس سال تک وہ مغلیہ تہذیب سے کٹ کر اپنے پشتون معاشرے میں رہے۔ نظر آتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد وہ پشتونوں کو متحد کرنے اور مغلوں کے خلاف کم و بیش پانچ جنگیں لڑنے میں مصروف رہے۔ ایسے میں انہوں نے شاعری کے لیے بھی

وقت نکالا ہوگا۔ گو کہ وہ مفلوں کی قید کے دوران چند ایک کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ مشن خن بھی جاری رکھے رہے۔

”خوشحال خان کی بات پیپ میں متانت تھی۔ لیکن ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔۔۔ خان صاف گو حق گو اور حق پرست انسانوں کے دوست تھے۔ یعنی صاف بات کرتے تھے اور صاف گو انسانوں کو پسند کرتے تھے۔۔۔ بیری میں بھی جوان دل رکھتے تھے اور ظریفانہ باتوں اور اشعار کے ذریعے اپنے دل کو خوش رکھتے تھے“

(میاں سید رسول رسا“ ”مقدمہ صرافان خوشحال“ ص ۱۱۶ء ۱۱۷ء)

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کی نوعیت کیا تھی۔ آئیے دیکھیں:-

”خوشحال بابا کے کلام میں طنز زیادہ اور مزاح کا عنصر کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ انکی وجہ یہ ہے کہ بابا نے تمام عمر جنگوں اور مبارزوں میں بتاوی تھی۔ اور ایک بہادر اور مبارز انسان کا مزاح کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ البتہ خوشحال بابا نے مزاح کی ایک قسم ”تسخیر“ سے کام لیا ہے۔ یہ مزاح کی وہ قسم ہے جس میں دینی چیزوں کو ہلکا اور ہلکی چیزوں کو دینی کر کے پیش کیا جاتا ہے“

(حکیم اللہ جان کچھر رشتہ بہشتوپشا اور یونورشی

عبدالوحید کچھر رشتہ بہشتوپشا اور یونورشی

”عظیم خوشحال۔ عظیم طنز کار“)

خوشحال چونکہ ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے اسلئے انہوں نے اپنے سے پہلے گذرے ہوئے ادباء اور شعراء پر منکوم تنقید کرتے ہوئے مزاح کا استعمال بھی کیا۔ مرزا خان انصاری اور ارزانی خویہن خوشحال سے پہلے پشتو کے معروف شعراء گذرے ہیں۔ انکے متعلق ذیل کے قطعہ میں خوشحال نے مزاح کا استعمال اس طور کیا ہے کہ منہوج بالا اقتباس کے مطابق اپنے آپ کو روزنی لیکن ان شعراء کو ہلکا ظاہر کیا ہے۔

قتلمی می ورتہ سازې کړې د قندو
د اوریشو به ډوډیو چې جاشخوند کړو
د مرزا دیوان می او مانده په گوډی
مسخره می ارزانی خویشکی زمند کړو

ترجمہ:- جو شعراء نان جوکن پر گذارا کرنے والے تھے انکے مقابلے میں میں نے اپنے کلام کے ذریعے شیرین قلم تیار کئے۔ (اور اس طرح) مرزا کے دیوان کو واپس تھیلے میں بند کر دیا اور ارزانی خوشنکی پر لوگوں کو ہنسایا۔

خوشحال بابا کا تسخر لائے ہوئے ایک اور شعر دیکھیے:-

ترجمہ:- اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع کی بنا پر ہرد اور ہرد بار میں حاضر رہتا ہے۔
خوشحال کے ہاں طنز کے موضوع پر اس سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے:-

”پھر یہی شاعر (خوشحال) جب طنز پر اترتا ہے تو نہ بادشاہوں کو بخشتا
ہے نہ خود اپنی قوم کو نہ ملائیں کو معاف کرتا ہے نہ صوفیوں کو نہ اہل

دولت کو چھوڑتا ہے نہ اہل سیاست کو وہ ہر ایک پر فخر چلاتا ہے اور جس کی دیکھتی رگ پکڑتا ہے اس انداز سے پکڑتا ہے کہ اگر وہ خاموش نہ رہ سکے تو فریاد میں بھی لطف اندوزی کی جھلک نظر آ جائے۔

(محمد جعفر شاہ پھلواڑی رفیق ادارہ ثقافت اسلامی لاہور ”پیش لفظ خوشحال و اقبال“)

خوشحال کے کلام میں زاہد کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان اشعار میں پنہاں طنز کو محسوس کیا ہی جاسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ خوشحال کی معاملہ فہمی اور طرز ادا کی بھی داد دینی پڑتی ہے:-

زہ خوسرا بیہم شیخہ خٹہ راسرہ جنگ کرے

برخی ازلی دی کاش کہ ما دغان پہ رنگ کرے

ترجمہ:- اے شیخ میں تو ایک شرابی ہوں تو کیوں مجھ سے لڑتا جھڑتا رہتا ہے۔ قدرت نے ہر ایک کو اس کا کام سونپا ہوا ہے۔ کاش کہ تو مجھے اپنے رنگ میں رنگ سکے۔

د زاہد پہ صومعہ کنبہ می زہ تنگ شو

لہ دی پسے بہ خدمت دے فروش کریم

ترجمہ:- میراجی زاہد کی محبت میں رہتے رہتے گھبرا گیا ہے۔ میں اس کے بعد اب کسی سے فروش کی خدمت کرونگا۔

محتسب چہ بہ احدا دود مستانو

درندانو سرہ کنبہ ناست بادہ خورشو

ترجمہ:- جو منتخب مسلمانوں کا دشمن تھا۔ وہ شرایین کی محبت میں رہ کر مے خور بن گیا۔

ذکر فکر مونیخ روزہ طاعت و رلرہ بویہ

شیخ ملا زاہد عابد صوفی پہ میو خد زده

ترجمہ:- ذکر فکر نماز روزہ اور اطاعت ہی اگلے کام ہیں۔ شیخ ملا۔ زاہد عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

کو مو شو نلیو چہ درود او تسبیحات وے

راشہ او گورہ د میو د مینا شو

ترجمہ:- جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے۔ آؤ دیکھو کہ وہ مے و مینا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

لہ از لہ نی رند رند زاہد زاہد کپرو

زہ بہ ذکری ہالی اخلم تہ تسبیح کرہ

ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کو رند اور زاہد کو زاہد بنایا۔ اس لیے (اے شیخ) میں تو مے سے بھرے ہوئے جام پیتا ہوں اور تو تسبیح پھیر۔

خوشحال کے اس قبیل کے چند دوسرے اشعار کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اے شیخ تو جو خدا کی زیادہ سے زیادہ طاعت بجالا کر جنت مانگتا ہے۔

تو کیا جنت میں جانا بھی انسانی ارادے پر موقوف ہے؟

ترجمہ:- یہ کس مے خانے کی شراب ہے جس کے ایک جرعہ سے صوفی مدہوش ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسروں پر طنز کرنے والا یا انہیں مزاح کا نشانہ بنانے والا ضرور ایک صاف گو انسان ہوگا۔ اسی صاف گوئی سے انسان میں آزادوشی بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشحال کے کلام میں اسکی آزاد روی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ جو عام حالات میں ایک عام انسان کے لیے حرمت کن حد تک باغیانہ روش کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہو سکتیں۔ ان اشعار کے بین السطور طنز یا مزاح کی ہلکی سی کیر گزرتی نظر آئے گی:-

کہ ستا کو شہ جنت سرہ خوگ سہہ راتہ گیسر دی

کو شہ بہ دی وطن کرم کہ دا عیب وی ہم دی وی

ترجمہ:- اگر کوئی تیرے کوچے کو جنت کے ساتھ پہلو پہ پہلو رکھ دے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن بناؤں گا۔ اگر ایسا کرنا ایک عیب ہے تو ہوا کرے۔

دہی کلی طیبیان وارہ ناترس دی

د دارو پہ طمع مہ اوسہ بیعار

ترجمہ:- اس گاؤں کے تمام طیبیات ترس ہیں۔

اس لئے اے بیمار تو دو کی امید میں نہ رہ

د تقویٰ پہ کاروبار نہ خبرداریم

ولہی شہ کرم چہ نصیب مہی گمراہی شوہ

ترجمہ:- میں تقویٰ کے کاروبار سے بخوبی واقف ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

زاہدان چہی مونخ روژہ کا جنت غواری

ما خوشحال د مزدوریہ طاعت نہ زدہ

ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز اور روزے کے ذریعے جنت کے خواہاں ہیں۔ مجھے اس قسم کی مزدوری اور طاعت نہیں آتی۔

چہی دی سپین بار خو کبود کرم پہ چپچلو

اوس می نہ گنہی ہالہ بہ می گنہی

ترجمہ:- تم مجھے اب تو نہیں مانتی لیکن وہاں غلہ میں مجھے مان جاؤ گی جب میں تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر سرخ کر دوں گا۔

چہی لہ خیلہ کسبہ نہ خوری

کہ ولی دے کلہ نہ خوری

ترجمہ:- جو شخص بھی اپنے ہاتھ اور اپنے ہنر سے کمایا ہوا نہیں کھاتا وہ ملال نہیں کھاتا چاہے وہ ولی ہی کیوں نہ ہو۔

رنخوران کہ کاروبار نہ کہ معذور وی

روغ سرے بہ ولی نہ کا خیل روزگار

ترجمہ:- بیمار اگر مزدوری و کاروبار نہ کرے اور معذور ہو تو جو صحت مند ہیں وہ کیوں گراپنا روزگار نہ کریں۔

مزریتوب بویہ دتورو پہ میدان گنبی

پہ خالی میدان خو هرگیدر مزرے وی

ترجمہ:- شیردلی تو کموروں کے میدان میں دکھائی جاتی ہے۔ خالی میدان میں تو گیدر بھی شیر ہوتا ہے۔

چی د بنخونہ بتر دے هغه خوک دے

چی د بنخو سره کا مصلحتونہ

ترجمہ:- جو مرد عورتوں سے بھی بدتر ہے وہ کون ہے۔ وہ وہی ہے جو عورتوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا ہے۔

کہ نہی موسیٰ اوپے ژمے گبینہ خورہ

خوپہ سودنی خبر مه کپہ خیل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

اسی قبیل کے چند اور اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس کے رخساروں پر دانتوں کی چھاپ ہے

یہ کسی نوآ سوز عاشق کی کاٹ نظر آتی ہے۔

ترجمہ:- اپنے گھروں میں زخمی گدھے کی طرح منہ خشک ہوتا ہے

اور دوسروں کے گھروں میں گھوڑوں کی طرح رات ب کھاتے ہیں

ترجمہ:- جس کا کردار گفتار کے موافق نہ ہو اس جھوٹے کی ڈاڑھی پر نعرین
 ترجمہ:- خیل مردار کے پاس اور جھپٹنے والا شاہین شکار کے پاس ہوتا ہے۔
 ترجمہ:- حجام کی اپنی حجامت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دوسروں کی حجامت کرنے کے
 لیے تیار رہتا ہے۔

ترجمہ:- فصاحت تو باغ کی بلبلوں میں ہوتی ہے۔

کوئے کو فصاحت سے کیا کام

ترجمہ:- تو جو تاج کو آسمان یا تارے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

ذرا یہ تو بتانا چاہتا کن آنکھوں سے انہیں دیکھے گا۔

ترجمہ:- بوڑھا دوا لہا چاہے اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ہزار بار رنگ لے اور اپنی جوان
 دلہن کی کتنی ہی دلجوئی کرے۔ اسکی جوان دلہن اس سے نالاں ہی رہتی ہے۔ خوشحال اپنی
 محبوبہ کے ساتھ آنکھیلیوں کے ذریعے بھی طنز و مزاح کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

تہ می وژنہ د قصاص اندینہ نہ کہہ

د خیل خون بہ تور بہ ونیسم یو بل شوک

ترجمہ:- تم مجھے قتل کرو اور قصاص کی فکر بالکل مت کرو۔ میں اپنے خون کے بدلے میں کسی
 اور کو پکڑ لوں گا۔

ہم دی ووزلم پخپلہ ہم بیا کھورہ

بیا یہ ما باندی تہر و ہی ماتم کا

ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا۔ اور پھر دیکھو کہ تم سیز کو بی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم کر رہے ہو۔

خوار خوشحال پہ مرگئی حال دے ٹٹکدن کا
راشد گورہ پہ ایمان دلیدو ستا مری
ترجمہ:- بے چارہ خوشحال نزع کی حالت میں ہے۔ آؤ دیکھو ایمان سے تمہیں دیکھنے کے لیے مر رہا ہے۔

ترجمہ:- خوشحال کو اپنے پیارے ہونٹوں سے بوسے کی اجازت دے دے۔ تاکہ طوطا
مزے لے لے کر قند کھایا کرے۔

ترجمہ:- خوشحال کو قتل کرنے کے لیے تم کواریوں کھینچتی ہو۔ اسے قتل کرنے کے لیے تو تیری
پلکوں کے ٹاؤک ہی کافی ہیں۔

زہ خوشحال کہ تانہ غوارم مستحق یم
خولہ زکوت راکرہ د حسن لہ نصاب
ترجمہ:- اپنے حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسہ ازراہ زکوٰۃ دے دے۔ کیونکہ میں
خوشحال اس کا مستحق ہوں۔

سپینہ خولہ ٹی و ما راکرہ و ی می مور شوم
و ی ٹی خوارہ و بیہ دا خو نیمر رخے دے
ترجمہ:- اس نے مجھے اپنے سفید چہرے کا بوسہ لینے دیا۔ اور جب میں نے کہا کہ بس میں

سیر ہو گیا ہوں تو کہنے لگی بے وقوف بھوکے یہ تو صرف ناشتہ ہے۔

د سمند سمونہ سرہ پہ وینو درومی

چہرہ بیادہی د چسا مینہ کرہ خرابہ

ترجمہ:- تم جس گھوڑے پر سوار چارہ ہی ہوا اسکے سُخ خون آلود ہیں۔

تم پھر کس کی محبت کو برباد کر کے آ رہی ہو۔

ترجمہ:- جو آپس میں زور آزمائی کرتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں۔

وہ اگر از خود بوسہ دے دے تو زور آزمائی کی حاجت ہی نہ رہے۔

ترجمہ:- اسے یاری کے ہنر کا کچھ بھی پتہ نہیں۔

اگر میں اسے چھو سنا تا ہوں تو وہ رونے لگتی ہے۔

کلمہ ناز کلمہ کنشکل کرہ کلمہ مہر

د خوشحالہ مروہ کہ پخلانہی

ترجمہ:- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے کس قدر ناراض ہو کہ کبھی ناز دکھاتی ہو کبھی کالیاں

دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

ولہی لیچہی بریندہنی تورہ اوکا پڑی

کہ د خوارو د کشتن پہ آہنگ نہ دہ

ترجمہ:- وہ کیوں اپنی باہیں نگلی کر کے میان سے ٹکوار نکال رہی ہے۔

کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

پہ بلر بلر دی د خندا منت راباندی
 چپی لہ وریہ رابنکارہ شی راتہ خاندی
 ترجمہ:- جب تم دور سے نظر پڑتی ہو تو مجھے دیکھ کر مسکراتی ہو۔
 اس مسکراہٹ کا مجھ پر تیرا بار بار احسان ہو۔

چپی دی زہ وی چپی بہ زہ د خوشحال گورم
 راشہ اوگورہ پہ اور اینے کباب
 ترجمہ:- اگر تیرا جی کرتا ہے کہ خوشحال کا دل دیکھے
 تو آ اور آگ پر رکھا ہوا کباب دیکھ لے

ماوے زہ می ستاد مخ پہ اور ورتیہری
 دے وے پریہ چپی، بنہ وریٹ شی دا کباب
 ترجمہ:- میں نے اپنی محبوبہ سے کہا "میرا دل تیرے چہرے کی تپش سے جل رہا ہے۔
 اس نے کہا اسے یونہی چھوڑ دتا کہ یہ کباب اور بھی بھوتا جائے۔

کہ د خپلو سپو نامہ وریاندی کیہ دی
 خولو خوشحال بہ پہ عالم کیشی سربلند کا
 ترجمہ:- اگر تو خوشحال پر اپنے کتوں کا نام رکھ دے
 تو اس کا سر پورے جہان میں بلند ہو جائے

ستا سپیو سرہ گر خم ستا گوخہ کنہی

کونہدی ماور سرہ گنہ کپری پہ حساب

ترجمہ:- میں تیرے کتوں کے ساتھ ساتھ تیرے کوچے میں پھرتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید مجھے بھی انکے ساتھ حساب میں شمار کر لو۔

پہ زرا می غنی خواست د سپینی خولی کرو

پہ خندا نی وی چہی خہ کا داس پے

ترجمہ:- میں نے رو رو کر اس سے سفید چہرے کا ایک بوسہ مانگا تو فہم کر کہنے لگی کہ یہ مردوا کیا کر رہا ہے۔

پہ درست جہان بہ نہ وی یوز ما غونہدی رسوا بل

ورخم تورہ وکنہلے چہی منین واؤرم پہ تابل

ترجمہ:- پورے جہاں میں مجھ جیسا رسوا شخص کوئی اور نہ ہوگا۔ کیونکہ جب بھی تم پر کسی کو عاشق ہونے کا شائبہ ہو تو اسکی طرف گوار بدست چل دیتا ہوں۔

ایسے ہی چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس نے ابھی ابھی فزے کا تجربہ اپنی کمر سے نکالیا ہے

معلوم نہیں اس سے رند کو کاٹا جائیگا یا زہد کو

ترجمہ:- میں نے کہا ”میں تمہارے اس گورے حسین چہرے کا عاشق ہوں“

اس نے کہا ”خدا نے عاشقی بھی کیا سہل کر دی ہے۔“

ترجمہ:- ازبک بھی ایسا شب خون نہیں مارتے

جس طرح تیری آنکھیں بے چاروں پر تاخت کرتی ہیں۔

شاعر ہوا اور رقیب کا ذکر اسکے کلام میں نہ ملے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ رقیب رو سیاہ کا ذکر شاعر کے کلام یا ادیب کے افسانے میں ضرور ملتا ہے۔ نہ ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آٹے میں نمک کی کمی رہ گئی ہے۔ تو پھر خوشحال کے کلام میں رقیب کے ساتھ محاسنت کیوں نہ نظر آئے۔

پہ خٹہ چل نہی ٹخانے نیولے ستا تر خنگ دیے

در قیب خبرہ مہ منہ بدرنگ دیے

ترجمہ:- رقیب نے کسی حیلے سے تیرے پہلو میں جا بٹالی ہے

تم اسکی کوئی بات مت مانو کہ یہ بدرنگ (اور جھوٹا) ہے۔

در قیب گونہ چہ بدہ شوہ لیدہ دی

چہ نہ ماتہ پہ تہولی کنہی موسکیدلی

ترجمہ:- جب تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی تو تم نے دیکھا کہ رقیب کی حالت کتنی غیر ہو رہی تھی۔

یارہ تہ چہ لہ اغیار سرہ خندا کمری

د خوشحال پہ لہ مانہ درومی چارہ

ترجمہ:- اے محبوبہ جب تو اغیار کے ساتھ ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ تو خوشحال کے

معدے میں چھری گھس جاتی ہے۔

ترجمہ:- وصال یار کے وقت رقیبوں سے امان چاہیے۔ بہار کے موسم میں پریشان کرنے والی بے شمار کھیاں پھرتی رہتی ہیں۔

ترجمہ:- اگر تو یار کی تلاش میں ہے تو جا کر رقیبوں کو ڈھونڈ

گلاب کا پھول وہیں ہوتا ہے جہاں خار ہوتے ہیں

ترجمہ:- جب میں یار کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو رقیب ہمیشہ مجھے بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا یہ اندھے نہیں ہو سکتے۔

ترجمہ:- رقیب کی برائی سے عاشق ایسا کاٹا جاتا ہے۔ جیسے کتے اپنے دانتوں سے آدمی کو کاٹتے ہیں۔

بڑھاپے سے منسلک چند اور اشعار کا ترجمہ جن میں اپنی ذات پر طنز کے تیر بر سائے ہیں:-
ترجمہ:- ستر سال سے گزر چکا ہوں۔ کج چشم کو تو ایک کے دو نظر آتے ہیں میں ایک کو سات دیکھتا ہوں۔ اگر میں اسی (۸۰) سال تک پہنچ جاؤں تو ظاہر ہے کہ ایک کے بیس دکھائی دیں گے۔

تو معلوم ہوا کہ خوشحال کے ہاں مزاح کم اور طنز کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ انکی شخصیت میں سموئی صاف گوئی نے بھی انکے کلام میں ایسے اشعار کو جنم دیا ہے جو طنز، ہجو اور تمسخر کے زمرے میں آتے ہیں۔ طنز و مزاح اور ہجو و تمسخر کے اس ملغوبے سے ہم خوشحال کی ایک نئی اور اچھوتی شخصیت کو ابھرنا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

غالب کے دور میں مغلیہ سلطنت کی شمع حیات ٹھٹھانے لگی تھی۔ پھر خرد آ یا یہ شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی اور غالب نے ساٹھ سال کی عمر میں دلی میں انگریزی استعمار کی جھلک دیکھی۔ گو کہ وہ تیس برس پہلے ہی اسکی ابتدائی حکومت کا نقشہ کلکتے میں دیکھ آئے تھے۔ ان تمام واقعات و عوامل کے پیش نظر غالب کے رد عمل اور انکی شاعری اور نثر پر ان عوامل کے اثرات کا ہونا بھی لازم ہے۔ مگر جس چیز نے غالب کے کلام اور انکے مکاتیب کو متاثر کیا وہ انکی شخصیت تھی:-

”وہ اپنے محبوب کی موت پر آنسو بہاتے ہیں مگر ان کی ساری عمر آنسو بہانے میں نہیں گزری۔ ایک شوخ اور آزاد طبیعت ان کے یہاں وہ لطیف حسن پیدا کر دیتی ہے جسے (Sense of humour) کہے ہیں۔“

(آل احمد سرود ”غالب کی عظمت“)

غالب کی شاعری چار ادوار پر مشتمل ہے۔ جو آگرہ دہلی اور رامپور پر محیط ہیں۔ جہاں تک انکی شاعری میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا تعلق ہے تو یہ عناصر انکے چوتھے دور میں زیادہ نمایاں ہو کر تکمیل کو پہنچے۔ انکے مکاتیب بھی اسی چوتھے دور کی یادگار ہیں۔ یوں تو غالب کی اردو غزلوں اور قصیدوں کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار کے لگ

بھگ بتائی جاتی ہے۔ مگر ان سے تقریباً اٹھارہ سو اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشن چھپوائے گئے۔ جہاں تک دیوان میں شوخ اشعار کا تعلق ہے تو وہ میری تحقیق کے مطابق کم و بیش ڈیڑھ سو بنتے ہیں۔ ویسے تو آپ کو غالب کے اکثر اچھاڑ میں شوخی و ظرافت کی لطیف سی لہر دوڑتی نظر آئے گی۔

دوسری بات جو غالب سے متعلق خاص ہے وہ یہ کہ انکی نثر کا بیشتر حصہ مکاتیب جنہو پر مشتمل ہے اور یہ کہ ان کے مکاتیب میں سے شوخی و ظرافت چھلک چھلک پڑتی ہے۔ یوں غالب برصغیر کے واحد شاعر و نثر نویس جنہوں نے نثر و نظم دونوں میں شوخی و ظرافت کو برتا۔

”غالب کا اصل فن اس کی شوخ نگاری تھی۔ اس کی غیر معمولی رسائی ذہن تھی۔ انداز بیان کی ندرت تھی اور اس کی شاعری کی یہ خصوصیت اس کے ہر صنفِ سخن میں پائی جاتی ہے“
(نیاز فتح پوری، ’دلنی بادہ خوار‘)
شیلے نے کہا تھا:-

“Our Sincerest Laughter With some pain is Fought”

جب ہم غالب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں بیشتر شیلے کے خیالات پر پورا اترتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ انکے اشعار کو سمجھنے اور ان میں سے شوخی کے پہلو کو برآ کر نہ کرنے کے لیے قوتِ تحلیل کا استعمال ناگزیر ہے۔

گو کہ غالب کے مکاتیب انکے آخری دور کی یادگار ہیں۔ لیکن ہم یہاں ان کا

ذکر انکی شوخ شاعری سے پہلے کرنا چاہیں گے:-

”غالب نے اپنے خطوں میں ظرافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں بے ٹکرا پن نہیں بلکہ ظاہری خوش طبعی اور زعمہ دلی کی تہہ میں بھی ان کے تجربات اور جذبات درد کام کر رہے ہیں۔ ان کی ظرافت کے سرچشمے ان کے درد و غم ہی سے پھوٹتے ہیں۔ درد اور ظرافت کا یہی اجتماع حقیقت میں کسی ادب پارے کو اعلیٰ ادب کا درجہ دیتا ہے۔ غالب کی ظرافت میں ان دونوں عناصر کا اجتماع ہے“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو نثر“)

جزئیات نگاری اور منظر کشی مرزا پر ختم ہے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:-
 ”برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قبر ہے۔ قاسم جان کی نگلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیک کے کڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا گر گیا۔ میڑھیاں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھے کا حجرہ جھک رہا ہے چپٹیں چھلنی ہو گئی ہیں۔ مینہ گھڑی بھر رہا تو چھت گھٹ بھر رہے“
 سفید بالوں کے نکل آنے پر بھری کا تصور یوں دلایا ہے:-

”۔۔۔۔۔ جب داڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔۔۔۔۔ اس سے

بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کید و دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی
اور ڈاڑھی بھی۔“

غالب کے مکتوبات اس قبیل کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اوپر کی یہ چند مثالیں دے
کر مکاتیب غالب میں شوقی و ظرافت کا باب بند کرتے ہیں۔ اور انکی شاعری میں ان
اصناف کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو غالب کے اشعار کی شوقی کے ضمن میں سامنے آتی ہے وہ
یہ کہ وہ اپنے اشعار میں منظر کشی کرنے کے بادشاہ ہیں۔ مثلاً تصور کیجئے کہ غالب حیران سالی
میں اپنی عمر کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ اور گھوڑا سوار نے اپنے
آپ کو اللہ توکل چھوڑا ہوا ہے۔ یہ منظر ذہن میں رکھتے ہوئے غالب کا منظر کش شعر ملاحظہ
فرمائیں:-

رو میں ہے ریش عمر کہاں دیکھیئے تھے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ منظر کہ عاشق ہجر سے تنگ آ کر خود کشی کی بجائے معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جانے کو ترجیح
دیتے ہوئے اپنے سر پر کفن اور کمر سے کوار یعنی آگہ قتل باندھ کر سوئے معشوق چلا جا رہا
ہے اور اسکے لبوں پر یہ شعر ہے:-

آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

عذر میرے قتل کرنے میں وہ فرمائیں گے کیا؟

جسمانی ناتوانی اور دماغی بدگمانی کی وجہ سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کے منظر میں شوخی کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں:-

ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

غالب کو کوچہ یار سے بڑی رغبت تھی۔ اس ضمن میں ان کے متعدد اشعار موجود ہیں مگر کوچہ یار یا محبوبہ کے گھر کے پتہ کو رشک کے ساتھ مربوط کر کے غالب نے جو شعر کہا ہے اسکی بات ہی کچھ اور ہے۔ عاشق کو رشک کی بنا پر گوارہ نہیں کہ کسی سے اپنی محبوبہ کے گھر کا پتہ پوچھیں کہ یوں دوسروں کو بھی اسکی محبوبہ سے دلچسپی پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ تو لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ محبوبہ سے ملنے کے لیے میں کس طرف جاؤں:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

کوچہ یار سے متعلق تمام ماحول یعنی محبوبہ کے گھر اسکی مجلسِ پاسبانِ دربانِ حتیٰ کہ محبوبہ کے پاس محبت نامے پہنچانے والے نامہ بر کا نقشہ غالب نے اپنے اشعار میں شوخی کی چاشنی کے ساتھ کھینچا ہے۔ چند نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

دائِم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خُلد میں گر یاد آیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

اُس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

بعد اک عمر درغ یار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

یار اور کوچہ یار کے ارد گرد ایک اور شخص بھی گشت کرتا رہتا ہے۔ اور وہ ہے رقیب روسیاء۔
غالب نے مختلف زاویوں سے رقیب کا جائزہ یوں لیا ہے:

ذکر اس پری دیش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

تا کرے نہ غازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

بوسہ خاص طور پر مشرقی شعراء کا ہر دلعزیز مضمون رہا ہے جسے ہر ایک نے مختلف زاویوں

سے برتا ہے۔ مگر غالب نے اس مضمون پر جتنے اشعار کہے ہیں وہ تقریباً سب کے سب

ظہریہ ہیں اور ساتھ میں شوخی و ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کریں:-

نچنے نو ٹکفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا

بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

صحت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لکھ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

دکھا کر جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و حرات رندانہ چاہئے

زلف آنکھیں، بھونیں، ابرو رخسار، گردن اور نکلائی وغیرہ کا بیان تو ہر شاعر کے کلام میں مل جائے گا لیکن غالب کی شوقی طبیعت کا کیا کیا جائے کہ انہوں نے محبوبہ کے پاؤں کی بھی طرح طرح کی تصاویر اتاری ہیں۔ اور ایک شعر میں اپنے پاؤں پر بھی عجیب و غریب نظر ڈالی ہے:-

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سسکتن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اللہ رے ذوق دشت نور دی کہ بعد مرگ
 ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
 جب بات چل ہی نکلی ہے تو بستر اور کنبے سے متعلق بھی غالب کی نکتہ افروزی اور شوخ طبیعت
 پر اک نظر دوڑا لی جائے:-

خوشا اقبال رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو
 فروغ شمع بالیں، طالع بیدار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
 کہ بچا بی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

نفس آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
 ہوئی پھر اس کو مری نفس بے کفن نکلیے

مزا لے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
 رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن نکلیے

مرزا نہ صرف یہ کہ مشرب ممنوعہ کے بے طرح عادی ہو گئے تھے اور اسے اپنی ضروریات

زندگی میں سے سمجھتے تھے بلکہ ان کے کلام میں بھی مے نوشی پر بڑے جاندارا شععار ملتے ہیں جن میں طنز اور شوخی کی ہلکی سی لہر دوڑتی نظر آتی ہے:-

جان فزا ہے بارہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

بچوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سپو کیا ہے

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل موج شفق موج سب موج شراب

موج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدہ غنچہ باغ
گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار

کہاں سے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں گل وہ جانتا تھا کہ ہم اٹکے

ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھڑیں گے رکھ کر نذر مستی ایک دن

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی شخص کتنا حوصلے مند ہے اور کتنا جلدی دوسروں میں ٹھٹھکنے لگنے والا ہے تو معلوم کرو کہ وہ شخص اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کسی کا یہ کہا کہاں تک درست ہے مگر مرزا غالب کی حد تک تو یہ سو فیصد صحیح اترتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

غالب نے اچھی خاصی تعداد میں ایسے اشعار چھوڑے ہیں جن میں وہ اپنی ذات کو طنز و مزاح یا غربت و مسکینی کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں۔

”مزاح کی طرح غالب کی طنز بھی لطیف ہے گواہی براہ راست یا سادہ نہیں۔ ان کے ہاں وہی بات جب تک سادہ اور براہ راست رہتی ہے ہلکے پھلکے مزاح کا نمونہ معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں اس میں معمولی بھی خرم آ یا طنز کا جھکسپاؤں اور ظرافت کا ستم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اعتماد اور قابو کی مثالیں کوئی حالی سے پوچھے یا ان دوستوں سے جن کے نام غالب نے ہنس کر خطوط لکھے ہیں یا پھر ان مقلدوں میں دیکھے جن میں کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی سخن گسترانہ بات آپڑی ہے“

(رشید احمد صدیقی ”کوئی بھلاؤ کہ ہم بھلا نہیں کیا“)

آئیے ہم بھی ایسے مقطعوں اور دوسرے اشعار سے لطف اندوز ہوں جن میں بھلاہر غالب نے اپنی ذات یا اپنے ماحول پر چوٹ کی ہے مگر ایسا کر کے ہمارے لیے طنز و مزاح کا

سامان کر گئے :-

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عشق نے غالب نکلا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

دھول دھپا اس سراپہ ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

چاہتے ہیں خوروں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم تلائیں کیا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو عمر نہیں آتی
بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب
تماشاۓ اہل کرم دیکھتے ہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب ایک نہایت ہی صاف گو انسان تھے۔ اور انکی
یہی تصویر اپنے دیوان کے متعدد اشعار سے بھی جھلکتی ہے۔ مرزا نے خدا پر تو طعن کیا ہی ہے۔
انکے قلم کی کاٹ سے فرشتے، خلیفہ، شیخ، مختب اور زاہد کوئی بھی نہیں بچا۔ کعبہ، زمر، حرم، دیر،
کیسا، مسجد، مندر اور خانقاہ پر بھی ان کی نظر کرم رہی ہے۔ چند ایک مثالیں پیش ہیں:-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدی کوئی * ہمارا دم تحریر بھی تھا

اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز میا مرے آگے

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب پہ خیال اچھا ہے

جب سیکڑہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ' مدرسوہ ہو ' کوئی خانقاہ ہو

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیو میں احرام
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدی کبھی بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت ناصح گر آویں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالب کو جوانانیت اپنے خاندانی ماحول اور درباری رجب کی وجہ سے ملی اس نے
سن کی شخصیت پر غیر مثبت اثرات ڈالے مگر ساتھ کے ساتھ انکو یہ حوصلہ بھی بخشا کہ وہ ہر غم
اور ہر مصیبت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہوں اور نہ صرف اس غم کو سہا بلکہ ایسا کرتے
ہوئے ایک اطمینان اور ایک لطیف شوخی اسکے لبوں پر موجود رہی۔ اور جب کبھی وہ اپنے

آپ کو جتانے کے موڈ میں ہوتے تو خود داری اور عزت نفس کے ہتھیاروں سے ایس ہو کر
 مد مقابل کے سامنے آتے یہاں تک کہ اپنی معشوقہ کو بھی اکثر On the Defensive
 رکھتے۔

شوخی کے ضمن میں مجھے دیوان غالب کا جو شعر نہایت مرغوب ہے اس پر اس مضمون کو ختم
 کرتا ہوں:-

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
 جلا د کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

خوشحال و غالب اقبال کی نظر میں

اس میں کلام نہیں کہ خوشحال و غالب اور اقبال زمانہ ساز شخصیتیں تھیں۔ اگرچہ ہم خوشحال اور غالب کا بلا واسطہ موازنہ کرنے نکلے ہیں مگر اس راستے میں اب ہم ایک ایسے مقام سے گذر رہے ہیں جہاں اقبال کی شخصیت، بار بار ہماری نظروں کے سامنے آ رہی ہے۔ اسلئے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کو علامہ اقبال کی نظر سے پرکھیں۔ جو شاید ایک منفرد ادبی تجربہ ہو۔ باوجود یہ کہ اس سے پہلے خوشحال و اقبال اور غالب و اقبال کا موازنہ کسی نہ کسی طور کیا جا چکا ہے۔ آئیے پہلے خوشحال کو علامہ اقبال کی نظر سے دیکھیں:

خوشحال۔ اقبال کی نظر میں

میر عبد الصمد خان کی شہرہ آفاق کتاب خوشحال و اقبال کے صفحہ اول پر خوشحال و اقبال کے یہ دو اشعار لکھے ہوئے ہیں:-

خوشحال لکھ باز پہ لوٹے لوٹے ہنسکار زما نظر دے

نہ چہی گھر خفی گونگت نیسی باد خورک یم

ترجمہ:- میری نظریں باز کی طرح بڑے بڑے شکار پر ہوتی ہیں

میں کیڑے مکوڑے پکڑنے والا جانور نہیں ہوں۔

اقبال نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے

شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

آگے چل کر اسی کتاب خوشحال و اقبال کے تعارف میں مندرجہ ذیل الفاظ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں:

”اقبال اور خوشحال کے زمانوں میں کم و بیش دو سو سال کا فرق ہے۔

اقبال کا حلقہ فکر و نظر لازمی طور پر خوشحال سے وسیع تر ہے۔ علوم

جدیدہ سے ان کی کامل واقفیت اور عصر حاضر کے پیچیدہ ماحول نے

ان کی نظم و نثر کو وہ گہرائی عطا کی ہے جس کی تلاش عہد شوق کے کسی

مصنف کی تخلیقات میں لا حاصل ہوگی۔ تاہم اساسی طور پر دونوں

(خوشحال و اقبال) کے افکار کا شیع وہی سرمدی سوتا ہے جو کم و بیش چودہ

سو سال ہوئے ریگزار عرب میں سے پھوٹا اور جس کی آبیاری سے

انسانی قلب و نظر کی پھلواہی اب تک ہری بھری ہے۔ اقبال اور

خوشحال میں یہی وہ مشترک عنصر ہے جس سے فقر ’خودداری‘ حریت

پسندی، بلند ہمتی اور سخت کوشی کی اقداران کے کلام میں رچی ہوئی نظر آتی ہیں۔“

(ڈاکٹر ایس اے رحمن جج سپریم کورٹ آف پاکستان، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

اور اسی کتاب ”خوشحال و اقبال“ کے پیش لفظ کے یہ چند الفاظ بھی قابل توجہ ہیں:-
 ”حیرت و مسرت کی اچھا نہیں رہتی کہ آج سے تین سو سال پہلے ضلع
 پشاور کے ایک گاؤں اکوڑہ ٹنک میں ایک اور شخص گزرا ہے جسے دیکھ
 کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پشتو کا اقبال یا شکل خوشحال تھا یا
 تین سو سال بعد اردو کا خوشحال بہ شکل اقبال پیدا ہوا۔“

(محمد جعفر شاہ پھلواری، رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۶۰-۶۱-۱۰)

تاریخ گواہ ہے کہ علامہ اقبال کو ملت افغان سے دلی محبت تھی۔ وہ اسے ایشیا کے دل کی
 حیثیت دیتے تھے:-

آسیا یک جیکر آب و گل است

ملت افغان در آں جیکر دل است

ایک اور جگہ شاعر مشرق افغانوں کی فضیلت یوں بیان کرتے ہیں:-

”مقتدی تاتار و افغانی امام“

خوشحال کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک اور موقع پر ضرب کلیم میں علامہ نے افغان ملت کو
 خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرمایا:-

”اپنی خودی پہچان اور غافل افغان“

اگر علامہ اقبال نے شاہ امان اللہ خان اور نادر شاہ شہید فرمان روایان افغانستان کی شان میں قصیدہ (۱) اور مثنوی (۲) کے اشعار لکھے اور خود نادر شاہ کی حکومت پر ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں مولانا سلیمان ندوی اور سرسید احمد خان کے نواسے سردار اسد محمود کا ایک وفد لیکر کابل کا دورہ کیا تو یہ سب انکی اس تڑپ کے مظاہر ہیں جو وہ ملت افغان کے لئے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ کے دوستانہ روابط اُسوقت کے وزیر تعلیم افغانستان کے ساتھ بھی تھے۔ جو خوشحال خان خٹک کی منکومات کے سلسلہ دار انگریزی تراجم علامہ اقبال کو کابل سے بھجوایا کرتے تھے۔ گو کہ اس سے پہلے علامہ نے انگریز مستشرق۔ میجر راورٹی کی انگریزی میں ترجمہ کی ہوئی خوشحال کی سو کے قریب نظموں کا مطالعہ اپنے قیام جرمنی کے دوران کر رکھا تھا۔ اور ان سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن کے انگریزی مجلہ ”اسلاک کلچر“ میں ایک مضمون بعنوان ”The Afghan Warrior Poet“ رقم کر چکے تھے۔ جس میں انہوں نے خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا جو اظہار کیا تھا اسے ڈاکٹر سید عبداللہ یوں بیان کرتے ہیں:-

”علامہ اقبال کے جس خیال نے مجھے اپنی طرف فوراً متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ:-

”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما

نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطہ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔“

یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عربی شاعری کی روح و آزادی و صداقت کی بڑی عزت تھی چنانچہ انہوں نے اسرار خودی کے دیباچہ میں معاصر شعراء کو عربی شاعری کی پیروی کی تلقین کی تھی اور فرمایا تھا:-

۔ رہتے سوئے عربی بایت

ڈاکٹر سید عبداللہ آگے چلکر فرماتے ہیں:-

”جہاں تک مجھے معلوم ہے علامہ اقبال نے غالب (اور شاید قدرے نظیری غیشا پوری) کے سوا فارسی اور اردو کے کسی شاعر کو ”یہ رتبہ عطا نہیں کیا جو خوشحال خان کو دیا“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی جھلک ‘خوشحال نامہ‘) خوشحال کا کلام پڑھنے اور اس سے حدود و متاثر ہونے کے بعد علامہ اقبال نے نہ صرف افغان وزیر تعلیم کو خوشحال کی شخصیت اور شاعری پر مزید ریسرچ کے لیے کسی جید عالم کو مقرر کرنے کے لیے کہا بلکہ لاہور کی ریسرچ سکاںلر محترمہ خدیجہ فیروز الدین کو بھی خوشحال پر پی

ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی تلقین کی۔ محترمہ خدیجہ نے یہ مقالہ لکھا۔ اور اس پر ان کو ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

خوشحال کا کلام پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اسے یوں خراج تحسین پیش کیا:-

خوش سرو و آں شاعر افغان شناس

ہر کہ جند باز گوید بے ہراس

آں حکیم ملت افغانیاں

آں طیب ملت افغانیاں

راز قوس دید و بے پاکانہ گفت

حرف حق باخوشی رندانہ گفت

اس کے علاوہ علامہ نے خوشحال کی وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی:-

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم

کہ ہو نام افغانوں کا بلند

مبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کند

مغل سے کسی طرح کم تر نہیں

کوہستان کا یہ پہچان ارجمند

کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات
وہ مفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مثل شہسواروں کی گردِ سمند

خوشحال و اقبال کے نظریات اور فلسفہ ہائے حیات

زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم اتنا کہنے پر اکتفا کر سکتے ہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے اسلام کی تعلیمات سے استفادہ کیا تھا۔ اس لئے دونوں مسلمانوں کے اتحاد کے نظریہ پر متفق تھے۔ جہاں خوشحال نے مظلوموں کے وقتی مظالم سے تنگ آ کر ملت افغان کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور افغانوں کے تنگ اور عزت کی خاطر اپنی کمر سے گوار لٹکائی وہاں اقبال نے پوری مسلم ملت کو ایک لڑی میں پروانے کی کوشش کی۔ لیکن اگر نظرِ عمیق دیکھا جائے تو خوشحال جس جغرافیائی اکائی کو مظلوموں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ وہ آج کے مغربی پنجاب صوبہ سرحد کا بل قند ہار اور کشمیر پر مشتمل تھی۔ جہاں ملت افغان کے افراد کم یا زیادہ تعداد میں آباد تھے۔

”علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت شمالی ہندوستان

میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے علاوہ کشمیر اور افغانستان کو بھی اپنے تصور کا آزاد اسلامی ملک گردانا تھا جیسا کہ پاکستان کے حروف ”مک“ اور ”الف“ سے ظاہر ہے۔۔۔۔۔ خوشحال خان خٹک ساری عمر پختونوں کے اسی علاقے کے لئے لڑتا رہا جو آج پاکستان کا بازوئے ہندوؤں کے لئے کہلاتا ہے اپنے اس علاقے کے لوگوں کو موجودہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ وہ پاکستان کے اسی حصے کو ہندوستان سے الگ اور آزاد رکھنا چاہتا تھا۔۔

(میر عبد الصمد خان، ”خوشحال و اقبال“)

”جہاں خوشحال نے افغان قوم کے لئے ”پشتو“ پر قائم رہنا ضروری سمجھا وہاں اقبال کے ہاں خود شناسی اور خدا شناسی کے مجموعے ”خودی“ کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ”پشتو“ چند اوصاف کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ اوصاف اسلام میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی شجاعت، مردانگی، سخاوت، مہمان نوازی، غیرت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال اور ارادے کی پختگی لیکن ”پشتو“ کے نظریہ میں چند غیر اسلامی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اقبال کی خودی ایک مکمل اخلاقی نظام کے نیچے فرد اور ملت کی تربیت کا نام ہے۔

اسی سلسلے میں خوشحال کی ”پشتو“ کے نظریے سے تنکیال مرد یا باتور (غیرت کرنے والا) عزت کے لیے جان پر کھیل جانے والا، تھوڑا بولنے والا، زیادہ عمل کرنے والا (وجود میں آیا تو اقبال کی خودی کے نظریہ سے مرد مومن (توحید کے راستے پر چلنے والا) مرد آزاد

مرد قلندر، مرد کامل اور بندۂ مولا صفات (وجود میں آیا۔ علامہ اقبال اپنے مرد مومن کی تعریف یوں کرتے ہیں:-

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کار کشا، کار ساز

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز

اسکی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

اس کی ادا و القریب، اس کی نکلہ و لنواز

نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

خوشحال اپنے تنکیال کی ستائش یوں کرتے ہیں:-

ترجمہ:- مرد وہ ہے جو باہمت اور بابرکت ہو

وہ دوسروں کے ساتھ کھائے پیئے اور ہائش رکھے

جس کا قول بکا اور عہد عہد ہو

نہ تو دروغ گو ہو نہ ہی فریب کار

اونہی ظاہری طور پر پر تپاک ہو

خاموشی سے تھوڑا بولے اور زیادہ عمل کرے

اور غنچے کی مانند اس کا منہ بند ہو کر سینہ چاک
 اور جہاں پستی و بلندی کا ذکر آئے تو
 بلندی میں آسمان ہو اور پستی میں خاک
 باغ میں تازہ و مختلف پھول کی طرح ہو
 جس پر سوا پلبلیں منڈلاتی رہتی ہیں

غور کریں تو خوشحال کا تنکیال اور اقبال کا مرد مومن ایک دوسرے کے کافی نزدیک نظر آئیے
 یہ اس لیے کہ دونوں نے اپنا تصور انسان قرآن پاک کی تعلیمات اور فلسفہ توحید سے لیا
 ہے۔ اور اپنے اپنے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔

(میاں سید رسول رسا "مقدمہ ار مغال خوشحال")

مرد مومن اور تنکیال کے علاوہ خوشحال کا باز اور اقبال کا شاہین بھی ایک جتنی صفات کے
 حامل ہیں۔ خوشحال بابا کہتے ہیں:-

نہ مچ یم نہ کارغہ یم چہ پہ کھرو مرو گھر خم
 یا باز یم یا شاہین یم پہ خیل بشکار مہی زہ خرم دے
 ترجمہ:- میں نہ کبھی ہوں اور نہ کوا کہ مردار چیزوں کے پیچھے پھروں۔ میں تو باز ہوں شاہین
 ہوں میرا دل اپنے شکار کو دیکھ کر خرم رہتا ہے۔
 خوشحال و اقبال دونوں نے فلسفہ رستخیز اور سخت کوشی پیش کیا۔

چہی خرگندہ سریازی گاندی دتورو

زہ خوشحال ختک تر ہسی ہنر خارشم

ترجمہ:- جب جنگ میں گواروں کے ساتھ سرکی بازی لگائی جاتی ہے۔ تو خوشحال ایسے ہنر کے قربان جاتا ہے۔

اقبال:- بدرباغلط و بامویش در آویز

حیات جاوداں اندر تیز است

اسکے علاوہ خوشحال و اقبال کی شاعری میں رجائیت، آرزو، جستجو، دعا، حق گوئی اور مہیا کی کے مضامین میں حد درجہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اغیار اور دوستوں کے لیے انسان کو کیسا ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر ہمارے ان دونوں نابہ شعراء کے خیالات کی ہم آہنگی ملاحظہ کریں۔ خوشحال بابا فرماتے ہیں:-

واغیار تنہ لکہ کانے، موم و یار تہ

پہ سختی، لو پہ نرمی، کجسی ہغہ زہ یم

اہل شر تہ دشاہین منگل پیدا کرہ

اہل خیر تہ حلیم شہ تر حمام

ترجمہ:- جو اغیار کے لیے پتھر اور دوست کے لیے موم ہو

نخئی اور نرمی میں، وہ میں ہوں

اہل شر کے لئے شاہین کا پنجہ پیدا کر

اور اہل خیر کے لئے کیوتر سے بھی زیادہ نرم ہو جا

اقبال:-

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں حریر پر نیاں ہو جا

ہمارے ان دونوں شعراء کے نزدیک جنت کا تصور بھی تقریباً ایک جیسا ہے:-

خوشحال:-

زاہدانِ چہِ مونسِ روزہ کا جنتِ غواری

ما خوشحال د مزدوریہ طاعتِ نہ زندہ

ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز روزے کے بدلے جنت کے خواہاں ہیں۔

مجھے اس قسم کی مزدوری اور اطاعت کرنی نہیں آتی۔

اقبال:- سوداگری نہیں یہ عبادتِ خدا کی ہے

او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

آخر میں دو ایک عجیب اتفاقات کا ذکر کے اس مضمون کو سمیٹتے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب اتفاق

نہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے شاعرانہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

خوشحال:- زہِ دشمن پہ کارِ ہیخ نہ یمِ خوشحال

ولعی خدائے مہی کرو پہ غارہ دا مقال

ترجمہ:- میں شعر و شاعری کے کام سے خوش نہیں ہوں

مگر خدا نے یہ کام میرے گلے میں ڈال دیا ہے۔

اقبال:-

”میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی شاعر نہیں سمجھا۔ مجھے شاعری کے فن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی میرے کچھ مقاصد ہیں جنکو بیان کرنے کے لیے میں نے اس وطن کے حالات اور روایات کی وجہ سے نظم کے ذریعے کو ترجیح دی ہے“

بہ حوالہ ماہنامہ ”دعوت“ اسلام آباد مئی ۲۸ نومبر ۱۹۹۹ء

(سرمایہ ”پشتو“ پشتو اکیڈمی پشاور نومبر- دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۷۱)

دوسرا عجیب اتفاق یہ ہے کہ خوشحال و اقبال دونوں نے اپنی موت سے پہلے پشتو کوئی کے انداز میں اشعار کہے ہیں جو انکے آخری الفاظ کہے جاسکتے ہیں اور جن میں حدودِ جدِ ممالمت پائی جاتی ہے۔

خوشحال:-

نہ به زما غوندي بل ننگياله راشي

نہ به زما غوندي بل جنگياله راشي

ختک لا پر سرده په درست افغان کنسي

عجب که هسي فرهنگياله راشي

ترجمہ:- خدای میرے بعد میری طرح کا کوئی نکال آئے گا

نہی میرے بعد میری طرح کا کوئی جنگجو آئے گا
 ننگ قوم کا تو کیا کہنا بلکہ پوری افغان
 قوم میں شاید کہ میری طرح کا کوئی دانشمند آئے
 اقبال:-

نیسے از جہاز آید کہ نہ آید
 وگر دانائے راز آید کہ نہ آید

اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں:-

”خوشحال کی علمی، ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی گونا گوں خصوصیات اور صلاحیتوں کے پیش نظر اتنا عظیم اور جینکس فنکار ہے کہ پورے ایشیا میں اُس کا جانی پیدا کرنا محال ہے۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے انسانِ کامل کا تصور خودی کا فلسفہ اور شاہین کا کھل پیش کیا۔ قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس نے (ان) تین ستونوں پر اپنی شاعری کی عمارت اٹھائی۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری بھی ان ہی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ یہ کوئی حسن اتفاق نہیں۔ بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے سب سے پہلے میجر راورٹی کے حوالے سے خوشحال کی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ پیش کیا۔ اسی طرح خوشحال کے خودی کے

فلسفے کی شاہین کی علامت کو اسی کے پیش کردہ مفات و خصوصیات
کے ساتھ اپنایا اور ان سے ملت خوابیدہ کو بیدار کرنے کے لیے خاطر
خواہ کام کیا۔

(فارغ بخاری رضا ہدائی، ”خوشحال خان خٹک“ تلاش اور منکوم ترجمہ، ص ۱۶، لوک
ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد، ص ۱۹۸۰ء)

غالب۔ اقبال کی نظر میں

خوشحال کو اقبال کی نظر سے دیکھنے کے بعد ہم غالب کی طرف آتے ہیں۔ جیسا
کہ معلوم ہے غالب نے اردو شاعری کو ایک نئے رنگ میں ڈھالا اور وہیں سے اردو کی
جدید شاعری کی ابتداء ہوئی۔ اس کا اثر اردو غزل پر خاص طور سے پڑا جو حالی و اقبال سے
ہوتا ہوا آج کے شعراء میں آجھلکتا ہے۔ گو کہ اقبال نے غزل کو بھی نبھایا لیکن انکا اصل
میدان نظم میں ہے۔ بہر حال جب غالب کا ذکر کرتے ہیں تو انکی انفرادیت انکے زور تجنیل
اور انکی فکر کی مرمون منت سمجھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے غالب کو اپنی عقیدت
کا نذرانہ یوں پیش کیا ہے۔

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے یہ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہمنشین

تو کیا اقبال نے غالب سے فیضان حاصل کیا جس سے ظاہر ہو کہ اقبال کی نظر میں غالب کا کیا مقام ہے:-

”غالب سے صحیح معنوں میں اگر کسی نے فیضان حاصل کیا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اقبال نے غالب کا تتبع کیا ہے۔ اقبال کی شخصیت غالب سے بالکل الگ ہے اور اتنی منفرد کہ ان کے بنیادی عناصر میں کوئی مشابہت نہیں۔ سر عبدالقادر مرحوم نے بانگِ درا کا دیباچہ لکھتے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ”اگر میں سلسلہ تاریخ کا قائل ہوتا تو سمجھتا کہ غالب کی روح نے اقبال کے پیکر میں دوبارہ جنم لیا ہے۔“ یہ عقیدہ درست نہیں۔ اقبال نے غالب سے اسی طرح فائدہ اٹھایا ہے جس طرح انہوں نے باضی کے تمام بلند پایہ شاعروں سے۔ انہوں نے اردو فارسی کے ادبِ عالیہ کی تمام زعمہ روایات کو اپنے اندر سمولیا ہے۔۔۔۔۔ لیکن غالب کی طرف

انہوں نے اس لیے زیادہ رجوع کیا کہ غالب ہی اس وقت تک اردو میں اکیلے شاعر تھے۔ جن کے یہاں فکر کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال جو بات کہنی چاہتے تھے وہ ولی 'قائم' میر 'مومن' یا خود ان کے استاد داغ کی زبان میں ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے لامحالہ غالب کے طرز گفتار سے انہوں نے فائدہ اٹھایا لیکن ان کی شخصیت اور ان کا وجدان بالکل غالب سے منفرد ہے۔ اس لیے موضوعات کے سلسلے میں انہوں نے نئی سمت سفر کیا۔

(خلیل الرحمن اعظمی "غالب اور عصر جدید")

جاوید نامہ میں غالب کے متعلق اشعار ان سے سوال و جواب اور ان کی ایک مشہور فارسی غزل کے منتخب اشعار کی نقل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شعراء میں اقبال سب سے زیادہ غالب سے متاثر تھے۔ وہ ان کو محض فنکار ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ سمجھتے تھے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

جب ہم انفرادیت پسندی کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے پرانے دور کے شعراء کسی نہ کسی بسکہ بند شاعر کی پیروی کرنے ہی کو شاعری کا کمال سمجھتے تھے۔ اس دور کے بڑے شعراء یعنی میر اور مومن کی بات ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے اپنا الگ رنگ بنانے کی کوشش کی کہتے ہیں کہ غالب کی کامیابی کا راز ہی ان کی انفرادیت میں مضمر ہے:-

”نظم کے شعراء اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ اس انفرادیت پسندی کی ابتداء غالب سے ہوئی اور ہمارے ہاں کے جدید رنگ کے شعراء ابھی تک اسی منہج پر چل رہے ہیں۔ اقبال کی دنیا غالب کی دنیا سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان دونوں میں واقعی بعد المشرقین ہے۔ غالب ہندوستان میں مغلیہ دور کے کلچر کا آخری ترجمان ہے اور اقبال مشرق میں مغربی فکر و خیال کا سب سے بڑا نمائندہ، مگر شاعری کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کا عکس بنانے کے نقطہ نظر سے اقبال نے غالب کی قائم کردہ روایت نبائی ہے“

(آفتاب احمد ”اردو شاعری میں غالب کی اہمیت“)

ایک اور خصوصیت جس کی وجہ سے اقبال نے غالب کے کلام کو پسند کیا وہ غالب کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کا رنگ ہے۔ ان کو ابتدائی عرب شاعری کا یہ رنگ پشتو، اردو اور فارسی کے شعراء میں سے خوشحال غالب اور کسی حد تک نظیری نیشاپوری کے سوا کسی میں نظر نہیں آیا۔

اقبال کا مطالعہ اپنے زمانہ تک کے تمام انسانی علوم پر محیط ہے۔ اسی لئے مشرق و مغرب اور ماضی و حال کی بہت سی شخصیتیں اقبال کے زیرِ تجربہ آئیں۔ یہ سارے علوم و اشخاص اقبال کے فکری و فنی مقصود کے محض وسائل ہیں۔

”یہی سبب ہے کہ اقبال کے حلقہٴ تاثر میں متنوع بلکہ متضاد شخصیتیں بڑے توازن کے ساتھ اسیر ہیں۔ چنانچہ دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح غالب سے بھی انہوں نے اسی طرح اخذ کیا ہے۔ ان کا ذہن و مزاج اردو شعراء میں سب سے زیادہ غالب کے مماثل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ غالب ہی کی طرح اقبال کا بھی اصل سرمایہٴ فکر و فن فارسی میں ہے۔ یہ واقع ہے کہ ہمارے ادب کے ان دو عظیم ترین نابغوں کے تصور و تخیل میں بنیادی طور پر بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی، اندیشہ، رفعت خیال، ندرت فکر، شوکت اسلوب، آتش لوائی، رعنائی تصور، مستی و دمدمی ظاہر ہے کہ یہ مجرد اوصاف یکے نہیں جاتے بلکہ طبعی طور پر پائے جاتے ہیں“

(پروفیسر عبدالغنی (پنڈت) ”موازنہ اقبال و غالب“)

باوجود ان تمام حقائق کے جناب شہرت بخاری کا خیال ہے کہ اقبال و غالب کا مقابلہ مشکل ہے۔ اگرچہ ان میں چند باتیں مشترک ہیں مگر وہ سطحی ہی ہیں۔ غالب محض شاعر تھا اور اسکو اقبال کی طرح دنیا کو پیغام نہیں پہنچانا تھا۔

”بڑا فرق جو اقبال اور غالب میں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ غالب جس قدر انسانی زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اقبال اس کا مشاہدہ

نہیں کر سکتا۔ اقبال کا تمام تجربہ کتابی ہے اس کی زندگی اور اسکے فلسفے میں ایک خلج حائل ہے مگر غالب زندگی کی تلخ ترین اور غلیظ ترین حقیقت کی نقاب کشائی میں جھجک نہیں پاتا۔“

(شہرت بخاری ”غالب کی فارسی شاعری“)

مثال کے طور پر غالب و اقبال کے فارسی کلام سے جنت کے متعلق ان اشعار سے دونوں کے فکروں کا موازنہ ہو جاتا ہے:-

غالب:-

و ر آں پاک میخانہ بے سروش
چہ گنجائش شورش و تائے نوش

اقبال:-

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطان ندارد

یہی شعری موازنہ ہم غالب و اقبال کے اردو کلام میں بھی کر سکتے ہیں۔ اسکے لیے موضوع تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند ایک پر اکتفا کریں گے:-

”فلسفہ جزو کل کا ذکر ہو تو غالب کے ہاں ”جز“ اپنے ”کل“ میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہے کیونکہ وہ اسی کا حصہ ہے اور اسی سے جدا کیا گیا ہے۔

قطرہ دریا میں جوٹ جائے وہ دریا ہو جائے
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
 مگر اقبال کے ہاں ”جڑ“ ”کُل“ کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔
 تو ہے محیط نیکر اس میں ہوں ذرا سی آب جو
 یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

(پروفیسر افضل حسین اظہر ”غالب و اقبال کی ہم آہنگی“)

تصوف کا موضوع غالب و اقبال دونوں کے ہاں موجود ہے۔ پہلے غالب کو لیجئے:-
 ”وحدت الوجود کے نظریے کا اثر غالب پر اتنا گہرا ہے کہ اسے کسی
 طرح رکی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کا تجربہ کرنے سے یہ ضرور پتہ
 چلتا ہے کہ غالب اس کی طرف دل کی بجائے ذہن کے راستے سے
 آئے لیکن اسے وہی طور پر قبول کرنے کے بعد انہوں نے اس سے
 جذباتی وابستگی بھی پیدا کی کیونکہ اس کے بغیر مسائل تصوف کے بیان
 میں وہ خوش نہیں پیدا ہو سکتا تھا جو مثال کے طور پر ان کے اس شعر میں
 موجود ہے:-

ہم موجد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
 ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہو گئیں

(ابو محمد عمر ”غالب کا فلسفہ“)

اور اقبال کے ہاں تصوف کا یہ رنگ ہے:-

”اقبال کی ہال جبریل کی غزلوں میں تصوف رچا ہوا ہے۔ اسی تصوف کی بدولت اقبال کی شاعری میں ایک مفکرانہ سنجیدگی اور ایک پاکیزہ تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ اقبال سے پہلے ہمارے غزل گو شعراء کے تصوف میں ایک چیز کی کمی تھی وہ یہ کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء پر تصوف کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اقبال کے متعدد اشعار واقعیت اور روحانیت کے اس احتزاج کا پیش خیمہ ہیں جس کے لیے انسانیت آج گوش برد آواز ہے۔ معرفت الہی حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہری کی ضرورت نہیں بلکہ اسی کے لیے حواس خمسہ باطنی کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے:-

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے ناتاری
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہء دل وا کرے کوئی“

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب اور اقبال کی ہم آہنگی“)

جب ہم کسی شخص کے لب و لہجہ کی بات کرتے ہیں تو اسکی شخصیت سے اسکا تعلق ضرور بنتا ہے اور شخصیت پر اس شخص کے ارد گرد کے حالات کا۔ غالب و اقبال کے شاعرانہ لب و لہجہ میں

بڑی مماثلت پائی گئی ہے۔ غالب سلا ترک تھے۔ اس لیے ترکوں کی تمام خصوصیات انکی شخصیت پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ وہ کسی کے سامنے جھک نہیں سکتے تھے۔ پر جوش تھے۔ وضعدار تھے آن رکھتے تھے۔ ان تمام خصوصیات کا اثر انکی شاعری کے لب و لہجہ میں صاف جھلکتا ہے۔ اردو میں بھی اور فارسی میں بھی۔ مگر پروفیسر یوسف زاہد کے مطابق فارسی میں ان کا یہ قاہرانہ و باغیانہ لب و لہجہ اور بھی ہندی و تیزی اور جوش و استقامت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے شاعرانہ لب و لہجہ کی بات ہے تو غالب کے کلام کا عمیق مطالعہ اور انکی اپنی حساسیت اسکے محرک بنے۔

”بہر حال غالب کے لب و لہجہ کے یہ مختلف پہلو اردو شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں جو قوت، صلابت، جوش، گری، یقین و اعتماد اور مردانہ قاہرانہ انداز ہے وہ ان کے بعد ہمیں اقبال ہی کی شاعری میں ملتا ہے۔ اور اقبال پر اس پہلو سے غالب ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں بھی ایک گہن گرج، اثبات، خود داری، دلیری اور قاہری ہے لیکن غالب کی آواز اقبال سے کچھ زیادہ باغیانہ اور قوت و جبروت کی حامل معلوم ہوتی ہے“

(پروفیسر یوسف زاہد ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

غالب و اقبال کے نظریات اور فلسفہ ہائے حیات

حقیقت یہ ہے کہ غالب محض ایک شاعر تھے۔ اور انکی شخصیت میں قوم کو کوئی پیغام دینے یا اسکے ضمیر کو سمجھوڑنے کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ حالانکہ تاریخی طور پر انہوں نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کی عملداری کی شروعات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انکی طبیعت کی شوخی اور انکی یار باشی کا جذبہ بھی انکی شخصیت کی بنت میں اہم مقام رکھتے تھے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو قوم کو پیغام دینے کے لحاظ سے ان کا کوئی نظریہ حیات یا فلسفہ حیات نہیں تھا۔ لیکن انکا اپنی ذات کی حد تک ایک نظریہ حیات ضرور تھا:-

”غالب کی شاعری کے لب و لہجہ کو ان کے نظریہ حیات نے بھی

تقویت بخشی جس کو بابر نے یوں بیان کیا ہے:- بابر بہ پیش کوش

کہ عالم دوبارہ نیست یعنی زندگی کی مسرتوں کے حصول میں پوری

کوششوں سے کام لینا (لیکن اس سے مراد بے فکری اور بے بھری

نہیں) اور یہی غالب نے کہا“

(پروفیسر یوسف ذہاب ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

اس کے برعکس اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور مسلمانان عالم کے لیے بالعموم اتحاد و یکجہتی کا پیغام لے کر اٹھے۔ وہ ایک طرف مسلمانان ہند کو انگریزوں اور

ہنود کے تسلط سے چھڑا کر انکے لیے اپنے ایک خطہ زمین کے خواب دیکھتے تھے۔ تو دوسری طرف مسلمانانِ عالم کو ایک ملت کے پلیٹ فارم پر لاکھڑا کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی روحانی تربیت کرنے کی ٹھانی اور ایسا کرنے کے لیے خودی، مرد مومن اور شاہین کا تصور پیش کیا۔ یوں انہوں نے اپنی پوری شاعری کو اس مقدس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اس مقام پر آ کر ہمیں غالب و اقبال کے کلام میں جھانک کر دونوں کی ہم آہنگی کا جائزہ لینا ہے:-

”فن کے بحیثیت فن کچھ تقاضے ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونے والے شعراء یقیناً ایک مشترک راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب اور اقبال کو بھی ایک دوسرے کے برابر لا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کی بیشتر شاعری عشقیہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا صرف ایک حصہ عشقیہ ہے اور بیشتر غزلوں کی روح تصوفانہ ہے۔ غالب کے ہاں تصوف کسی باقاعدہ رجحان کی صورت میں نہیں ہے۔ مختلف اسالیب میں کہیں کہیں منتشر مضامین ہیں اور اس سلسلے میں دونوں شعراء کو اپنے سامنے لایا جاسکتا ہے“

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب اور اقبال میں ہم آہنگی“)

مہر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش کے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا غالب

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
 تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں اقبال
 لازم نہیں کہ خطر کی ہم چھری کریں
 مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر لے غالب
 تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
 رستہ بھی ڈھونڈ خطر کا سودا بھی چھوڑ دے اقبال
 طاعت میں تار ہے نہ سے انگلیں کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو غالب
 سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
 او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے اقبال
 زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں غالب
 علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
 جو تھے چھالوں میں کانٹے لوک سوزن سے نکالے ہیں اقبال
 آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہوتے تک
 کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک غالب

گیسوائے تابدار کو اور بھی تابدار کر

ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر اقبال

اس ہم آہنگی کے باوجود غالب و اقبال کے فنی اور جذباتی افتخار بالکل جدا بھی ہو جاتے ہیں:

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا

و ماعدنی شوق تراشے ہے پنا ہیں غالب

گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقش بند

میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومات میں اقبال

بہر حال یہاں تک آ کر اب ہم یہ جان چکے ہیں کہ غالب کا زمانہ اقبال کے حالات سے مختلف تھا۔ اس لیے اقبال کے برعکس انکے پاس قوم کے لیے کوئی پیغام نہ تھا۔ دوسری طرف اقبال ایک نظریے اور قوم کے لئے ایک پیغام لے کر آ گئے بڑھے۔ غالب و اقبال کی ہم آہنگی انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اقبال نے غالب کا مطالعہ کیا اور کسی بھی دوسرے اردو شاعر سے زیادہ وہ غالب ہی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں:-

”دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی، اندیشہ،

رفعت خیال، قدرت، فکر، شوکت اسلوب، آتش توانی، رعنائی تصور،

ملتی و متحدی۔۔۔۔۔ ان کے اشتراک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال و

غالب کی ذہنی ساخت اصلاً ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ ان کے

نفس کا میلان اور مزاج کا رنگ ایک سا تھا۔ خود آگاہی، وسعت نظر،

لطافت تخیل کے سرمایہ دار دونوں تھے۔ خود سری بے باکی جدت و
 اختراع سے دونوں بہرہ ور تھے۔ ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ
 دونوں کا شعور فلسفیانہ اور ذوق عاشقانہ تھا۔ چنانچہ دونوں ”درائے
 شاعری چیزے دگر“ کے قائل ہیں اور شاید اسی ”تجہبرانہ“ احساس
 کے سبب ایک خود کو ”عندلیب گلشن نا آفریدہ“ اور دوسرا اپنے بارے
 میں ”من شاعر فرداستم“ کہتا ہے۔

(پروفیسر عبدالغنی (پٹنہ) ”موازنہ اقبال و غالب“)

خوشحال و غالب

اپنے اشعار کے آئینے میں

خوشحال و غالب جیسی عالی شخصیتوں سے قطع نظر جب دو عام شخصیتوں کا بھی موازنہ کرنا ہو تو احسن طریقہ یہی قرار پایا ہے کہ ان شخصیات کے موافق اور مخالف ہر دو پہلوؤں پر روشنی ڈال کر انکا موازنہ کیا جائے۔ اس لیے جب ہم خوشحال و غالب کے کلام کا موازنہ کرنے چلے ہیں۔ تو ان دونوں کے کلام میں فکر موافق اور فکر مخالف کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس باب میں ہم نے یہی وسیلہ اختیار کیا ہے۔ دنیا میں کوئی دو شخصیتیں بھی بالکل ایک جیسی پیدا نہیں ہوتیں۔ شخصی خصوصیات میں فرق فطری ہے۔ اور یہی اس جہان رنگ و بو کی یو قلمونی کا ثبوت ہے۔ اسلئے ہم دو شخصیتوں میں شخصی اور فنی ہر دو میلانات میں موازنہ کر کے انکی موافق اور مخالف خصوصیات کو پرکھ کر آشکارہ کرتے وقت قدرت کی شان کو اجاگر کر رہے ہوتے ہیں۔ آئیے اب خوشحال و غالب کے اشعار کی روشنی میں قدرت کے اس کمال کا جائزہ لیں۔ جہاں اس باب میں دئے گئے اشعار کے لیے دونوں شعراء کے دیوان و کلیات کی چھان بھٹک شامل ہے۔ وہاں اس ریسرچ کے دوران مجھے جناب محترم ڈاکٹر درویش خان یوسفزے کے اس مقالہ سے بہت مدد ملی جو انہوں نے خوشحال اور غالب کے عنوان سے لکھا اور پشتو سے مانی تاترہ پشاور اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھاپا

گیا۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس دشت کی سیاحی میں نوے کی دہائی سے مصروف رہے ہیں۔ بارے انکی یہ کاوش میرے بہت کام آئی۔ جس کے لیے میں انکا ممنون احسان ہوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اپنی اس موجودہ تصنیف ”موازنہ خوشحال و غالب“ کی شروعات میں نے بھی ۱۹۹۳ء میں کیں۔

تقابلی مطالعہ (ہم آہنگی فکر)

غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا

خوشحال

صورت گر چہ نہ صورت پہ دیوال ساز کہ
کل عالم نہی پہ صفت زبان دولز کا
ترجمہ:- جب مصور دیوار پر کوئی اچھی تصویر بناتا
ہے۔ تو لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

نوٹ:- قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ خوشحال کا یہ شعر ان کی اس پہلی غزل کا پہلا شعر ہے جو منتخبات خوشحال خان خٹک میں چھاپی گئی۔ ادھر غالب کا مندرجہ شعر بھی اگلے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہے۔

پہ درون کنبی مہی براتہ دی دہر گنجونہ
 پہ معنی کنبی لکہ کان د سیم وزویم
 ترجمہ: میرے درون میں بہت بڑے گنج
 (خزانے) چھپے ہوئے ہیں۔ (اسلئے) معنی
 کے لحاظ سے میں سم و زر کی ایک کان ہوں۔

گنجینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کو غالب مرے اشعار میں آدے

دا عالم لکہ طفلان ورتہ بیکار مہری
 د طفلانو پہ بلزی پوری خندا کما
 ترجمہ: - عارف کو یہ دنیا بچوں کا ایک تماشا نظر
 آتی ہے۔ جس پر وہ ہنستا ہے۔

باز بچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پلار نیکہ مہی شہیدان و گور نہ تللی
 پشت پہ پشت مے ہنر دادے آل پہ آل
 ترجمہ: - میرے باپ دادا سب شہید ہوئے
 ہیں۔ میری کئی پشتوں سے بڑوں اور چھوٹوں
 سب میں یہ کمال پایا گیا ہے۔

سو پشت سے ہے پشتِ آبا سپہ گری
 کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

دالھام غنڈی خبروی چھی راندرومی
 چھی زما پہ زرة نزول کمال ایزال
 ترجمہ:- اک بات ہوتی ہے کہ جسے خدائے
 پاک بالکل الھام کی طرح میرے دل میں
 اتارتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالب سریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لہ دی خاورونہ چھی گل رہی خوشحالہ
 دا پہ دا چھی تل ور درومی ماہ جبینہ
 ترجمہ:- اے خوشحال اس مٹی سے یہ جو
 پھول نکلتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ بڑی مرغبین
 حسینائیں اس کے تلمہ دیتی رہی ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پنہاں ہو گئیں

چھی یو زمان لہ سترگو جدا کیہی
 د خوشحال پہ منخ داوہنکو شی رودون
 ترجمہ:- جب محبوب ایک لمحے کے لیے بھی
 خوشحال سے جدا ہوتا ہے تو خوشحال کے
 چہرے پر آنسوؤں کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔

غالب ہمیں نہ چہیز کہ پھر جوشِ انگ سے
 بیٹھے ہیں ہم جہی طوقاں کئے ہوئے

ددی کلی طیبیان وارہ ناترس دی
د دارو پہ طمع مہ اوسہ بیعار
کہیں حقیقت جانکا ہی مرض لکھیے
کہیں مصیبت نامازی دوا کیے
ترجمہ:- اے بیمار ووا کی امید میں نہ رہ کہ
اس گاؤں کے تمام طیب ناترس ہیں۔

ہیخ حجت لہ ہیچا مہ گوہ خوشحالہ
ہر چہ تاوتہ شوک وانی تہ ہفہ
کہیں حجت نہ کیا
کہیں حجت نہ کیا
ترجمہ:- اے خوشحال تو کسی سے کچھ حجت نہ کیا
کر۔ تم وہی ہو جو لوگ کہتے ہیں۔

د صبا بادہ گذر پہ چمن بیبا کرہ
پہ چمن کنسی رنگارنگ گلونہ واکرہ
ہاں نشاط آمد فصل بہاری دلو دلو
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلگوانی مجھے
ترجمہ:- اے باد صبا تو پھر چمن پر گذر کر۔ اور
چمن میں رنگارنگ پھولوں کو داکر۔

چھٹی سوئے سوئے وہ مالکہ بادشاہ ووم
 ہمانی وہ ستاد تور و زلفو سیور
 ترجمہ:- جب تک مجھ پر تیری کالی زلفوں کا
 سایہ رہا تو میں بادشاہ کی مانند تھا۔ کیونکہ تیری
 کالی زلفوں کا سایہ ہمہ گیر تھا۔

د صبا پہ باد نشاط وی د مغلونو
 کہ جنبش کا د بلبل لہ شور و شرہ
 ترجمہ:- پھولوں کو باد صبا سے نشاط ملتی ہے۔ یا
 یہ پھول بلبل کے شور سے جنبش میں آتے
 ہیں۔

خدا یہ ہر مرہ ژوندون ورکړہ بہ جہان کنہی
 چھٹی کلاوہ کلرونہ سم کاندی خوشحال
 ترجمہ:- اے خدا تو خوشحال کو اتنی عمر دے کہ
 وہ اپنے پیچیدہ کاموں کو پایہ اختتام تک
 پہنچا سکے۔

د تقویٰ پہ کاروبار نہ خبرداریم

ولہی خدہ کرم چہ نصیب مہی گمراہی شوہ

ترجمہ:- میں تقویٰ کے کاروبار کا بخوبی علم رکھتا

ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں

گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

چہی نہ زہ ترکانہی سخت دے ہری مین شوم

لاس دی نہ شہی دسری ترکانہی لاندہی

ترجمہ:- میں ایک سنگدل پر عاشق ہوا ہوں۔ کسی کا

دست نہ سنگ آدہ بیان وفا ہے

ہاتھ پتھر کے نیچے نہ آئے۔

دا اوپدہ اوپدہ غمونہ پریشانی

چہی زما دی دانی خوی راغی دغنیو

ترجمہ:- میرے لیے غم اور پریشانی اسکی

میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

زلفوں کی دین ہے۔

زاهدان چہی مونخ روزہ کا جنت غواری
 ہا خوشحال د مزدوریہ طاعت نہ زدہ
 ترجمہ :- یہ جو زاہد نماز روزے کے بدلے
 جنت کے خواہاں ہیں مجھے اس قسم کی مزدوری
 اور اطاعت نہیں آتی۔

خوشحال کہہ نہ دے نصیحت خوشی خوار مد کرہ
 الہام دے چہ نہی وانی دا کلام پد افغانی
 ترجمہ :- گو کہ خوشحال نمی نہیں ہے مگر انکی نصیحت کو تو مان۔
 کہ وہ پشتو زبان میں جو کلام کہہ رہا ہے وہ الہام کا درجہ
 رکھتا ہے۔

د ساقی د میو ہسی شان اثر و
 پہ خمار کنبی مہی دستار د سرہ خپور شو
 ترجمہ :- ساقی کی شراب میں کچھ ایسا سرور تھا کہ
 خمار کی وجہ سے میرے سر سے دستار کھٹک کر نکھر
 گئی۔

نسر پہ کوم لوری پر یوزی کوم خوا خیزی
 پہ خوشحال باندی یوہ شوہ تورہ سپینہ
 ترجمہ:- سورج کس اوڑ غروب ہوتا ہے اور کس
 طرف سے نکلتا ہے خوشحال کو کچھ نہیں دکھتا
 کیونکہ اس کے لیے سیاہ و سفید ایک ہو گئے
 ہیں۔

خنجر سے چیر سیز اگر دل نہ ہو دو غم
 دل میں چھری چھوڑا گر خوشچکاں نہیں

زہ چھ خود دبتکلی مخ دھینپ نہ وی
 پکھنپ مات شد د نیرۂ توبری سغال
 ترجمہ:- جو دل خوبصورت چہرے کا عاشق نہ ہوا
 اس میں تیز دھار تیر کی نوک کے نکلے پیچیں۔

ترے جواہر طرف لکھ کو کیا دیکھیں
 ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

پہ کالیو سرہ مخ بنائستہ کیپی
 ستا پہ مخ بنائستہ ستاد مخ کالی دی
 ترجمہ:- زیورات تو چہرے کو خوبصورتی بخشتے
 ہیں مگر تیرے چہرے پر زیورات کی خوبصورتی
 تیرے چہرے کی وجہ سے ہے۔

کہ سنا کو خدہ جنت سرہ شوک سہہ راتہ گنہ پندی
 کو خدہ بہ دی وطن کرم کہ دا عیب وی ہم دی وی
 ترجمہ :- اگر کوئی میرے سامنے تیرا کوچہ جنت کے
 مقابلے میں رکھ دے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن
 جانوں گا۔ اگر ایسا کرنا عیب ہے تو یوں ہی سہی۔

چہی بلاتہی دقامت راتہ ہنکارہ شوہ
 گویہ پاخیدہ بلاد قیامت
 ترجمہ :- جب میں نے اسکے قد کی بلا کو
 دیکھا۔ تو گویا قیامت کی بلا جاگ اٹھی۔

چہی دی سپین بارخو کبود کرم بہ چہی جلو
 اوس نہی نہ گنہی حالہ بہ مہی گنہی
 ان پری زادوں سے لیں گے غلہ میں ہم انجام
 قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
 ترجمہ :- تم مجھے اب تو نہیں مانتی۔ مگر وہاں
 (غلہ میں) مجھے مان جاؤ گی۔ جب میں
 تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر
 سرخ کر دوں گا۔

وہاں نہی تہول زما پہ غارہ

فستونے د عقل دہ خو چہ بدان و ذنب اسدِ بیل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
ترجمہ:- عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ تم جتنے مذہبی ہو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر
لوگوں کو مار سکو۔ اس کا سارا وہاں میری گردن

پہ۔

ذری تہ چہی ہسی بریشی منورہ

کہ خبر نہی دابرینا دی دہ د نعرہ ہے تجلی تری سامانِ وجود
ترجمہ:- اے ذرے یہ جو تجھ سے روشنی چمکتی ہے
اگر تم جانو تو یہ سورج کی روشنی ہے۔

ساقی نن زما پہ دور جام گردان کرہ

گھورہ گماندہ بہ د چا دور گردان شی کون ہوتا ہے حریف مئے مردانگنِ عشق
ترجمہ:- ساقی آج تم میرے نام سے جام
کا دور چلاؤ۔ کیا جانے آئندہ کس کے نام
کا جام چلے۔

چہ شونہی کیہ دی د جام پہ مورگو
اویسہ پہ جام کنہی رُب انار کھری
ترجمہ:- جب وہ اپنے لال ہونٹ جام کے
کنارے پر رکھتی ہے۔ تو جام کا پانی انار
رنگ ہو جاتا ہے۔

خوار خوشحال پہ مرگی حال دیہ غنکدن کا
راشہ گورہ پہ ایعان دلیدو سنا مری
ترجمہ:- بے چارہ خوشحال قریب المرگ ہے اور
نزع کی حالت میں ہے آؤ دیکھو ایمان سے
تمہیں دیکھنے کے لیے مر رہا ہے۔

ہم دی ووزلم پخبلہ ہم بیا گورہ
بیا پہ ما باندی تہر وہی ماتم کا
ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا اور پھر
سینہ کو پی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم
کر رہے ہو۔

یہ زہر مہی ہستی نال نہی ایسے لہ دوہ سترگو غنائیہ

کہہ ملکہ نامہ اخلہ نوم مہی ستاراشی پہ زہ

ترجمہ:- اے میری آنکھوں سے جو جمل محبوب تم
میرے دل میں اس طرح سے سرایت کر گئے ہو۔
کہ اگر میں کوئی اور نام پکارتا چاہوں تو بھی میری

زبان پر حیرانی نام آ جاتا ہے۔

تل دتن ہلیونہ راولوکارم پہ نوکونو

غم نہی دناوک خورم حیرہی مات نہ شی پیکان

ترجمہ:- اس ڈر سے کہ کہیں اس کے تیر کی نوک (میرے
دھم میں) ٹوٹ نہ جائے میں اپنے تن کی ہڈیاں اٹکیوں
کی بجائے ناشتوں کی مدد سے نکالتا ہوں۔

کلہ کلہ ہستی وخت پہ سہری راشی

چہی دگلونو پہ کتل نہ وی محفوظ

ترجمہ:- انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی
آتا ہے کہ وہ پھولوں کے دیکھنے سے محفوظ
نہیں ہوتا۔

مہت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ سوج ہوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ہر شے پہ منہ کھنسی نیستہ پہ خالی دوکان غوغا دہ
 سا چہی فکرو و کھرو وارہ و ہم خوب و خیال دے
 ترجمہ:- یہ دنیا ایک ایسی خالی دوکان کی مانند ہے
 جس میں کوئی چیز موجود نہ ہو۔ جب میں نے اس
 نکتے پر سوچا تو کھلا کہ یہ سب کچھ خواب و خیال ہے۔

پہ بیمار و سترگو تل پھی کیہوے شی
 د خوشحال پہ لیمو پیہ کیہدہ گستاخ
 ترجمہ:- بیمار آنکھوں پر ہمیشہ روئی کے پاشے
 رکھے جاتے ہیں۔ اے گستاخ تو بھی خوشحال کی
 (بیمار) آنکھوں پر اپنے پاؤں رکھ دے۔

د لیجن پہ سترگو و خلیل دل ستوری
 و عالم و تہ نہی چغی کمری چہی نعر دے
 ترجمہ:- دیکھتی آنکھوں والے پر ستارے روشن
 ہوئے تو زور زور سے لوگوں کو بلا کر چیخا کہ سورج
 نکل آیا ہے۔

د منت دارو کہ سرم پکار می نہ دی
کہ علاج لہرہ می راشی مسیحا ہم
ترجمہ:- مجھے اپنی بیماری کے لیے منت کی دوا
قبول نہیں چاہیے میرے علاج کے لیے حضرت
عیسیٰ بذات خود تشریف کیوں نہ لے آئیں۔

ورو منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا نہ اندھا ہوا

ما خوشحال وتہ پہ زورہ ناری لوکری
چلو ماؤ تہ وتیل چہ خوشحال نشہ
ترجمہ:- میں نے خوشحال کو نعرے لگا کر بلایا
کیونکہ کسی نے مجھے بتایا کہ خوشحال کہیں کھو گیا
ہے نظر نہیں آتا۔

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفۃ سر ملے

دیہری مینی د خوشحال عقل خراب کرو
لکہ نور کلہ ہونیار وو ہسی نہ دے
ترجمہ:- عشق کی زیادتی نے خوشحال کی عقل مار
دی ہے۔ وہ پہلے کی طرح ہوشیار نہیں رہا۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نندارچی چپی ورتہ گوری حیرانی پی
بازیگر چپی پہ بازیو کنسی بلا کا
ترجمہ:- جب بازیگر اپنے کرتب دکھاتے ہیں تو
دیکھنے والا قشاش بین حیران رہ جاتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

ہمیشہ بہ پہ ہند نہ اوسی خوشحالہ
عاقبت بہ عاصی ووزی لہ جحیم
ترجمہ:- اے خوشحال تم ہمیشہ ہندوستان میں
(قید) نہیں رہو گے۔ انجام کار گنہگار روزِ رخ
سے نکل جائے گا۔

بیضہ آسانک بال و پر ہے یہ کج قص
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

د دانش مار غٹھی ہو مرہ پور تہ لارو
چپی ہو ری د کتہہ بازو پرواز نیشہ
ترجمہ:- میری دانش کا پردہ اتنی اونچائی اور رفعت
تک پہنچ گیا ہے کہ جہاں جیم اور تومند بازو کی
اڑان نہیں پہنچ سکتی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل ہار ہا
میری آہ آتھیں سے بال عطا جل گیا

زہ خوشحال کہ لتا غوارم مستحق یم
خولہ زکواۃ را کہرہ د حسن لہ نصاب
ترجمہ:- حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسرا ز
راہ زکواۃ دے دے کہ میں خوشحال اس کا مستحق
ہوں۔

چی نہ مٹی نہ معشوقہ نہ گشت د گلو
دغہ عمر دے د غم او غرامت
ترجمہ:- نہ شراب ہو۔ نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں
کی سیر ہو تو یہی عمر غم اور تادان کی ہے۔

کار ز ما او د مجنون سرہ پورنگ دے
لکہ دودہ لہر مٹی پہ اور کینسی سر پہ سر
ترجمہ:- میرا اور مجنون کا کام ایک ہی طرح کا
ہے۔ جیسے آگ میں جلتی ہوئی ساتھ ساتھ رکھی
ہوئی دو کڑیاں۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے
کہ بھٹوں لام الف گھستا تھا دیوار دیستان پر

راز نہی ولیٰ نیکارہ وہ بنہ چہی پہ دار شو

د منصور سزا نسر دا وہ لا بترہ
ترجمہ:- منصور نے راز کی بات کیوں کھولی۔
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا یکن
ہم کو تقلید تک عرفی منصور نہیں
اچھا ہوا کہ اسے دار پر چڑھایا گیا۔ بلکہ اسکی سزا
تو اس سے بھی بدتر ہونی چاہیے تھی۔

د زاہد پہ صومعہ کبھی می زہ تنگ شو

لہ دی پسی بہ خدمت د می فروش کرم
ترجمہ:- زاہد کی صحبت سے میرا دل بے زار ہو گیا
کعب میں جا بھائیں گے باقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
ہے۔ اس کے بعد میں اب (کسی) سے فروش کی
خدمت کروں گا۔

پہ ہر مخ کبھی نندارہ د ہفہ مخ کرم

چہی د دیر پیدایی نا پدید شہ
ترجمہ:- میں ہر چیز میں اسی ایک رخ زیبا کا
ظاہر کرتا ہوں۔ جو کثرت شہود کی وجہ سے
جیکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ خدا کیا ہے
نامشہور ہو گیا ہے۔

ہر نشہ چہی د وحدت پہ سیند سیراب شہ

نور ہمہ جہان ودہ وتہ سراب شہ ہستی کے مت فریب میں آجائو اسد

ترجمہ:- جو یہاں ایک دفعہ دریائے وحدت سے عالم تمام حلقہٴ دام خیال ہے

سیراب ہو جائے۔ تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں

سراب بن جاتی ہے۔

نورِ خوک نشہ لاندی باندی

وارہ دے دے چہی شہ کاندی ہر چند ہر شے میں تو ہے

ترجمہ:- اس (خدا) کے سوا کوئی بھی موجود پر تجھ ہی کوئی شے نہیں ہے

نہیں۔ تم کچھ بھی کرو۔ وہ سب کچھ ہے اور ہر

جگہ ہے۔

ہائے توبہ د عشق د پتو سرو لمبو نہ

نہ نہی تاؤ شتہ نہ نہی لوگے لگی پہ تا دل مرا سوز نہاں سے بے محابہ جل گیا

ترجمہ:- ہائے توبہ عشق کے مخفی سرخ شعلوں آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

سے کہ نہ تو ان کی تپش اور نہ ہی ان کا دھواں تھے

مخسوس ہوتا ہے۔

پسری را غلہ زبون شوم کہ شہ نور شد علالت شو
 چہ زہ کرم ہفتہ نہ شی ہفتہ ملک ہفتہ عالم دیے
 ترجمہ:- بڑھاپے نے مجھے زخمی و بے حال کر دیا ہے
 - یا یہ کوئی اور بیماری ہے کہ جو میں چاہتا ہوں - ویسا
 نہیں ہوتا حالانکہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ ہیں -

چہ ہریار نہ می تر خولہ ویومست آواز
 ز رہہ وارہ عالم خورشو ہفتہ راز
 ترجمہ:- میں نے جس بھی ووست کو اپنی کوئی
 بات بتائی تو بہت جلد پوری دنیا میں میرے اس
 راز کا چہ چاہو نے لگا۔

چہ لہ ہسی محبوبا خوشحال جدا تو
 د آتش لعبی نہ دور می لہ بسترا
 کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
 کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے
 ترجمہ:- جب سے خوشحال اپنی محبوبہ سے
 جدا ہوا ہے - اسکے بستر سے آگ کے شعلے
 نکل رہے ہیں۔

خوک چو ستر گھن غم روی لہ ہفتی وارو
 مہاپہ ہتھو ستر گھو ہنہ ننداری اوکری
 ترجمہ :- لوگ کئی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتے
 ہیں میں نے بند آنکھوں سے اُن چیزوں کا
 خوب خوب نگارا کیا۔

کلہ ناز کلہ کنخل کری کلہ مہر
 د خوشحالہ مروہ کہ پخلانی
 ترجمہ :- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے
 کس قدر ناراض ہو کہ کبھی باز دکھاتی ہو کبھی
 گالی دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

وی نہی در بہ کرم بوسہ دنرو شونندو
 رانزدی شوہ رانزدی خورانی نہ کرہ
 ترجمہ :- محبوبہ نے مجھ سے کہا کہ تمہیں
 اپنے چلے ہونٹوں کا بوسہ دیتی ہوں۔ وہ
 میرے نزدیک آئی اور نزدیک آئی مگر
 بوسہ نہ دیا۔

غنیہ نا گفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
 بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کر یوں

اپنے چلے ہونٹوں کا بوسہ دیتی ہوں۔ وہ
 میرے نزدیک آئی اور نزدیک آئی مگر

بوسہ نہ دیا۔

عاشقی کہ سراسر وارہ بلا دہ
 ما پہ خان او زرہ قبولہ دا بلا کرہ
 ترجمہ:- گو کہ عاشقی سر تا پا ایک بلا ہے۔
 مگر میں نے دل و جان سے اس بلا کو قبول
 کیا۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
 درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دا نین شبہ چہ بہ خوشحال د فراق را غلہ
 وردی نہ شی ہسی سختہ بہ دشمن شبہ
 ترجمہ:- یہ جو آج خوشحال پر شب فراق آئی
 ہے۔ ایسی سخت رات خدا دشمن پر بھی نہ
 لائے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غمِ بڑی بلا ہے
 مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

گورہ کوم لوری تہ لازو موندہ نشی
 د خوشحال د زرہ پیدا چرتہ سراغ کرہ
 ترجمہ:- دیکھنا کہاں چلا گیا ہے۔ کہیں مل نہیں
 رہا۔ ذرا خوشحال کے دل کا سراغ تو لگاؤ۔

کہتے ہوتے ویں گے ہم دل اگر پڑا پایا
 دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مدعا پایا

ستا د زلفو پہ تور تم کنیسی مہ زہر ورک شو
 چہ نہ بیسا موسم ہنکارہ د مخ چراغ کمرہ
 ترجمہ:- میرا دل تیری زلفوں کے اندھیرے میں
 کہیں گم ہو گیا ہے۔ ذرا اپنے رخ کا چراغ دکھاؤ
 کہ میں اپنا دل ڈھونڈ سکوں۔

ہور ہا ہے جہاں میں اندھیرا
 زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے

ہر چہ نین د محبت پہ اور وراثہ شو
 غمہ پرواہ لیری د اورہ د دوزخ
 ترجمہ:- ہر کوئی جو محبت کی آگ میں جل
 چکا ہو۔ اسے دوزخ کی آگ کی کیا پرواہ۔

آتش دوزخ میں یہ گری کہاں
 سوز غمہائے نہانی اور ہے

ولہی لیچی بریندہنی سورہ اوکارہی
 کہہ د خوارو د کشتن پہ آہنگ نہ دہ
 ترجمہ:- کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے
 کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ کیوں اپنی بائیں نگلی
 کر کے (میان سے) تگوار نکال رہی ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غنجنی گل جی ستاد مخ سرہ سیالی کا
خولہ نہی باد پہ طعنا چہ کمرہ فراخہ
ترجمہ:- جس غنچہ گل نے ترے رخِ زیبا
کی برابری کا دعویٰ کیا - ہوا نے ایک
طمانچہ مار کر اس کا منہ کھول دیا۔

وہ گل جس گستاخ میں جلوہ فرمائی کرے غالب
پکنا غنچہ و گل کا صدائے خندا دل ہے

کہ ہر خو نہی پہ سور اور کینہی لولہ کبری
دیا قوت داوسو دار دگداز نشہ
ترجمہ:- ہر چند کہ تم یا قوت کو آگ کے سرخ
شعلوں میں پھینک دو - اسے نقصان کا کوئی
اندیشہ نہیں۔

حیران ہوں شوخی رگ یا قوت دیکھ کر
یاں ہے کہ محبت خس آتش برابر ہے

مغنی پہ جغانہ دی لیندہ کیردہ
پہ نغمو پہ پردو و غواہ ہر تار
ترجمہ:- اے مغنی اپنا ساز سنجال اور
اسکے ہر تار سے (فغا میں) نئے نکھیر
دے۔

دھوڑے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

پہ اختر بہ جمعہ خہ غرض زما
 زہ مجنون ہم سرنیولے پہ صحرا
 ترجمہ:- مجھے عید اور جمعہ سے کیا غرض
 میں تو صحرا میں سرکپڑ کر بیٹھا ہوا مجنون
 ہوں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
 بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

تسرا ترسریا کہ فہم اوکری
 پہ خلور کنجہ غوغا د محبت دہ
 ترجمہ:- اگر غور کرو تو بلندی اور پاتال تک
 چاروں سمت محبت کا غوغا ہے۔

رونی ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

لہر د مہر د وفا خوبونہ زدہ کمرہ
 د جفا خوبونہ دہر درخخہ شتہ
 ترجمہ:- ذرا مہر و وفا کی عادت بھی ڈال
 ۔ مانا کہ تیرے پاس جفا کی عادتیں وافر
 مقدار میں موجود ہیں۔

کبھی۔ کبھی بھی اس کے جی میں گرتا جائے ہے مجھ سے
 جفا نہیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

گل چپ سنا پہ لاسو درغے نازہ شو
لاس دی لا شرف لری دگل تر شاخ
ترجمہ:- پھول جب تیرے ہاتھوں میں آیا تو
تردنازہ ہو گیا۔ تیرے ہاتھ شاخ گل سے
زیادہ شرف رکھتے ہیں۔

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

جاہل سرہ گلگشت لکہ دوزخ دی
لہ دانا سرہ راضی ہم کنیں مہی بند کا
ترجمہ:- جاہل کے ساتھ چمن میں جانا دوزخ
کے برابر ہے۔ (مگر) دانا کے ساتھ مجھے جلد
میں بھی اکٹھا بند ہو جانا منظور ہے۔

قائدہ کیا سوچ آخر تو بھی ہے دانا اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

غم نہی نہ دے پیدا کہی ہے بی حکمتہ
دنا مرد او مرد تر مینخہ غم محک دے
ترجمہ:- خدائے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں
کیا۔ غم مرد اور نامرد میں تیز کرنے کی کوئی ہے۔

غم آغوش بلا میں پردش دیتا ہے عاشق کو
چراغ روشن اپنا قلم صرصر کا مر جاں ہے

محنت سب چہ پہ احدا دود مستانو

د رندانو سرہ کینیناست بادہ خورشو

ترجمہ:- جو محنت مستانوں کا دشمن تھا۔ وہ

شرابیوں کی صحبت میں رہ کر مے خور بن گیا۔

گلزار تہ را غلہ گلونہ چونی

تر مخ نہ دی لالہ مخ رونہی

جہی کورتہ درومی لہ گلستانہ

گل نہی لمن نیسی لالہ لستونی

ترجمہ:- وہ حینہ گلزار میں آئی اور پھول

چن رہی ہے لالہ کے پھول اسکے چہرے

کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ جب وہ گلستاں

سے گھر واپس لوٹنا چاہتی ہے تو پھول

اسکے دامن اور لالہ اسکی آتسین سے لپٹ

جاتے ہیں کہ ہم سے جدا مت ہو۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرود صنوبر

تو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے

جنت ٹھانے د پر ہیز گار و دے خوش حالہ

لہ جنت وتہ ہوس پہ کوم عمل کری
ترجمہ:- اے خوشحال جنت تو پر ہیز گاروں کی جگہ
ہے۔ تم جنت کی خواہش کس عمل کی بنیاد پر کر رہے

ہو۔

کہ درست باغ د مٹیو دک و مائہ کیہ دی

ترجمہ:- اگر شراب سے بھرا ہوا پورا باغ بھی
میرے سامنے رکھ دو تو یہ میری ہمت کے سامنے
ایک بچکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

د خوش حال قدر کہ اوس پہ ہیجا نشہ

پس د مرگ بہ نہی یاد کا دہر عالم
ترجمہ:- گو کہ اس وقت خوشحال کی قدر کسی کو
نہیں لیکن موت کے بعد اسے دنیا بہت یاد
کرے گی۔

ہیں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ د قدح و کوزہ و سیو کیا ہے

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیعت اول خریدہ ہوں

ماوے زہ بہ نہی عمل سرہ نسبت کرم
 د دشنام نہی پہ ہل پسر دے نلنڈ
 ترجمہ:- میں نے سوچا کہ انہیں شہد سے
 نسبت دوں کیونکہ انکی گالیوں میں ایک عجیب
 طرح کی لذت ہے۔

کتھے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
 گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

د ہانسرے تورہ نہی خہ تورہ پر بیاسی
 چہی پہ زہ نہی یو گنڈاروی سل ہر ہار
 ترجمہ:- اسکے شکوے کی تکرار کیسے کیسے وار کرتی
 ہے۔ کہ دل پر چلتی تو ایک بار ہے مگر سو زخم چھوڑ
 جاتی ہے۔

ہ نیم غمزہ ادا کر حق و دیعت ناز
 نیام پردہ زخم جگر سے نگر بھیج

د گنڈار گلو نہ خہ دی راشہ گورہ
 لہ گلو نو خاستہ دواہ رخسار
 ترجمہ:- اگر یہ دیکھنا ہو کہ گنڈار کے پھول کیسے
 ہوتے ہیں تو آؤ میرے یار کے دونوں رخسار
 دیکھو کہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آئے اسد
 جو شش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

حوار خوشحال نہی لکھ جس سی لاہو کرو

جسی د عشق سیلاب را اوخوت لہر لہر

ترجمہ:- جب عشق کا سیلاب لہر لہر اٹھا تو بے

چارے خوشحال کو خس کی طرح بہا کرے گیا۔

میں نے روکا رات غالب کو اگر نہ دیکھتے

اس کے سیل گر یہ میں گردوں کعب سیلاب تھا

○

فکرِ مخالف

خوشحال

غالب

جہی مہی خپل مین نیولے تر آغوش دے
د جہان ہوس مہی وارہ فراموش دے
ترجمہ میں نے جو اپنے محبوب کو آغوش میں لیا
ہوا ہے تو ایسی حالت میں میں نے تمام دنیا کی
ہوس کو فراموش کر دیا ہے۔

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن بکلیہ

کہ مہی شعر و شاعری سرگندولے
ماہ بہ ماہ کہے د خپل بادشاہ صفت وو
ترجمہ:- اگر میں نے اپنی شعر و شاعری چکانی
ہوتی تو میں اپنے بادشاہ کی خوب خوب تر لیں
کرتا۔

غالب و لطیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

خلقتہ زہ دتوروزلفو لیونے یم

لامی بنہ بہ زنجیرونو و تہنی

ترجمہ :- اے لوگو میں سیاہ زلفوں کا

دیوانہ ہوں۔ مجھے زنجیروں سے اور بھی

کس کر باندھو۔

قید میں تھی ترے وحشی کو ہی زلف کی یاد

ہاں کچھ اک رنج گراں باری زنجیر بھی تھا

زمازیہ پہ دا دامن دے

غیم بنادی دوارہ تیر سہی

ترجمہ :- میرا دل اس لئے حوصلہ مند

ہے کہ غم اور خوشی دونوں گذر جاتے

ہیں۔

ہجوم غم سے یاں تک سرگونی مجھ کو حاصل ہے

کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

دوارہ شوئی دی خوبی شکر یاری دی

دگلابو گل دی دوارہ رخساری دی

ترجمہ :- اے محبوب! تیرے دونوں ہونٹ

شیرین شکر پارے ہیں۔ اور تیرے دونوں

رخسار گلاب کے پھول ہیں۔

پہچت رسوائی انداز استغنائے حسن

دست مرہون حنا رخسار رکن غارہ تھا

تہ محبوبا کہ شیرینہ ددی وخت نہی

زہ خوشحال داوسنی دور کو ہکن ہم

ترجمہ:- اگر تم اس وقت کی محبوبہ اور شیریں ہو

تو میں خوشحال موجودہ دور کا کوئیکن ہوں۔

تیجے بغیر مر نہ سکا کوئیکن اسد

سرکشہ، شمار رسوم و قیود تھا

زہ فرہاد دزمانی ہم

تہ شیرینہ ددی دور

ترجمہ:- میں اس زمانے کا فرہاد

ہوں۔ اور تم اس دور کی شیریں ہو۔

عشق و مزدوری عشرت مجھے خسرو کیا خوب

ہم کو منظور نکو نامی فرہاد نہیں

ددی دوز شیبخان دہر دی لور پہ لور
 اور نگز سب بادشاہ دوار و دیے رنخور
 پہ ہفتہ چارہ قلم ساز کہہ قرآن کنہی
 پہ ہفتہ چارہ شہ رنگ پر یکا دوزور
 ترجمہ:- اس دور میں ہر جاشیوخ بیمار زیادہ تعداد
 میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا
 شیخ خود اور نگز سب بادشاہ ہے۔ وہ جس چھری سے
 قرآن پاک لکھنے کے لیے قلم تراشتا ہے۔ اسی
 چھری سے اپنے بھائی کی شرگ بھی کاٹا ہے۔

غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
 دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

چہ خوشحال خنک نہ والی بہ پینسو زبہ خبری
 بہ فلوسی زبہ نہ وی کہہ یو ہیہ بی سخن ہسی
 ترجمہ:- اگر تو سمجھے تو خوشحال خنک پشتو زبان میں
 جو کچھ کہتا ہے وہ فارسی زبان میں کہاں۔

فارسی میں تا پہ جی نقشہائے رنگ رنگ
 بگوراز مجموعہ اردو کہے رنگ من است

خٹہ سختی لری خوشحالہ

دادی زرہ دے کہہ فولاد
 ترجمہ:- اے خوشحال تم کتنے سخت
 میں ہوں اور افسروگی کی آرزو غالب کہ دل
 دیکھ کر طرز چاک اہل دنیا جل گیا
 جان ہو۔ یہ تمہارا دل ہے کہ فولاد۔

د جہان غموندہ وارہ پکنبی خائے شو
شکر نا چہ نہی لونہی زہہ را کہو و ماہم
ترجمہ:- دنیا کے تمام غم اس میں سما گئے ہیں۔
شکر ہے کہ خدا نے مجھے بڑا دل عطا کیا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

چہ پہ نوم بنی آدم دی
پہ لا تقنطوا تکیہ دہ
ترجمہ:- تمام بنی آدم کا ناامید نہ
ہونے پر تکیہ ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید یہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

د بنادی پہ امید تہ اوسہ پہ غم کنبی
تل پہ شپہ ہسی رادرومی وزخ پیوستہ
ترجمہ:- غم کے دوران خوشی کی امید میں رہو۔
کدرات کے بعد ہمیشہ دن آتا ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ترجمہ:- "میں نے خوشحال کے دل کا
خوب تماشا کیا جو سمندر (۱) کی طرح
آگ کے شعلوں میں کھیلتا ہے"

ستا دڑی د سر دہر منت وایاندی
چھی نایم نہی راہر خیر دے تلذذ
ترجمہ:- تو نے جو مجھے اپنی زبان کا
بوسہ دیا ہے۔ اسکی لذت ہر دم ظاہر
ہوتی رہتی ہے۔

(۱) ایک کیزہ آگ میں بھی زندہ رہتا ہے۔ اور راکھ میں رہتا ہے۔

باب سوّم

تنقید

خوشحال وغالب کے چند اہم محققین و نقاد

خوشحال و غالب کے چند اہم محققین و نقاد

غالب کے چند اہم محققین و نقاد

یوں تو غالب نے اردو میں کم و بیش پانچ ہزار اشعار کہے تھے۔ لیکن ان میں سے صرف اشعارہ سو کے قریب اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب چھاپ گیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن بیکانٹ چھانٹ غالب نے کی تھی۔ اور اسی لیے غالب خود اپنے پہلے نقاد ٹھہرے:-

”اگر تنقید و تحقیق کی ان دو دنیاؤں کو یکجا کیا جائے اور نقاد غالب کے

تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر کے کلام انتخاب کلام اور معیار کلام کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہوگی۔

نقاد غالب وہ ہے جو قہقہے سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ خسرو کے سوا

ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور

بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور

مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جموم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پر

ٹاٹا کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے دیوان کے متعدد بہ

جیسے پر خط فتح کھینچ دیتا ہے۔ شاعر غالب وہ ہے جو مذاق شعر کا اس
درجہ قدر دان ہے کہ شیفتر کی داد اس کے لیے حاصل کلام ہے اور فضل
حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلم۔

(ڈاکٹر محمد حسن ”غالب کے چند اہم نقاد“)

بعض دوسرے مخصوص حالات میں غالب کو اس وقت دوسروں کی تنقید کا نشانہ بننا
پڑا جب وہ (غالب) ان دوسروں کی اوپی کاوشوں کے ناقد بنے۔ اس سلسلہ میں جو واقعہ
بہت مشہور ہوا اسکی روداد پیش ہے۔ ایک دفعہ اپنی فارسی دانئی کی بناء پر غالب کو کسی دوسرے
مصنف کی تصنیف پر تنقید کے نتیجے میں عدالت تک جانا پڑا۔ ہوائیوں کہ جب غالب عدر
کے زمانہ میں غفلت نہیں ہوئے تو ایسے میں کتب جنی علی میں وقت گزارتے تھے۔

اتفاق سے فارسی کی مشہور لغت ”برہان قاطع“ پر غالب کی توجہ ہوئی۔ اور اس
لغت میں ہزار باغلاط پائیں۔ ہزار ہا بیان لغو نظر آئے اور عبارت کو پوچھ پایا۔ پھر کیا تھا سو
دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا اور ”قاطع برہان“ کے نام سے ۱۸۶۲ء میں چھپوا
دیا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ علمی دنیا میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ کتابیں ”قاطع
برہان“ کی موافقت میں اور کچھ مخالفت میں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں مولوی امین الدین کا
رسالہ ”قاطع القاطع“ (جو قاطع برہان کی مخالفت میں لکھا گیا تھا) گالیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تب غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ مولوی امین الدین کے خلاف
عدالت میں دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء سے شروع ہو کر ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی

نام کی صورت میں ختم ہوا۔ یہ غالب کی موت سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔

غالب کے بعد شیفتہ غالب کے پہلے نقاد ہیں، شیفتہ اس دور میں بھی غالب کی قدر کرتے تھے۔ جب غالب کو ناقد روانی کا سامنا تھا۔ شیفتہ روایت کے بھی قدر دان تھے۔ وہ غالب کے کلام میں روایت کی خصوصیات ڈھونڈتے تھے۔ اور یوں انہیں ظہوری اور نظیری کے درجہ پر لا کھڑا کرتے۔

غالب کے اگلے نقاد ان کے شاگرد مولانا حالی تھے۔ جنہوں نے ”یادگار غالب“ لکھ کر مرزا کو زندہ جاوید کر دیا۔ اس زمانے میں مغربی علوم ہندوستانی سوسائٹی میں اپنی جگہ بن رہے تھے۔ اسی لئے حالی نچرل شاعری کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ ان دنوں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اسی لیے ادب سے مقصدیت کے تقاضے کئے جا رہے تھے۔ نتیجتاً ادب کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ اس تناظر میں حالی نے غالب کے کلام کو بھی اخلاقی عکسِ نظر سے پرکھا۔ انہوں نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی۔ کہ کیا غالب کا قوم کے نام کوئی پیغام ہے اور یہ پیغام قوم کی اصلاح کرنے میں کس طور پر ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا ان کے کلام میں روایت کے مقابلے میں جدت مضامین ہے۔ کلام غالب کے مطالعہ سے حالی نے جانا کہ روایت کے مقابلہ میں یہ ایک دوسرا ہی عالم ہے۔ یہاں خیالات کی طرقلی ظرافت اور چونکا دینے والے استعارے اور کنائے اور ذومعنی اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس میں نیا لہجہ ہے نئی فکر ہے یہاں اور ہی سماں ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری غالب کے وہ نقاد ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا کہ ”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک ”وید مقدس“ اور دوسری ”دیوان غالب“ کہتے ہیں کہ بجنوری نے غالب کے اردو اشعار کی تشریح و تفسیر کی ہے۔ اور انہیں اپنی فلسفیانہ فکر کے ترازو پر تولی ہے۔ اسے تنقید غالب نہیں کہہ سکتے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن ”بجنوری کا مقدمہ تنقید غالب نہیں۔ غالب کی خدمت میں نئی نسل کا خراج عقیدت ہے“ بجنوری کے نزدیک مضامین کا تنوع اور فکر کی وسعت غالب کے کلام کا بنیادی آہنگ ہے۔

چونکہ بجنوری غالب کے کلام کے تجزیہ کو ایک خاص Climax تک لے گئے تھے۔ اس لیے ایک Anti-climax نے جنم لیا اور یہ غالب کے تیسرے نقاد ڈاکٹر سید عبداللطیف کی شکل میں منظر پر آیا۔ دراصل ڈاکٹر لطیف کا ”غالب کی شاعری“ کے عنوان سے ایک مختصر انگریزی مقالہ بجنوری کی ہیرو پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ انہوں نے بجنوری کی رومانی طرز تنقید کو بالکل ناپسند کیا ہے اور غالب کے کلام کو پرکھنے اور اس کی شخصیت کا اندازہ لگانے کے لئے چند کڑے تنقیدی اصول قائم کئے ہیں۔ نیز انہوں نے مغربی شاعری کے چند نمونے سامنے رکھ کر غالب کے کلام کو ان پر جانچا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کے مقالہ سے یہ چند الفاظ کتنے معنی خیز ہیں:

”کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس کا اصلی رنگ غمی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعری یہ آرزو رہی کہ وہ فکر

واعلہار میں اچھوتا معلوم ہو۔ اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی۔ اسکے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے۔ اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

(ڈاکٹر سید عبداللطیف ”غالب کی شاعری“)

ڈاکٹر عبداللطیف کے نزد غالب کے کلام کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن پر عقلی رنگ چڑھا کر پیش کیا گیا ہے:-
 بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
 موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
 دوسرے حصے کے اشعار میں خیال آرائی اور ترکیب تراشی نمایاں ہیں:-
 شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
 قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
 غالب کے کلام کے تیسرے حصے پر خالص وجدانی شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زبان کے قلب میں جو شاعرانہ جذبہ جھلک رہا ہے۔ اس کو حقیقی طور پر شاعر نے محسوس کیا اور ان اشعار کو بے تکلف صنعت گری سے باہر جولاں نہیں کرتا:-

سنجھنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

کہ دامان خیال یار چھوٹ جائے ہے مجھ سے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے کچھ اشعار کو لفظی کھیل سے زیادہ نہیں مانا اور ان میں پیش
کئے گئے تصور کو معمولی قرار دیا ہے:

ہے پرے سرحد اور اک ہے اپنا مجھ کو

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ڈاکٹر لطیف کے انگریزی مقالہ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویہ نگاہ کے

سایہ میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو

خود ہم آہنگی سے سہرا ہے۔ اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا“

(ڈاکٹر عبداللطیف ”غالب کی شاعری“)

ڈاکٹر عبداللطیف نے کلام غالب سے متعلق اپنے خیالات کو جس نچ پر ختم کیا تھا۔ محمد اکبر ام

نے اپنے خیالات کا ڈاڈا ادا کیا، پر ملا کر غالب میں فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز

”غالب نامہ“ میں یوں پیش کیا ہے:-

”ہر بڑا شاعر زندگی - اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے

معیاری میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفہ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشوونما کا ایک ایسا سامان چھوڑ گئے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک پہلو پر زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں“

(محمد اکرام ”غالب نامہ“)

ڈاکٹر اکرام غالب سے فلسفہ فکر کا تقاضا نہیں کرتے بلکہ اسی کی کو غالب کے فن کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی ہے کہ ان کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان ادوار کی بنیادی خصوصیات تلاش کیں۔ اکرام مرزا کے کلام کی مقبولیت کے اسباب تنوع، تجزیہ اور طرز فکر کو قرار دیتے ہیں۔

مہد جدید میں غالب کے نقادوں میں فیض احمد فیض نے کلام غالب میں ایک واضح اور نمایاں وحدت کی تلاش کرتے ہوئے ”اُداسی“ کو کلام غالب کی بنیادی کیفیت قرار دیا۔ اور ایک قدم آگے جاتے ہوئے اس اُداسی کو ہماری پوری نسل کی اُداسی سے جوڑ

دیا ہے۔

فیض کے بعد ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ہمارے عہد میں غالب کے نقاد ہیں۔ انہوں نے کلام غالب کے ڈاٹے اس کے اپنے عہد کی قومی ناہمواریوں کے ساتھ ملائے ہیں۔ ان کے بعد غالب کے جو قابل قدر نقاد منظر عام پر آئے وہ احتشام حسین اور آل احمد سرور ہیں۔

احتشام حسین نے اپنے مقالہ ”غالب کا تفکر“ میں دراصل یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے کلام کی جدت ادا اور اس میں کے لاتعداد نئے مضامین کے سماجی عوامل کیا ہو سکتے ہیں۔ احتشام کے مطابق ان وجوہات کو غالب کے سفر کلکتہ سے جوڑا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنے اس سفر میں وہاں کے مغربی حکمرانوں کے سرمایہ کارانہ تصورات کو جانچنے کا موقع ملا۔ غالب نے اس نظام کے خلاف بنگالی عوامی طبقاتی کشش کا مطالعہ بھی کیا۔ اس طرح غالب کے ذہنی پس منظر اور دلی دلکھو میں بیٹھے ہوئے انکے ہمعصر شعراء کی ذہنی سطح میں وہ فرق پیدا ہوا جو غالب کو اپنے ہمعصروں سے تمیز کرتا ہے۔ لیکن یہ تصویر ابھی پائیہ تکمیل کو نہیں پہنچی کہ حقیقتاً کلکتے کا یہ سفر واقعی غالب کے تفکر میں وہ تبدیلی لاسکا جس سے انکے کلام پر اسے نئے اثرات ہو سکتے تھے۔

آل احمد سرور نے کلام غالب کو صحت مند تفکیک کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ غالب ایسے دور میں ایک طرف۔ ہندوستان کی پرانی سماجی قدریں بدل رہی تھیں اور انکی جگہ بعض مقامات پر مغربی سرمایہ کاری نظام اپنے پیچھے گاڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا

غالب اپنی روایات سے مکمل طور پر کٹ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ مکمل طور پر نئے نظام میں اپنے آپ کو ڈھال سکتے تھے۔ انکے سامنے مستقبل کی صورت واضح نہیں تھی۔ ان عوامل کا علاج ان کے نزدیک ایک ایسے صحت مند تفکک کی صورت میں ابھرا جس میں پناہ لیتے ہوئے وہ کبھی رند کبھی فلسفی اور کبھی قلندر کے روپ میں اپنی شاعری کا کردار بنے رہے۔ ساتھ میں انکو اپنی پرانی روایات کے مٹ جانے کا شدید احساس رہا۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیر

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اسلوب احمد انصاری نے کلام غالب کا عمیق مطالعہ کر کے ان کی شاعری کے چند بنیادی عناصر پر ایک پر مغز مقالہ لکھا ہے۔ ان کے مطابق یہ بنیادی عناصر مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) فلسفہ (۲) معینہ اقدار و تصورات (۳) کائنات

(۴) عقیدہ وحدت الوجود (۵) تفکک (۶) تکتہ افروزی

(۷) پہلودار شاعری (۸) رحر طبع (۹) تجلیل

(۱۰) قانونی اصطلاحات کا استعمال (۱۱) حسن کا احساس (۱۲) حکیمانہ مزاج

(۱۳) فکر اور جذبہ

یاد رہے کہ انصاری نے ”چند“ بنیادی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ تمام کا ذکر ہونا ابھی باقی ہے۔

ماضی قریب اور عصر حاضر میں غالب کے محققین و ناقدین میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ہمیش پرشاد، مالک رام، امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مختیار الدین، حمید احمد خان اور سعید حسن رضوی کے نام سرفہرست ہیں۔ ظاہر ہے غالب جیسی نابغہ ہستی کے فن پر نقد و نظر کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ جس کو سرانجام دینے کے لیے بیسیوں محققین و ناقدین نہ صرف اس وقت اپنے کام میں مصروف ہیں بلکہ مستقبل میں بھی یہ کام جاری رہے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تک جو نقد و نظر کلام غالب کے حوالے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں ابھی کافی فحشگی باقی ہے۔ یہ تنقید اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچے گی جب مرزا کے اس شعر کے مطابق ہم ان کے عہد اور ان کے فن کے ارتقاء کو جان جائیں گے:

منجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

خوشحال کے چند اہم محققین و نقاد

اس سے پہلے کہ ہم خوشحال کے اہم نقاد کا ذکر کریں یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ خوشحال خود بھی ایک اچھے نقاد تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں تو قطع برید نہیں کی مگر اپنے سے پہلے اور ہمعصر شعراء و باء پر تنقید کی۔ اس صورت حال کو ہمایوں ہمدرد نے یوں سمیٹا ہے:-

”خوشحال کی شعری عظمت اور تنقیدی سوچ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ ایک ایسے نقاد ہیں کہ خود پر بھی تنقید کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی۔ انہوں نے اپنے عصر سے پہلے کے شعراء اور اپنے ہمعصر شعراء کے کلام میں گنجائش دیکھی تو اس پر تنقید کے تیر بر سائے۔ لیکن خوشحال کسی پر بے جا تنقید برائے تنقید نہیں کرتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اپنی بصیرت اور آگہی کی روشنی میں کہتے اور غرر ہو کر کہتے ہیں۔ وہ اپنی تنقید میں کسی قسم کی مصلحت اور منافقت سے کام نہیں لیتے۔ ان میں ایک اچھے نقاد کی تمام خوبیاں موجود تھیں“

(ہمایوں ہمدرد ”خوشحال خٹک کا تنقیدی شعور“)

خوشحال کے تین بیٹے عبدالقادر، خشک، صدر خان، خشک اور سکندر خان، خشک صاحب دیوان شعراء گذرے ہیں۔ پوتوں اور پڑپوتوں میں افضل خان، خشک، سعید خان، خشک، کامگار خان، خشک اور کاظم خان شیدا پشتو شعر و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ بیٹی بی بی حلیرا اپنے کلام کے لئے شہرت رکھتی ہے۔

خوشحال کے بیٹوں اور پوتوں پڑپوتوں کا ذکر اسلئے کیا گیا کہ ان میں سے اکثر نے اپنے باپ اور دادا (خوشحال) کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔ یہاں چند ایک کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ خوشحال کے بعد خوشحال کی اولاد میں بھی انکے تاریخ، محقق اور نقاد گذرے ہیں۔

اشرف خان بھری نے خوشحال کی موت کی تاریخ اپنے قاری قطعہ میں یوں نکالی:-

سال ہجران او اگر خواہی

مومن خیر، مجدد احسان بود

”مومن خیر“ سے خوشحال کی تاریخ وفات ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء نکلتی ہے۔

خوشحال کے ایک اور بیٹے گوہر خان نے اپنے قاری قطعہ میں خوشحال کی تاریخ وفات کے متعلق کہا:-

چوں ز تاریخ فوت خان خیرم

شد ز مارت زیں جہاں پدرم

”ز مارت زیں جہاں پدرم“ سے بھی ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء کی تاریخ نکلتی ہے۔

کلام خوشحال کی تعریف میں خوشحال خان کے سب سے بڑے پسر اشرف خان ہجری کا یہ شعر ملاحظہ کریں:-

تہول نی اوسپارو پہ ما سریر د نظم

ہفہ "نمر" چہ نن د خاورو پہ بستر دم

ترجمہ:- وہ سورج (خوشحال) جو کہ آج مٹی کے بستر پر ہے نظم کا سارا قلمدان مجھے سونپ گیا ہے۔

خوشحال کے ایک اور صاحب دیوان بیٹے عبدالقادر خان ٹنگ اپنے والد کی شاعری میں یوں رطب اللسان ہیں:-

دا غزل پہ پینتوڑیہ چہ بیان عبدالقادر کرو

درو غثرن یم کہ "ہی خانہ" وائی بل یو پینتون ہسپ

ترجمہ:- یہ غزل جو پشتو زبان میں عبدالقادر نے کہی ہے۔ مجھے جھوٹا کہنا اگر خان (خوشحال) کے علاوہ کوئی دوسرا پشتون ایسی غزل کہہ سکے

خوشحال خان ٹنگ کی زندگی اور فن پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد ٹنگ کے مطابق "تاریخ مرصع" وہ پہلی کتاب ہے جس میں خوشحال کے فاضل پوتے افضل خان ٹنگ نے خوشحال کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اب ۱۹۷۴ء میں جناب دوست محمد خان کامل کے حاشی کے ساتھ پشاور سے شائع ہوئی ہے۔ کاظم خان شیدا کی راپور ہندوستان میں رہائش تھی۔ وہاں اس نے اپنے پردادا

خوشحال کا نام یوں زندہ رکھا:

د پښتو شعر معلوم وو

په معنی کښي کالعدم وو

چي قلم په لاس د "خان" شو

مرتب شي لوني ديوان شو

هر شاعر چي د افغان دے

ريزه چين د خان د خوان دے

ترجمہ:- پشتو کا شعر اصلی معنی میں معدوم تھا۔ لیکن جب خان (خوشحال) کے ہاتھ میں قلم

آیا تو ایک بہت مخیم دیوان مرتب ہوا۔ افغان (قوم) کا جو بھی شاعر ہے۔ وہ خان

(خوشحال) کے خوان کاریزہ چین ہے۔

مغربی مستشرقین

خوشحال خان کی اولاد کے علاوہ ان کے دوسرے نقاد مغربی مستشرقین ہیں۔ ان میں انگریز اہل علم سرفہرست ہیں۔ جن کو اپنی حکمرانی کے دور میں کم و بیش اسی (۸۰) برس تک پشتون اقوام کے ساتھ رہے جس نے اور اس دوران پشتو زبان سیکھنے اور اس پر تحقیق و تنقید کرنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ پشتو کی اولین گرامر اور ڈکشنری لکھنے کا سہرا بھی انہی مستشرقین کے سر ہے۔

”خوشحال کے احوال زندگی اور اسکے افکار پر تحقیق“ تنقید اور ترجمہ کے کام کی ابتداء مستشرقین نے کی۔ ان میں میجر رابرٹ سی ای بڈلف، ہنری ہیلو، پادری ہیوز، اولف کیر و اور ڈاکٹر ڈی این میکفرزی کے نام خصوصی ذکر کے حامل ہیں (۱)۔

(ڈاکٹر محمد اقبال نسیم خٹک ”پیش لفظ خوشحال اور جمالیات“)
”اس فہرست میں ایسٹورٹ الفنسٹن سرائیون ہاول اور چند روسی محققین کے نام بھی شامل

(۱) نوجوان محقق محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق ان مستشرقین کی فہرست میں جے جی لودیر (پچھونرگی)، مارگن ٹائسن (ٹاروے)، اور جنرل ایڈلسن (جینی گل) بھی شامل ہیں۔

(محمد زبیر حسرت۔ جدید پشتو ادب میں تحقیق کی صورت حال) ’ تاترہ جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء

سمجھے جائیں۔

”خوشحال کے کلام کا انگریزی ترجمہ اور اس پر تنقید کرنے والے اولین مستشرقین میں میجر راورٹی کا مقام بہت اونچا ہے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے متعلق کہا ہے کہ ”مغرب کے شعراء کی طرح کوئی ایسا مضمون نہیں جو اس کے لیے بیگانہ ہو۔ شاعرانہ مضامین کے تنوع میں خوشحال خان شرقی کی نسبت مغرب کے شعراء سے نزدیک ہے اس کی شاعری کے لیے انسانی زندگی کا ہر پہلو ایک موزوں مضمون ہے۔ کیونکہ وہ انہیں قادر الکلامی کے ساتھ شاعرانہ اور ادبی رنگ میں پیش کر سکتا ہے۔ خوشحال اس صفت میں پشتو ادب کی ایک یکتا شخصیت ہے“

(سید رسول رسا ”مقدمہ ارمغان خوشحال“)

”میجر راورٹی پشتو کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ پشتو گرامر اور پشتو ڈکشنری ان ہی کی تصنیفات ہیں۔“

(شیر افضل برکیوٹی ”دہد بہ رنوخال“)

میجر راورٹی نے Selection from the poetry of the Afghans میں خوشحال کی ۹۸ منتخب نظموں اور غزلوں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اسی ترجمے کے ذریعے خوشحال کے افکار سے متعارف ہوئے تھے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے ایک عشقیہ شعر کو انگریزی میں یوں ڈھالا ہے۔

خوشحال خٹک، چہی بیا موندو لذت دیار د شونہو
 دہ وتہ نور وارہ د جہان خواہہ گنہ پیردی
 "Since khushal khattak has drunk nectar from
 the lips of his beloved all the other sweets of the
 world are to him nauseous poison"

ڈاکٹر خالد خٹک کے مطابق کیمرج یونیورسٹی کے سی ای بڈلف نے ۱۸۹۰ء میں خوشحال کے
 کلام کا دوسرا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور Selection from the poetry of khushal
 khan khattak کے نام سے لندن سے شائع کیا۔ بڈلف نے خوشحال کے فن پر جو تبصرہ
 کیا ہے۔ وہ جناب مرشد کی زبانی سنئے :-

"خوشحال ایک ہمہ صفت ادیب تھے۔ انکی شاعری پشتون قوم کے
 اخلاق اور زندگی کا آئینہ تھی۔ انکی شاعری احساسات، ہمت اور
 شجاعت بھرے جذبات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ خیالات اور روحانی
 افکار کا قابل قدر مجموعہ ہے۔"

(مرشد "زمانے کا غیر متند خوشحال") تاترہ اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱
 ایک اور انگریزی عالم مونت اسٹیورٹ الفنسٹن نے بھی پشتو زبان میں تحقیق کا کام کیا۔
 اس نے کلام خوشحال پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے جس سے خوشحال کا ادبی مقام متعین ہوتا
 ہے :-

"خوشحال خان خٹک نے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں ہر قسم کے

اجتماعی واقعات کو جگہ دی گئی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ خوشحال کی اپنی زندگی کی تصویر بھی منعکس ہوتی ہے۔ اسکی شاعری کے موضوعات کا سلسلہ کافی طویل ہے“

(ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ”خوشحال خان خٹک“ ماہنامہ پشتو پشاور خوشحال نمبر ۲۰۰۱ء ص ۲۱)
 ۱۹۶۳ میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام کلام خوشحال کی سولہ منتخب غزلوں، سات قصائد اور تین قطعات کا انگریزی ترجمہ لیے ہوئے سر ایولن ہاڈل اور سر اولف کیرو کی لکھی ہوئی کتاب ”دی پکٹری آف خوشحال خان خٹک“ شائع ہوئی۔ میں چاہوں گا کہ اس انگریزی ترجمے کا ایک نمونہ دیکھنے سے پہلے سر اولف کیرو کی وہ تنقید دیکھیں جو اس نے (اپنی اسی کتاب میں) خوشحال کی شاعری کے بارے میں کی ہے:-

”It is worth while to dwell at some length on khushal's life and thoughts for he is a pathan of pathans. With all his weaknesses with all his vainglory, there is something splendid about the man. He compels affection and even love. And to understand him is the beginning of knowledge for him who would know pathan.

Those of his works which have come down to us consist in the main of a very large corpus of pakhto poetry of which the most

famous odes are still on the lips of every pathan.

But he also wrote in prose on subjects ranging

from religion and philosophy to sport and

falconry"

خوشحال کے کلام میں موثر ترین غزل آفریدی قبیلے کی شاخ آدم خیل کی دو شیرازوں کے حسن و جمال سے متعلق ہے۔ سراوان کیر وادہ سرایلون ہاول نے اس غزل کو بھی انگریزی ترجمے کے لیے چنا ہے اس غزل کا انگریزی ترجمے کے لئے چنا جانا ہمارے نزدیک مثبت تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے پہلے دو اشعار ہی سے اسکی دلکشی کا اندازہ ہو جاتا ہے:-

آدم خیل افریدی دی سرے او سپینی
پکینی شتہ دی بنائستہ پہ رنگ رنگینی
غتمی سترگمی لونہ بانہ فراخی وروخی
شکر لبی گل رخساری مہ جبینی

انگریزی ترجمہ:-

"Rosy and fair to the eyes are the daughters of Afridi Maids of the Adam khel, Lovely how they are lovely Large and liquid the eyes, brows arched, long lashes, sugar lips, Cheeks like flowers, foreheads as bright as the moon"

اردو ترجمہ:-

آدم خیل افریدی دوشیزائیں سرخ و سپید ہیں۔ ان میں خوبصورت اور نکلن صورت والی پائی جاتی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں، لمبی لمبی پھنڈوں اور فراخ ابروؤں والی، شکر لب، گل رخسار اور ماہ چین۔“

ایک اور مستشرق N. Mackenzi ا تھے جس نے Poems from the Diwan of khushal khan khattak کے نام سے خوشحال بابا کے چیدہ چیدہ کلام کا ترجمہ ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع کیا۔ اور یوں خوشحال کے کلام کو مغرب میں متعارف کروایا۔

افغانستان میں خوشحال کے محققین اور نقاد

انگریزوں اور دوسرے مغربی مستشرقین کے علاوہ افغانستان کے محققین اور نقادوں نے خوشحال بابا پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ ان محققین اور نقادوں میں علامہ عبدالحی حبیبی، گل باچا الفت، عبدالرؤف بنوا، صدیق اللہ ریشمین، عبدالشکور رشاد، قیام الدین خادم، محمد اکبر معتمد، محمد شیرین، گنوی خوشگیا، بنی، بخانی، ڈاکٹر دولت محمد لودین، ڈاکٹر عارف عثمان، حبیب اللہ رفیع، زرین انور، ڈاکٹر گل محمد نوروزی اور نوجوان محقق ہیواہل شامل ہیں۔ ان سب نے خوشحال پر جو کتابیں مقالے اور مضامین لکھے ہیں۔ وہ بے مثال ہیں۔ ان کے ادبی کام کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کی وجہ سے پشتون قوم خوشحال خان کے نام اور کام دونوں پر ہمیشہ کے لیے ناز کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر خالد خان خٹک کے مطابق ان ادبی کاوشوں کی تفصیل درج ذیل ہے:-

(۱) ۱۹۳۸ء میں علامہ آقائے حبیبی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”خوشحال ملغلرے“

(خوشحال کے موتی) کے نام سے خوشحال کا مکمل دیوان دو جلدوں میں شائع کیا۔

(۲) ۱۹۵۰ء میں ”خوشحال خان خٹک خٹہ وائی“ کے عنوان سے عبدالرؤف

بنوا نے خوشحال خان کے فن پر پہلی تحقیقی کتاب کا بل سے شائع کی۔

(۳) ۱۹۵۳ء میں خوشحال خان کی تصانیف طب نامہ اور باز نامہ پشتو اکیڈمی کابل نے شائع کیں۔

(۴) ۱۹۵۸ء میں عبدالرؤف بینوا نے ”خوشحال اوپسر لے“ نامی کتاب کابل سے شائع کی اس کتاب میں خوشحال خان خٹک کے بہار سے متعلق اشعار کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

(۵) افغانستان کے مشہور ادیب گل باچا الفت نے خوشحال کے فن اور شخصیت پر ”ملی قہرمان“ نامی کتاب ۱۹۶۵ء میں کابل سے شائع کی۔ گل باچا الفت کے ایک مقالے سے یہ اقتباس دیکھیے:-

”فردوسی نے اگر اپنی مادری زبان فارسی کی خدمت کی ہے تو اس سے زیادہ خدمت خوشحال خان خٹک نے اپنی مادری زبان پشتو کی ترقی کے لیے کی ہے۔ کلچر اور تہذیب اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب ان میں فردوسی اور خوشحال جیسے زبان دان پیدا ہوں“

(۶) افغان محقق صدیق اللہ ریشمین نے اپنی شاہکار کتاب ”تاریخ پشتو ادب“ میں خوشحال اور اسکی اولاد کی علمی اور ادبی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ فاضل محقق نے خوشحال کی تین کتابیں باز نامہ طب نامہ اور فضل نامہ بھی چھپوانے کا اہتمام کیا اور اس طرح پشتون قوم کو خوشحال خان خٹک کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

(۷) محترمہ معصومہ عصمتی کی خوشحال خان پر فارسی میں تحقیقی کتاب ”خوشحال خان خٹک کیست“ بھی افغانستان میں شائع ہوئی۔

(ڈاکٹر خالد خان غلک۔ خوشحالیات ”خوشحال نامہ“)

افغانستان کے گل محمد نوروزی نے خوشحال کی زندگی کے ادبی آثار اور ادبی خدمات پر مقالہ لکھ کر ماسکو یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

نوجوان افغان محقق اور نقاد ہیوا دل نے خوشحال بابا کی کتاب ”فراق نامہ“ چھپوائی ہے۔ اس کتاب سے مغلوں کی قید و بند میں خوشحال پر روارکھی جانے والی سختیوں کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب خوشحال نے اسی قید و بند کے دوران رخصتور (بچے پور) اور دلی میں لکھی۔ فراق نامہ سے غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ غزل کے مقطع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل دلی میں نظر بندی کے دوران لکھی گئی تھی:-

د فراق غم ونہ لور پہ لور انبار دی

پہ کاغذ باندی د کوم پوہ حساب کنیم

کہ د خوب خاطر لہ حال چاتہ کنبل کرم

ہا آہونہ یا زرا یا بہ عذاب کنیم

ما خوشحال پہ خوب دا حال لیدلے نہ وو

چی بہ دا د غم بیتونہ پہ پنجاب کنیم

ترجمہ:- ہر طرف ڈھیر کے ڈھیر جدائی کے غم ہیں

اب میں کاغذ پر کن کن کا حساب لکھوں

اگر میں اپنے دکھی دل کا حال کسی کو لکھوں

تو یا اپنی آہ و فریاد یا درد کا بیان ہی لکھونگا
مجھ خوشحال نے تو یہ حال کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا
کہ غم کے یہ اشعار میں ہنjab میں بیٹھ کر لکھوں گا۔

برصغیر پاک و ہند میں خوشحال کے محققین اور نقاد

بیسویں صدی کے دوران علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند کے وہ پہلے مسلمان نقاد
ہیں۔ جنہوں نے خوشحال کی شخصیت اور کلام سے متاثر ہو کر انکی شاعری کی تعریف کی اور
انہوں نے خوشحال کے متعلق جاوید نامہ میں جو کچھ فرمایا ہم اسے علامہ اقبال کی طرف سے
خوشحال کی شخصیت اور کلام پر انکی تنقید سمجھتے ہیں:-

خوش سرو و آں شاعر افغان شطاس

آں کہ بیند باز گوید بے ہراس

آں حکیم ملت افغانیاں

آں طبیب ملت افغانیاں

راز قومی وید و بے باکانہ گفت

حرف حق با شوخی رندانہ گفت

علامہ اقبال نے کلام خوشحال کو برصغیر کے انگریزی دان طبقے میں متعارف کرانے کے لیے حیدر آباد دکن سے شائع ہونے والے انگریزی مجلہ ”اسلامک کلچر“ میں ایک مضمون بعنوان ”The Afghan Warrior poet“ چھپوایا۔ اس مضمون میں خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا:-

”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ہم انکی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں غلط نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی دیا ہی نظر آتا ہے“

لاہور کی ریسرچ سکالر محترمہ خدیجہ فیروز الدین نے علامہ اقبال کے کہنے پر خوشحال کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۳۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بیسویں صدی ہی کے دوران صوبہ سرحد میں خوشحال کے سب سے پہلے مسلمان محقق اور نقاد ہونے کا سہرا جناب دوست محمد خان کامل مرحوم کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خوشحال کے کلام کے قلمی نسخے ڈھونڈ کر اکٹھے کئے بلکہ ان کے ذریعے کلیات خوشحال خان مرتب کر کے ایک بڑے مغز مقدمہ کے ساتھ چھپوایا۔ کامل صاحب نے خوشحال کی

شخصیت اور کلام پر کتابیں اور مقالے لکھے۔ اور تبصرے بھی کئے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اردو میں فن و حیات خوشحال خان خٹک پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔ جس میں ان کے کلام کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ خوشحال خان کے متعلق خارجی رویہ کو عنوان بناتے ہوئے انہوں نے انگریزی میں ایک مدلل اور سیر حاصل کتاب :- "On A Foreign Approach to Khushal Khan Khattak" لکھی۔ پشتو زبان کے متعلق خوشحال بابا کے احساسات کا ذکر جناب کامل صاحب نے اپنے ایک پشتو مقالہ میں یوں کیا ہے:- ترجمہ:-

”اس آگہی اور احساسات کا مالک اپنی قوم کی زندگی میں زبان کی ترقی، ادبی تحقیق اور ثقافتی سرمائے کے وجود اور اس کو بڑھا دینے کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ علم و آگہی سے محبت اور ان کی تحقیق، قوم کی تہذیب و تمدن اور ادبی و ثقافتی ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محبت جتنی بڑھتی جاتی ہے اور محبت کرنے والا ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی تہذیب، تمدن، ادب اور ثقافت بھی پھیلتے جاتے ہیں اور ہر قوم کی تہذیب، معاشرہ اور کلچر اپنی زبان کے ساتھ میچ کرتے ہیں۔ قوموں کی اجتماعی زندگی اور اس حقیقت کا احساس و شعور اور اس پر دو ٹوک عمل خوشحال خان کے ادبی آثار میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ پشتو زبان اور

ادب کی اپنی ریت قائم کرنے اور انہیں ترقی دینے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اور انکی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ خود پشتو زبان کی محبت میں جھلا ہیں اور پوری قوم کو اپنے ہمراہ اس محبت میں جھلا دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ انکے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:-

اردو ترجمہ:- مجھے فارسی شعر کہنا بھی آتا ہے میں پشتو اور فارسی دونوں کا سلیقہ رکھتا ہوں۔ لیکن میں نے پشتو کو فارسی پر اس لئے فوقیت دی کیونکہ ہر شخص کو اپنے لوگ پسند ہوتے ہیں“

”میں نے پشتو کو رمز‘ مضمون‘ نزاکت اور تہذیبہ میں عین فارسی تک پہنچا دیا ہے“

”میرا ہر کلام چاہے آوے ہو یا الہام میں نے اسے بحر کی تقطیع میں بند کر دیا ہے“

”جب میں نے پشتو زبان پر اپنا علم بلند کیا تو گویا باتوں کا ملک اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے فتح کیا“

(دوست محمد کامل ”خوشحالی ادب میں ملی شعور“ تاترہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء)

خوشحال خان خٹک کے ایک اور مشہور مؤرخ اور نقاد جناب سید رسول رسا ہیں۔ انہوں نے خوشحال کی بیشتر منظوم تصانیف کو سچا کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ”ارمغان

خوشحال" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ جس کے ساتھ ۱۳۳ صفحے کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مقدمہ لکھ کر جناب سید رسول رسا نے نہ صرف خوشحال کی زندگی کے حالات کو آنے والی نسلوں کی آگہی کے لیے قلمبند کر دیا ہے بلکہ خوشحال کے فن پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کے بعد ہم جس ثقہ کا ذکر کریں گے۔ وہ پشتو کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا تھے۔ انہوں نے خوشحال کے فن پر متعدد مقالے سپرد قلم کئے۔ وہ خوشحال کے فن میں انکی حماسی شاعری پر گراں قدر خیالات کا اظہار کرنے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔

استاد محترم پروفیسر تقویم الحق کا کاخیل مرحوم خوشحال بابا کی شخصیت اور فن پر ایک مستند محقق اور ثقہ تھے۔ انہوں نے خاص طور سے خوشحال بابا کے تصور جمال پر تحقیق و تنقید کی ہے۔ ان کا پر مغز مقالہ "خوشحال خان کا تصور جمال" ان ہی کا دشوں کا نتیجہ ہے۔

جناب امیر حمزہ خان شنواری مرحوم عصر حاضر کی پشتو شاعری خاص طور پر غزل کے میدان کا ایک قابل قدر نام ہے۔ شاعری کے علاوہ وہ فلسفہ اور تصوف پر بھی ایک مستند حیثیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خوشحال بابا کی شاعری میں تصوف پر نہ صرف تحقیق کی بلکہ انکے فلسفہ وحدت الوجود پر کہے گئے ایک صوفیانہ شعر پر ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر سید انوار الحق نے خوشحال بابا کی غزلیات، قصائد، رباعیات، قطعات، متفرقات اور انکی دیگر تصنیفات یعنی فضل نامہ، باز نامہ اور سوات نامہ وغیرہ سے چیدہ چیدہ کلام کا انتخاب

کر کے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام ”منتخبات خوشحال خان خٹک معہ اردو ترجمہ“ چھپوا کر پشتو دان طبقہ سے زیادہ اردو دان طبقہ کی خدمت سرانجام دی ہے۔ اور یوں وہ پشتو اردو اتحاد کے سفیر کے طور پر ابھرے ہیں۔ خوشحال بابا کے کلام پیغام اور فلسفے سے آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور سے اردو دان حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

خوشحالیات کی ترویج و توسیع میں میر عبد الصمد خان افریدی کی خدمات کو ہمیشہ گراں قدر نظروں سے دیکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق اردو کتاب ”خوشحال و اقبال“ لکھ کر نہ صرف خوشحال بابا اور علامہ اقبال کی شخصیتوں اور فن کا قابل قدر موازنہ کیا ہے بلکہ اپنی اس کتاب کے ذریعے اپنے اہل وطن پاکستانیوں کے تشخص اور جذبہ اتحاد کو مزید مستحکم کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ جس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔ اور یوں اردو دان طبقے کو خوشحال اور پشتو دان طبقے کو اقبال سے نہایت متاثر کن طریقے سے روشناس کرایا ہے۔ میر عبد الصمد خان افریدی کی دوسری تصنیف ”تعلیمات خوشحال“ بھی اردو میں نکلی گئی۔ اس کتاب میں خوشحال کے افکار اور تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اہل پاکستان کی جانی بچانی شخصیت جناب پروفیسر پریشان خٹک مرحوم نے خٹک ہونے کے ناطے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے سربراہ بنکر اور ایک قدم آگے بڑھ کر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے صدر نشین کی حیثیت سے خوشحال بابا کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے از حد کاوشیں کیں۔ تحقیق کے علاوہ خوشحال خان پر انکے

مقالات اور تصانیف موجود ہیں۔ انکی ”پشتو شاعری کی تاریخ (ایک تحقیقی جائزہ)“ نامی کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے جنوری ۱۹۸۸ء میں چھاپی۔ اس کتاب میں پریشان خٹک مرحوم نے ”گوشہ خوشحال خان خٹک“ کے عنوان سے ہمارے عظیم شاعر کی زندگی اور فکر و فن پر ایک خصوصی مقالہ سپر وقلم کیا ہے جو خوشحالیات کے سلسلہ میں مطالعہ کے لیے ایک خاصے کی تحریر ہے۔ اسکے علاوہ خوشحال بابا کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر ۲۹۔۳۰ مارچ ۱۹۸۰ء کو باسین آرٹس کونسل پشاور کے زیر اہتمام جنوری مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کو پریشان خٹک مرحوم نے جناب خاطر غزنوی مرحوم کی معاونت میں ترتیب دیکر ”خوشحال نامہ“ کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ اس کتاب میں شامل انکے مقالے ”خوشحال بابا“ کی آخری سطروں سے یہ اقتباس قابل غور ہے:-

”مرا کہنے سے یہ ہے کہ اسے (خوشحال بابا کو) ایک مختصر مقالے میں متعارف کرنا کیسے ممکن ہے۔ جسکے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی خوبصورتی کے بیان میں ہومر، رزم میں فردوسی، اخلاق میں سعدی، عشق و تصوف میں حافظ، فلسفہ میں خیام، عشرت میں بونو اس اور فصاحت میں حضرت حسان کا تابع ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے اور پھر یہ کہ صرف فردوسی نہیں خود ستم بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔

وہ ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جسکی نظیر دنیا میں بہت کم نظر میں آتی ہے۔ لیکن ابھی تک دنیا والوں نے خوشحال خان کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جو اس کا حق ہے۔ حالانکہ اس کا خیال تھا:-

د خوشحال قدر کہ اوس پہ ہیچا نشستہ
پس لہ مرگہ بہ نہی یاد کا دیسر عالم
ترجمہ:- ”خوشحال کی اب اگر کوئی قدر نہیں کرتا۔ موت کے بعد ایک
عالم اس کو یاد کرے گا۔“

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اسلئے میں نے اپنے شعر میں اسے یوں مخاطب کیا ہے:-

قصور کیا ہے ترا جو کبھی معاف نہ ہو
زمانہ تجھ سے ہمیشہ نظر چراتا رہا
کسی نے سننا نہ چاہا کوئی سمجھ نہ سکا
میں تمیں سال تیری داستاں سناتا رہا “

پروفیسر پریشان خٹک کے بھائی حاجی پر دل خان خٹک بھی خوشحالیات کے میدان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور کے خوشحال ریسرچ سیل میں جو تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے خوشحال خٹک کی کتاب ”دستار نامہ“ کی تالیف کر کے ۱۹۹۱ء میں پشتو اکیڈمی سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں حاجی پر دل مرحوم نے ”پشتو شاعری قدیم و جدید شعراء“ میں بھی خوشحال کے فن پر مفید

روشنی ڈالی ہے انہوں نے پہلی پشتو اردو لغت کی ترتیب و تدوین کر کے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کروائی۔ انکی ادبی خدمات کی وجہ سے انہیں تین سال کے لیے R.C.D پروگرام کے تحت ترکی میں مزید تحقیقی کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جناب فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے ۱۹۸۰ء میں ”خوشحال خان خٹک۔ تلاش اور منظوم ترجمہ“ کے نام سے اپنی اردو کتاب لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد سے شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کے کلام کی تمام اصناف یعنی غزلیات، نظمیں، رباعیات و قطعات، حمد، نعت اور منقبت سے چیدہ اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ باز نامہ، جنسیات اور باز و شاہین سے متعلق خوشحال بابا کے اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری نے خوشحال بابا کی فارسی شاعری پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے کم و بیش دو اڑھائی سو فارسی اشعار پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ فارسی اشعار خوشحال بابا کے پشتو دیوان ہی کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر جعفری فرماتے ہیں:-

”خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئیں ہیں۔ جس میں اشعار کی مجموعی تعداد کم و بیش دو اڑھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں۔“

(ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ”خوشحال بابا کی فارسی شاعری“)

پشتو کے نامور محقق جناب ہمیش خلیل نے خوشحال بابا کی تصنیف ”اخلاق نامہ“ کی ترتیب و تدوین کر کے کتابی صورت میں چھپوایا۔

جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثری تحریر ”دستار نامہ“ کا اردو ترجمہ بمبہ تبصرہ ۱۹۸۰ء میں پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام شائع کیا۔ اس کتاب میں جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثر پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ اور یوں خوشحال بابا کو جدید پشتو نثر کا بانی کہا ہے۔

جناب فکندر مومند خوشحالیات کے میدان میں ایک نقاد کی حیثیت سے یاد رکھے جائیگے۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اور محسن احسان نے رباعیات خوشحال کا مظلوم اردو ترجمہ کر کے ایک یادگار ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اسکے علاوہ بھی ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک خوشحالیات پر ایک ماہر اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے صدر نشین کی حیثیت سے بھی خوشحال بابا کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے انتھک کام کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے پُر مغز مقالے یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنی مشہور تحقیقی کتاب ”خوشحال اور جمالیات“ (خوشحال اور جمالیات) کے لیے یاد رکھے جائیگے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کی پی ایچ ڈی کے لیے لکھی گئی تھیسس کی کتابی صورت ہے۔ یہ کتاب خوشحال ریسرچ سیل پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام ۱۹۸۷ء میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں خوشحال کے تصور جمال کے علاوہ

انکے فن پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر نواز حائر نے ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور کی حیثیت سے تاریخ ادبیات پشتو کی تالیف کر کے ”رودہی ادب“ کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں بھی خوشحال بابا کے فن پر ادبی بحث کی گئی ہے۔

خوشحال بابا کی تصنیف ”سوات نامہ“ کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر کلکیل احمد نے پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا۔ دیباچہ ڈاکٹر راج دلی شاہ خٹک نے انگریزی میں سپرد قلم کیا ہے۔

جناب شیر افضل خان برکھٹی نے ”دبدبہ خوشحال“ کے نام سے خوشحال خان کے فن پر کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کی حقیقی اور مجازی شاعری پر سیر حاصل بحث خوشحال بابا کے اشعار کی روشنی میں کی گئی ہے۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس باب میں جناب ڈاکٹر وردیش خان یوسف زئی کی ان تحقیقی کاوشوں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے نتیجے میں انکا پر مغز پشتو مقالہ بعنوان ”غالب اور خوشحال“ (غالب اور خوشحال) پشتو سہ ماہی مجلہ ”تاتارہ“ پشاور اکتوبر-دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھپ کر اہل نظر کے سامنے آیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی دس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط تحقیقی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس میں غالب و خوشحال کے چیدہ چیدہ اشعار کی روشنی میں دونوں تاجہ شعراء کے فن کا موازنہ کیا گیا ہے۔

خوشحالیات کے میدان میں ڈاکٹر خالد خان کے مضامین اور مقالات پڑھنے کی حامل

تحریریں ہیں۔ انکی تحقیق کا دائرہ برٹش میوزیم لائبریری لندن تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ خوشحال خان خٹک پر چند معزز اہل قلم کے نام تحقیق و تحریر کے سلسلے میں لئے جانے کے قابل ہیں۔ ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر اعظم اعظم پروفیسر افضل رضا مرحوم جناب نواز خٹک جناب عقاب خٹک جناب حمد اللہ جان بگل جناب سلیم راز جناب داود خان داؤد پروفیسر نعیم تقویٰ محترمہ پروفیسر ڈاکٹر سلٹی شاہین جناب محمد پرورش شاہین جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر جناب ہمایون ہما محترمہ ڈاکٹر بی بی مریم جناب روخان یوسفزئی اور نوجوان محقق ڈاکٹر زہیر حسرت شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے معزز ادباء ہونگے جو خوشحال کے فن پر کام کر رہے ہیں۔ میں ان سب سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر اس ضمن میں انکے اسمائے گرامی اور انکے کام سے متعلق یہاں پڑ کر نہ کیا گیا ہو۔ خوشحال بابا کے ایک قابل قدر نقاد جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر ہیں۔ انکی تنقید میں سے ایک اقتباس پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔ اس اقتباس میں آپکو غالب کے مشہور نقاد ڈاکٹر سید عبداللطیف کارنگ چمکتا نظر آئے گا:-

”اگرچہ پشتون ادیبوں اور باہر کے لوگوں نے خوشحال خان کے متعلق بیسویں صدی کے دوران منائی گئی برسیوں میں تاریخی انکشافات کئے ہیں اور انکی تاریخی شخصیت اور ادبی خدمات کو کما حقہ منظر عام پر لائے ہیں۔ لیکن پھر بھی خوشحال کی متنوع شخصیت اور تاریخی اقدامات اس سے بھی زیادہ انکشافات کے متقاضی ہیں۔“

کیونکہ کچھ وقت کے لیے منطقی استدلال کے زور پر لکھے گئے
چند مقالے بعض لوگوں پر پیشکش کے کمال کے زور پر اتنا اثر ڈال
چکے ہیں کہ ان کو صحیح سمجھا جائے۔ بعض دوسرے ادیبوں نے جوابی
کارروائی کے زور پر نہ صرف اس استدلال کو رد کیا ہے۔ بلکہ تحقیق کا
رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے۔ اس مثبت اور منفی عمل سے کم از کم یہ ہوا
کہ ادباء کو مجبور ہونا پڑا کہ خوشحال خان کو صحیح طریقہ پر ایک طرف تو
ما فوق الفطرت عالم بالا سے نیچے لایا جائے اور دوسری طرف تحت
الغراء میں گرانے سے بچایا جائے۔ تاکہ وہ زمین کی سطح پر اچھے
برے علم و فہم کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ جڑ کر ایک ہوشمند
باخبر اور انسانی زندگی کے ترجمان مفکر کے طور پر سامنے آئے۔

(پروفیسر محمد قاسم مظہر ”خوشحال خان خٹک“ خوشحال مطالعہ، ص ۱۳۰، ۱۳۱)

موازنہ خوشحال وغالب

تلخیص

اس کتاب کے سارے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد غالب ہم ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں خوشحال وغالب کی شخصیت و فن کا ایک خصوصی موازنہ کر سکیں۔ آپ نے مخصوص کیا ہو گا کہ شخصیت و فن کے لحاظ سے ان نابغہ شعراء میں قدر موافق بھی پائی جاتی ہے اور قدر تفاوت بھی۔ اس لئے ان اقدار پر تفصیل سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

شخصیت کے لحاظ سے خوشحال وغالب میں بہت سے پہلو ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں نابغہ روزگار ہستیاں مغلیہ دور میں گزاری ہیں گو کہ دونوں کے ادوار میں لگ بھگ پورے دو صدیوں کا فاصلہ جاگل ہے۔ دونوں دربار مغلیہ سے منسلک رہے۔ بچپن میں دونوں نے نوابانہ ماحول اور ناز و نعم میں پرورش پائی۔ دونوں کتب سے باہر کے ماحول میں خوش رہے۔ دونوں کو تعلیمی اور فکری استعداد بڑھانے کے لئے اچھے اساتذہ میسر آئے۔ اگر خوشحال نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اولیس ملتانی جیسے جید اساتذہ سے استفادہ کیا تو غالب کو ملا عبدالصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم و فاضل استاد ملا۔ خوشحال کے والد شہباز خان میدان جنگ میں زخمی ہو کر وفات پا گئے تھے تو غالب کے والد عبداللہ بیک خان نے بھی میدان جنگ

میں لڑتے ہوئے وفات پائی۔ خوشحال و غالب دونوں کو اپنے اپنے خاندانوں اور آبائی سپہ گری پر ناز تھا۔ دونوں کو مغلیہ دربار سے خلعتیں اور نقد انعامات عطا کئے گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے جائے مولود سے دور کئی مقامات کے سفر اختیار کئے۔ دونوں بااخلاق انسان تھے اور دوستوں کو عزیز رکھتے تھے۔ دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی اور دونوں کی شادیاں نسبتاً جلدی کر دی گئی تھیں۔

دونوں نے آخری عمر میں اس بات کا شکوہ کیا کہ انکے فن کی قدر و منزلت ان کی امیدوں کے مطابق نہیں ہوئی۔ دونوں نے چٹنگوئی کی کہ انکی موت کے بعد انکے فن کو تمام عالم میں سراہا جائے گا۔ ان دونوں پر اپنے اپنے حالات کے پیش نظر بڑھاپے میں ابتلا، کا دور آیا۔ اگر خوشحال کو انکے علاقہ میں قحط و خشک سالی کے دوران اپنے عزیز واقارب کی وفات کا صدمہ سہتا پڑا اور اپنے جواں سال اور چبھتے بیٹے نظام کی موت نے انہیں غمگین کیا تو غالب کو غدر کی صعوبتوں، عزیز واقارب کے قتل اور اپنے اکلوتے بھائی کی موت جیسے صدمات نے زخمہ درگور کیا۔ غالب کے بھانجے عارف کی جواں سالی میں موت ان تمام صدمات کے علاوہ ہے۔ جہاں غالب کی تمام اولادیں بچپن ہی میں داغ جدائی دے گئیں وہاں خوشحال کو اولاد کی نافرمانی کا دکھ اٹھانا پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ خوشحال و غالب خلفائے اربو کا احترام کرتے تھے اور اہل بیت نبی کے خاص معتقد تھے۔ دونوں پر رافضی ہونے کا الزام لگا اور دونوں نے ایسے الزام کو جھٹلایا۔ گو کہ غالب کی وفات کے بعد سنی اور شیعہ طبقات میں اپنے اپنے عقائد کے مطابق انکی تجسیم و تکفین کے سلسلے میں

بدگمانیاں پیدا ہوئیں مگر آخر کار غالب کو سنی عقیدہ کے مطابق دفنایا گیا۔ ادھر خوشحال ایک راسخ العقیدہ سنی تھے اور انکو اسی کے مطابق سپرد خاک کیا گیا۔

یہ تو تھیں خوشحال و غالب کی شخصیتوں میں موافقت کی باتیں۔ اب ذرا شخصیت ہی کے ضمن میں ان دونوں میں موجود تفاوت پر بات کرتے ہیں۔ جسمانی ساخت کے زمرے میں ظاہر ہے کہ پہاڑوں کے پروردہ پشتون (خوشحال) اور آگرہ کے محلات میں پلنے والے ترک زادے (غالب) میں فرق تھا۔ خوشحال تو مسند تھے اور مرد تیر و فنگ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ مگر غالب شاعری کے علاوہ کسی دوسرے میدان کے دشمنی نہ تھے۔ غالب عیش و عشرت کے دلدادہ تھے تو خوشحال سادگی پسند تھے۔ خوشحال کارِ حجام مذہب کی طرف تھا تو غالب آزاد منش انسان تھے۔ غالب انا پرست تھے تو خوشحال غیرت پر مر مٹنے والے تھے۔ خوشحال Extrovert تھے اور گھر سے باہر کے امور میں زیادہ خوش رہتے تو غالب مزاج Introvert تھے۔ کمرے میں انگلیٹھی جلا کر بیٹھنا اور شعر و شاعری کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ غالب نے غیر آسودہ گھر یلو زندگی سے فرار کے طور پر جوانی میں عشق کا تجربہ کر ڈالا تھا مگر خوشحال اس جھنجھٹ سے دور رہے۔ خوشحال نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسفخویوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ تو غالب اتنی ہی عمر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

آئیے اب ذرا اپنے ان نابغہ شعراء کے فن میں جھانک کر ان میں ہم آہنگی تلاش کریں۔ اس بات میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف نظر جاتی ہے۔ وہ یہ کہ دونوں

نے شاعری کا آغاز چھوٹی عمر میں کیا۔ اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ جہاں غالب نے دس برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا وہاں خوشحال کو شاعری شروع کرنے میں دس برس مزید لگ گئے۔ خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان کی جن اصناف شاعری کو درجہ کمال تک پہنچایا ان میں غزل، قصیدہ اور رباعی شامل ہیں۔ دونوں نے نثر میں بھی لکھا اور اپنی اپنی جودت طبع کے مطابق جدید نثر کے بانی کہلائے۔ خوشحال نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”دستار نامہ“ کی طرزِ تحریر کے ذریعے پشتو نثر کو سادہ اور روزمرہ کے مطابق بنا کر جدید دور میں داخل کر دیا۔ ادھر غالب نے اپنے مکاتیب کے ذریعے اردو نثر کو جدیدیت بخشی۔

خوشحال و غالب دونوں نے تاریخ نویسی بھی کی۔ غالب نے فارسی میں مظہر خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دشتیو) لکھنے کا کارنامہ سرانجام دیا تو خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہرِ دہلی اور وہاں گذرنے والے افغان بادشاہوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں نے شعر و شاعری خاص طور پر غزل کے میدان میں نئے تجربات کئے ہیں۔ اگر غالب نے اس حلقہ میں طرز کی اردو غزلیں لکھ کر اور چھوٹی بحر کی فارسی سے پاک غزلیں پیش کر کے شاعری کے میدان میں نئے تجربات کئے تو خوشحال نے پشتو شاعری میں قسبہ طرز اور سوال و جواب لئے ہوئی غزلیں لکھیں اور ایک ہی شعر کے دو مصرعے الگ الگ زبانوں یعنی پشتو اور فارسی میں لکھنے کا تجربہ کیا۔ اگر خوشحال نے پشتو نثر و شاعری کے نئے دور کا آغاز کیا تو غالب نے جدید اردو نثر و شاعری کا آغاز کیا۔ یوں یہ دونوں نابغہ روزگار ہستیاں اپنی اپنی زبان کے شعر و نثر پر

شبہت ہو گئیں۔

خوشحال و غالب کا نظریہ شعر ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ جہاں غالب نے اپنا نظریہ شعر اختصار سے بیان کیا ہے۔ خوشحال نے اسکی تفصیل کو ”وستان نامہ“ میں نمایاں جگہ دی۔ ہمارے ان ہر دو ناقد شعراء کے کلام میں سائنسی توجیحات ملتی ہیں جو حیران کن حد تک گہرے سائنسی ادراک کا پتہ دیتی ہیں۔ جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے تو انہوں نے خوشحال و غالب دونوں کو اپنے کلام میں سراہا ہے۔

خوشحال و غالب کے فن میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے غزل کے علاوہ حماسی شاعری کی اور وطن کی محبت میں قصیدے رقم کئے وہاں غالب نے دوسری اصناف یعنی سہرہ وغیرہ پر بھی اپنا قلم آزمایا۔ خوشحال کے پاس قوم کے لئے ایک واضح پیغام تھا۔ انہوں نے باز اور شکلیال کا تصور دے کر اپنی قوم کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور یوں ایک سیاست دان اور مفکر کے درجہ تک پہنچ گئے۔ ادھر غالب کی شاعری میں ایسا کوئی پیغام نہ تھا۔ ہاں البتہ انہوں نے غزل کی بوقلمونی کے ذریعے جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی

قصیدہ گوئی کے میدان میں دیکھیں تو غالب نے قصیدے کو مدح حضرت علی اور تعریف شاہنک محمد و درکھا۔ ادھر خوشحال نے اپنے بیشتر خیالات کا اظہار قصیدے کے ذریعے کیا۔ اکیمیں اور نگزیب بادشاہ کی جھوٹی شمول تھی۔

جہاں غالب کے ہاں تاریخ نویسی کا فن تو موجود ہے اور تاریخ گوئی مفقود وہاں خوشحال نے تاریخ نویسی اور تاریخ گوئی دونوں میں نام پیدا کیا۔ خوشحال نے اپنی شاعری

میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے اسلامی صوفی تحریک کا مطالعہ کر رکھا تھا لیکن غالب نے اسلامی یا یونانی صوفی تحریک کا کوئی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ باایں ہمہ انکے کلام میں اچھے صوفیانہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ غالب باوہ خوار کیونکر صوفی ہو سکتے تھے۔

خوشحال و غالب کے فلسفہ غم میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال ہر غم کو سینے سے لگانے اور اس کا دلوہ کرنے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ وہاں غالب غم کا اسیر ہوتا ہے۔ لیکن اپنی خوشدلی طبع کی ڈھال سے غم کا حملہ روکنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

خوشحال و غالب نے فارسی کلام بھی کہا مگر غالب کی فارسی شاعری میں کلام نہیں انہوں نے فارسی میں جو شاعری کی اس میں انکی اردو شاعری کی نسبت زیادہ جذبہ اور وہد بہ پایا جاتا ہے۔ خود انہوں نے بھی اپنی فارسی شاعری کو اردو شاعری سے بہتر جانا۔ اور اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں ”بے رنگ“ کہا۔ ادھر خوشحال کی مادری زبان فارسی نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے فارسی شاعری کی گو کہ اُن کے پشتو دیوان میں ہی بچیس فارسی غزلیں ملی ہیں۔ جو تقریباً دو سو پچاس اشعار پر مشتمل ہیں۔

جرات اظہار اور بے باکی کے میدان میں خوشحال نے گویا پشتو شاعری میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ مظلوموں سے لیکر اپنے افغان ہم وطنوں حتیٰ کہ اپنے قبیلے خٹک اور اپنی اولاد تک کو نہیں بخشا اور سب کو بے نطق کی ستائی ہیں۔ خوشحال نے اپنی شاعری میں جنسی بے باکی کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ غالب نے ایسی

کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ محبوبہ کے پاؤں تک چھونے سے گھبراتے ہیں اور یہی فکر دامسکیر رہتی ہے کہ کہیں ایسا کرنے سے محبوبہ ناراض نہ ہو جائے۔ بوسہ مانگتے ہیں تو وہ بھی ڈر اور ہے۔

حسن و عشق کی بات ہو۔ تو بھی خوشحال و غالب کی شاعری میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال حسن کے ولدادہ اور عشق کے متوالے ہیں وہاں غالب اس میدان میں نہایت احتیاط سے رک رک کر قدم رکھتے ہیں۔ گو کہ غالب کی فارسی شاعری میں اردو شاعری کی نسبت عشق کا جذبہ زوروں پر رہتا ہے۔

طہر و مزاج کے میدان میں بھی ہمارے ان شعراء آفاق شعراء کے معیار مختلف ہیں جہاں خوشحال طہر کا تیرا استعمال کرتے ہیں اور مزاج اُنکے مزاج میں نہیں۔ وہاں غالب کے کلام میں طہر بھی پایا جاتا ہے اور مزاج بھی۔ یہاں تک کہ غالب کے شاگرد مولانا حالی نے اپنے استاد کو ”خیوان ظریف“ تک کہہ ڈالا۔

خوشحال و غالب کی شاعری میں سے اور سے خانہ کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں۔ ان سے تو ہادی الظہر میں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ گویا دونوں پر لے درجے کے میخوار تھے۔ لیکن درحقیقت جہاں خوشحال شراب کا ایک قطرہ بھی چکھے بغیر میخوار کی حد تک پہنچے وہاں غالب نے سے پرستی بھی کی اور میخواری بھی۔ ان الفاظ کے ساتھ موازنہ خوشحال و غالب اختتام پذیر ہوتا ہے۔